اسرار شریعت

جلد سوم

اس کا دوسرا نام ہے

مرآۃ الحقائق

مؤلفہ

مولوی محمد فضل خانؒ

فہرست مضامین

مرتب کتاب

منیرالدین احمد

مولوی محمد فضل خان کے فرزند راجہ عبد الرؤف خان (۱۸۹۹ء۔ ۱۹۶۶ء) کے بیٹے ہیں اور پنجاب یونیورسٹی لاہور (مولوی فاضل، بی۔اے) اور ہمبرگ یونیورسٹی جرمنی (ڈاکٹر آف فلاسفی) کے فارغ التحصیل ہیں۔ آپ ۱۹۶۰ء سے جرمنی میں مقیم ہیں، جہاں پر آپ جرمن اورینٹ انسٹی ٹیوٹ کے ریسرچ فیلو اور ہمبرگ یونیورسٹی کے استاد کی حیثیت سے خدمات سرانجام دینے کے بعد دسمبر ۱۹۹۹ء میں ریٹائر ہوئے۔ آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جو اردو، عربی، فارسی، انگریزی اور جرمن زبان میں شائع شدہ ہیں۔ آپ اردو ادب میں بطور افسانہ نگار اور جرمن ادب کے مترجم کے جانے جاتے ہیں۔

بسم الله الرحمن الرحیم

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم

و علی آله و اصحابه مع التسلیم

حقیقت ایمان

واضح ہو کہ لفظ ایمان عربی مصدر ہے، جس کے معنے ہماری اردو زبان میں ماننے اور پناہ دینے اور بے خوف کرنے کے ہیں۔ اور اصطلاح شرع اسلام (۱) میں اس سے مراد اقرار لسانی و تصدیق قلبی ہے، جو تبلیغ و پیغام کسی نبیؑ کی نسبت محض تقویٰ اور دور اندیشی کے لحاظ سے صرف نیک ظنی کی بنیاد پر بعض وجوہ کو معتبر سمجھ کر اور اس طرف غلبہ اور رجحان پا کر بغیر انتظار اور بلا قطعی و اشگاف ثبوت کے دلی انشراح سے نبی کی بتائی ہوئی باتوں پر اپنی قبولیت اور تسلیم ظاہر کرنا ہے۔

....

حاشیہ(۱) قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ . اَلاِیْمَانُ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللهِ وَ مَلَائِکَتِهٖ وَ کُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْیَوْمِ الآخِرِ وَ تُؤْمِنُ بِالْقَدْرِ خَیْرِهٖ وَ شَرِّهٖ. (رواہ بخاری و مسلم) ترجمہ۔ نبی علیہ الصلوۃ السلام فرماتے ہیں۔ ایمان یہ ہے کہ تم خدائے واحد لاشریک پر ایمان لاؤ اور اس کے فرشتوں اور اسکی کتابوں اور اس کے رسولوں اور پیچھے آنے والے دن یعنی قیامت کو مانو اور خدا تعالیٰ کے نیک و بدی کے اندازہ کرنے پر ایمان لاؤ۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَ سِتِّیْنَ اَوْ سَبْعُوْنَ بَاباً اَدْنَاهَا اَمَاطَةُ الاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ وَ اَرْفَعُهَا قَوْلُ لَا اِلٰهُ اِلَّااللهُ . وَالْحَیَاء شُعْبَةٌ مِنَ الِایْمَان ۔ حضرت ابی ہریرہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ ایمان کے چند اور ساٹھ یا ستر دروازے ہیں۔ سب سے چھوٹا دروازہ راستہ پر سے ایذا دینے والی چیز کو ہٹانا ہے اور سب سے اونچا لا الہ الا اللہ کہنا۔ اور شرم کرنا ایمان کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔

عَنْ عَلِیْ اِبْنِ اَبِی طَالِبْ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمْ اَلْاِیْمَانُ مَعْرِفَةٌ بِالْقَلْبِ وَ قَوْلٌ بِالِّلسَانِ وَ عَمَلٌ بِالْاَرْکَانِ (رواہ ابن ماجہ) حضرت علی بن ابی طالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ ایمان ہے پہچاننا دل کے ساتھ اور اقرار کرنا زبان سے اور عمل کرنا اس کے موافق اپنے انداموں کے ساتھ۔

عادت اللہ قدیم سے اس طرح جاری ہے اور یہ اس فن علم الٰہی کا نہایت باریک نکتہ ہے، جس پر سعادت مندوں کو غور کرنا چاہئے کہ ثواب اور فیضان سماوی ایمان پر مرتب ہوتا ہے۔ اس راہ کا سچا فلسفہ یہی ہے کہ انسان دین قبول کرنے کی ابتدائی حالت میں اس بے نیاز مطلق اور اس کی قدرت اور اس کے وعدہ و وعید اور اس کے اخبار و اسرار کے ماننے میں لمبے لمبے انکاروں سے مجتنب رہے۔ کیونکہ ایمانی صورت کے قائم رکھنے کے لئے ،جس پر تمام ثواب وابستہ ہے، ضرور تھا کہ خدا تعالیٰ امور ایمانیہ کو ایسا منکشف نہ کرتا کہ وہ دوسرے بدیہات کی طرح ہی ہر ایک خاص و عام کی نظر میں مسلم الوجود ہو جاتے۔ پس خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے امور غیبیہ کو ماننے والے کو اسلامی شرح کی اصطلاح میں مومن کہتے ہیں۔ اور ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ایمان کے معنے پناہ دینے کے بھی ہیں۔ چونکہ خدا تعالیٰ ایمان لانیوالے کو عذاب سے پناہ دیتا ہے، اس لئے خدا کا نام بھی مومن ہے۔ چنانچہ ایک عربی شاعر کہتا ہے۔

مُعْطِیُ الْاَمَانِ الْمُؤْمِنُ الرَّبُّ الَّذِیْ　　مَنْ یَدْعُوْهُ الْوَرٰی بِالْمُؤْمِنِ

فَهُوَ الْعَلِیْمُ بِحَقِّهٖ وَ بِحَقِّنَا　　وَ بِمَا لَهٗ مِنَّا وَ مَا لِلْمُمْکِنِ

ترجمہ۔ یعنی خدا پناہ دینے والے کا نام مؤمن ہے اور وہ پروردگار ہے، جس کو لوگ ہمیشہ مومن کہتے ہیں۔ وہ ہمارے روا رہنے والے حقوق کو جاننے والا ہے۔ یعنی وہ معبود اور ہم عابد، وہ خالق و رزاق اور ہم مخلوق و مرزوق ہیں۔

کیا نامعقول باتوں کا ماننا انسان پر لازم ہے

یہ تو سچ ہے کہ انسان مکلّف بوجہ عقل ہے۔ نامعقول باتوں کو مان نہیں سکتا اور نہ درحالت انکار قابل الزام ٹھہرتا ہے۔ لیکن خدا تمہیں ہدایت کرے۔ تم خوب سمجھ لو کہ خدا تعالیٰ بھی کسی نامعقول بات پر جو عندالعقل انسان کی قدرت اور طاقت سے بعید ہے، ایمان لانیکے لئے تمہیں مجبور نہیں کرتا کہ تم کسی ایسی بات پر ایمان لاؤ، جو فی الحقیقت دوربین نظروں میں نامعقول ہے۔ بلکہ ہماری تقریر کا مدعا اور لب لباب یہی ہے کہ ایمانی امور ایسے ہونے چاہئیں کہ جو ایک وجہ سے ظاہر اور ایک وجہ سے مخفی ہوں اور امکانی طور پر عقل ان کا وجود باور تو کر سکے، مگر دوسرے مشہودات و مرئیات بدیہی کی طرح ہاتھ پکڑ کر دکھلا نہ سکے۔ یعنی انسان اور گدھے وغیرہ محسوس چیزوں کی طرح ان کا وجود نہ ہو، کہ ٹٹول کر معلوم کریں یا بچشم خود دیکھ سکیں یا اشکال ہندسے اور اعمال حسابی کی طرح ایسے منکشف نہ ہوں جن میں دس برس کے بچے بھی اختلاف نہ کر سکیں۔ غرض وہ کیفیت ان میں محفوظ ہو، جو ایمان کا مفہوم قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ اور پھر بایں ہمہ بالغ نظروں اور حقیقت شناسوں کی نگاہوں میں نامعقول اور بعید از عقل بھی نہ ہوں۔

نہ چنداں بخور کز دہانت بر آید　　نہ چنداں کہ از ضعف جانت بر آید

اب خلاصہ و ماحصل اس تقریر کا یہ ہے کہ کسی مذہب کے قبول کرنے سے غرض یہ ہے کہ وہ طریق اختیار کیا جائے، جس سے خدائے غنی مطلق، جو مخلوق اور مخلوق کی عبادت سے بکلّی بے نیاز ہے، راضی ہو جائے۔ اور اس کے فیوض رحمت اترنے شروع ہو جائیں، جن سے اندرونی آلائشیں دور ہو کر صحن سینہ یقین اور معرفت سے پُر ہو جائے۔ سو یہ تدبیر اپنے فکر سے پیدا کرنا انسان کا کام نہیں تھا۔ اس لئے اللہ جل شانہٗ نے اپنے وجود اور اپنے عجائبات قدرت خالقیت یعنی ارواح و اجسام و ملائک و دوزخ و بہشت و بعثت و حشر و رسالت و دیگر تمام اسرار مبداء و معاد کو یکساں طور پر پردۂ غیب میں رکھ کر اور کچھ کچھ قیاسی یا امکانی طور پر عقل کو اس کوچہ میں گذر بھی دیکر غرض کچھ دکھلا کر اور کچھ چھپا کر بندوں کو ان سب باتوں پر ایمان لانے کے کے لئے مامور کیا۔ اور یہ سب اس لئے کیا کہ جب باوجود کشمکش مخالفانہ خیالات کے خداتعالیٰ کی ہستی پر ایمان لائیگا اور سب عجائبات اُخروی و وجود دوزخ و بہشت و ملائک وغیرہ کو اس کی قدرت میں داخل سمجھ کر دیکھنے سے پہلے ہی قبول کریگا، تو یہ قبول کرنا اس کے حق میں صدق شمار کیا جائیگا۔ کیونکہ ہنوز یہ چیزیں در پردۂ غیب ہیں۔ مرئی اور مشہود طور پر نمایاں اور ظاہر نہیں ہیں۔ سو یہ صدق خداتعالیٰ کی توجہ رحمت کے لئے ایک موجب ہو جائے گا۔ کیونکہ خداتعالیٰ بوجہ اپنی استغناء ذاتی کے انہیں لوگوں پر توجہ رحمت کرتا ہے، جن کا صدق ظاہر ہوتا ہے۔ یوں تو انسان کی فطرتی عادت ہے کہ جو چیز کھلے کھلے طور پر مضر یا مفید ہو اس سے بہ نفرت بھاگتا ہے یا اسکے لینے کو بصد رغبت دوڑتا ہے، یعنی جیسے صورت ہو۔ لیکن وہ اپنی عادت سے کسی ثواب کا مستحق نہیں ٹھہر سکتا۔ اگر کوئی شخص بجلی سے ڈر کر اپنے کوٹھے میں چھپ جائے یا شہر سے خوف کھا کر اپنے شہر کی طرف بھاگے، تو وہ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ اے بجلی یا شہر میں نے تم سے خوف کیا، تم مجھ سے راضی ہو جاؤ۔ سو ظاہر ہے کہ جو ڈرنا یا امید کرنا ضروری طور پر لازم آتا ہے، وہ کسی تحسین یا آفرین کا موجب نہیں ٹھہر سکتا۔ اسی وجہ سے لازم آتا ہے کہ جو شخص خداتعالیٰ اور اسکے عجائبات آخر کو مان کر رضامندی الٰہی کا خواہشمند ہے، وہ ان سب چیزوں کا ماننے میں بیجا آڑوں سے پرہیز کرے۔ اور جہاں تک ممکن ہو مطالبہ دلائل میں نرمی اختیار کر کے فقط اتنا کرے کہ ایک راہ کو دوسری راہوں پر ترجیح دے کر دیکھ لے۔ اور ایسے یقینی ثبوت کے لئے کہ جیسے چار کا نصف دو ہے اپنی نابالغ عقل کو آوارہ اور سرگردن نہ ہونے دے۔ بلکہ عام تر سعادت اس میں ہے کہ غیب کی باتوں ہی کی صورت میں قبول کرے۔ اور ظاہری حواس کی خواہ نخواہ شہادت طلب کرنے سے اور فلسفہ کے طول طویل اور لاطائل جھگڑوں سے اپنے تئیں حتی الوسع بچائے۔ کیونکہ اگر خداتعالیٰ کو دیکھ کر ہی یا انتہائی تحقیقات سے قبول کرتا ہے اور جزا سزا کو تجربہ کر کے ہی ماننا ہے، تو پھر ایسے ماننے میں کونسی خاص فضیلت یا صدق پایا

جاتا ہے۔اس طرح پرکون ہے جو قبول نہیں کرتا۔دنیا میں ایسی طبیعت کا کوئی آدمی نہیں کہ اگر اس کو پورا پورا ثبوت خدا کی ہستی یا عالم مجازات یا عجائبات قدرت کامل جائے تو پھر وہ منکر ہی رہے۔مثلاً اگر ایسا ہو کہ دس بیس ہزار آدمی ہر ایک قوم اور ہر ایک ملک کے قبروں سے اٹھ کر اپنی قوم اور قبیلہ میں آجائیں اور اپنے اپنے بیٹوں اور پوتوں کو خدا اور اس کی جزا و سزا کی ساری حقیقت سنا دیں،تو پھر ممکن نہیں کہ پھر بھی کوئی شخص کافر اور بے دین رہ جائے۔

ایمان بالغیب پر ثواب ملنے کی حکمت اور ایمان شہودی پر ثواب نہ ملنے کی وجہ

سوال۔اب اس جگہ مذکورہ بالا مضمون پڑھ کر بالطبع یہ سوال بعض دلوں میں پیدا ہو جائے تو تعجب نہیں کہ جس حالت میں خدا تعالیٰ امور غیبیہ کو ظاہر کرنے پر قادر تھا،اور اس پختہ ثبوت سے کفر اور بے دینی کی جڑ کاٹی جاتی تھی،تو پھر اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟

جواب۔بلاشبہ اگر خدا ایسا کرتا تو پھر حق اور باطل کا بکمال صفائی فیصلہ ہو جاتا اور فلسفہ کے نکمے اور بودے اور ظنی اور وہمی دلائل کی کچھ حاجت نہ رہتی۔تو اس کا جواب یہی ہے،جو اوپر آچکا ہے،یعنی بیشک خدا تعالیٰ ایسا کر سکتا تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایسا جلوۂ دیدار دکھا سکتا تھا کہ ایک ہی تجلّی سے سب گردنیں جھک جاتیں اور ایک ہی دفعہ دنیا کی تمام دینی نزاعوں کا تصفیہ ہو جاتا۔لیکن ایسا کرنے میں وہ بات،جس سے ثواب ملتا ہے اور صادقوں کو مراتب عالیہ اور قرب و جاہت عطا کی جاتی ہے،وہ باقی نہ رہتی،یعنی ایمان بالغیب،جس کی وجہ سے درجات اخروی ملتے ہیں،وہ اپنی صورت میں محفوظ نہ رہتا۔پس یہ بڑے بھاری درجہ کی صداقت ہے،جو سوال مذکور بالا پر غور کرنے سے ہر ایک اعلیٰ و ادنیٰ کو سمجھ آسکتی ہے۔ایمان پر ثواب اور اجر ملنے کا یہی بھید ہے کہ جن چیزوں پر ایمان لایا جاتا ہے،وہ اگرچہ غور اور نظر کرنے سے صحیح اور راست ہیں،لیکن ان کا ثبوت ایسا کھلا کھلا ثبوت نہیں ہے،جیسے اور مشہودات اور محسوسات کا ہوا کرتا ہے۔بلکہ ایمان بالغیب کی حدیثیں ہیں۔سو صادق آدمی جب خدا تعالیٰ اور اس کی جزا و سزا وغیرہ امور غیبیہ پر ایمان لاتا ہے،تو اس ایمان میں بوجہ انواع و اقسام کے اوہام اور نفس امارہ کے طرفہ کشائش کی سخت آزمائش میں پڑتا ہے۔آخر چونکہ وہ صادق ہوتا ہے،اس لئے سب راہیں چھوڑ کر اور سب خیالات پر غالب آکر اس رب رحیم کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔اور اس صدق کی برکت سے کہ وہ اپنے علم سے زیادہ رجوع اور اپنی واقفیت سے زیادہ وفا اور اپنے تجربہ سے زیادہ استحکام اختیار کرتا ہے،جناب الٰہی میں قبول کیا جاتا ہے اور پھر اس صدق وصفا کی برکت سے عرفانی آنکھیں اس کو عنایت ہوتی ہیں اور ربانی لذت اور صحبت اس کو عطا کی جاتی ہے۔یہاں تک کہ وہ اس مرتبہ تک جا پہنچتا ہے

جہاں پر انسانی کمالات ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ کامل طور پر بعد میں ملتا ہے پہلے نہیں ملتا۔

یہ تو معرفت صحیحہ تک پہنچنے کے لئے سنت اللہ یا یوں کہو کہ قانون قدرت ہے۔ لیکن اس زمانہ کے خشک فلسفیوں نے اس صداقت پر ایک ذرہ اطلاع نہیں پائی اور وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ کیونکر ایمان کے محکم اور استوار زینہ سے عرفان کے بلند مینار تک انسان پہنچتا ہے۔ اور اس بے خبری کی وجہ سے ان میں اپنے قدم اول میں ہی تعجیل اور جلدی بھری ہوئی ہے۔ اور نہایت شتاب کاری سے علم دین کو ایک ادنیٰ سا کام اور ایک ناکارہ سا ہنر سمجھ کر یہ ارادہ کر رہے ہیں کہ مذہب کے تمام اصول و فروع کو اپنی ابتدائی حالت میں ہی بغیر انتظار دوسرے حالات مترقبہ کمالات فطرت کے اس طرح پر دریافت کرلیں، جیسے کوئی ہندسہ یا حساب کا مسئلہ دریافت کیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی دقیقہ دینی اس حد کے انکشاف تک نہ پہنچ سکے، تو اس کی نسبت صاف حکم صادر کریں کہ یہ سراسر باطل اور پیرایہء صداقت سے خالی ہے۔ مگر جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں، یہ ایمانی حکمت کا طریق نہیں ہے۔ بلکہ انسانی ظلمت یا شیطانی رعونت کی ایک تاریکی ہے۔

آں نہ دانائے بود کز ناشکیبائے نفس	خوشتن را ز دو تر بر ضد و انکار آورد
صبر باید طالب حق را کہ تخم اندر جہاں	ہر چہ پنہاں خاصیت دارد ہماں بار آورد
اند کے نور فراست باید اینجا مرد را	تا صداقت خویشتن را خود باظہار آورد

اگر ایسا ہوتا کہ مذاہب کے تمام اجزاء اور جو کچھ اس میں بھرا ہوا ہے پہلے ہی سے اظہر من الشمس اور بدیہی اور بین الانکشاف ہوتے یا انکشاف ہندسے اور حساب کے اعمال کی طرح قطعی ثبوت دکھائی دیتے، تو پھر اس حالت میں ایمان ایمان نہ رہتا۔ اور جو ایمان لانے پر ثواب اور سعادتیں اور برکتیں مترتب ہوتی ہیں، ان کو انسان ہرگز نہ پا سکتا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ بیّن الحقیقت اور ظاہر الوجود باتوں کا مان لینا ایمان نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ میں اس بات پر ایمان لایا کہ پانی سرد اور آگ گرم اور ہر ایک انسان آنکھوں سے دیکھتا اور کانوں سے سنتا اور منہ سے کھاتا اور پاؤں سے چلتا ہے اور میں اس بات پر ایمان لایا کہ آفتاب اور قمر موجود ہیں اور زمین پر بہت سی جمادات اور نباتات اور حیوانات پائے جاتے ہیں، تو ایسا ایمان لانا ایک ہنسی کی بات ہے نہ کہ ایمان۔ اس وجہ سے کھلی کھلی باتوں کو ماننا عنداللہ و عند العقلاء ثواب پانے کا موجب نہیں ٹھہر سکتا۔

چشم کودک ہمچو خر در آخور است	چشم عاقل در حساب آخر است

اس جگہ یہ جاننا چاہئے کہ خدا تعالیٰ اور عالم مجازات اور دیگر امور مبدا و معاد کے ماننے میں

فلسفیوں کا طریقہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے طریقہ سے بہت مختلف ہے۔ نبیوں کے طریق کا اصل اعظم یہ ہے کہ ایمان کا ثواب تب مترتب اور بارآور ہوگا کہ جب غیب کی باتوں کو غیب ہی کی صورت میں قبول کیا جائے۔ اور ظاہری حواس کی کھلی کھلی شہادتیں یا دلائل ہندسہ کے یقینی اور قطعی ثبوت طلب نہ کیئے جائیں۔ کیونکہ تمام وکمال مدار ثواب اور استحقاق قرب و وصل الٰہی کا تقویٰ پر ہے۔ اور تقویٰ کی حقیقت وہی شخص اپنے اندر رکھتا ہے، جو افراط آمیز تفتیشوں اور لمبے چوڑے انکاروں اور ہر ہر جزوی موشگافی سے اپنے آپ کو بچاتا ہے۔ اور صرف دوراندیشی کے طور پر ایک راہ کی سچائی کا دوسری راہوں پر غلبہ اور رجحان دیکھ کر بہ حسن ظن قبول کر لیتا ہے۔ اس بات کا نام **ایمان** ہے اور اس ایمان پر فیوض الٰہی کا دروازہ کھلتا ہے۔ اور دنیا و آخرت میں سعادتیں حاصل ہوتی ہیں۔ جب کوئی نیک بندہ ایمان پر محکم قدم مارتا ہے اور پھر دعا اور نماز اور فکر اور نظر سے اپنی علمی حالت میں ترقی چاہتا ہے، تو خدا تعالیٰ خود اس کا متولی ہو کر اور آپ اس کا ہاتھ پکڑ کر درجہ ءایمان سے درجہ عین الیقین تک اس کو پہنچا دیتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب ایک خبر کی صحت پر وجوہ کاملہ قیاسیہ اور دلائل کافیہ عقلیہ مل جائیں، تو اس بات کا نام **ایقان** ہے، جس کو دوسرے لفظوں میں **علم الیقین** کہتے ہیں، جب خدا تعالیٰ خود اپنے خاص جذبہ اور موہبت سے خارق عادت کے طور پر انوار ہدایت کھولے اور اپنے آلاء ونعماء سے آشنا کرے اور لدنی طور پر عقل اور علم عطا فرمائے اور ساتھ اس کے ابواب کشف و الہام بھی منکشف کر کے عجائبات الوہیت کی سیر کرا دے اور اپنے محبوبانہ حسن و جمال پر اطلاع بخشے، تو اس مرتبہ کا نام **عرفان** ہے، جس کو دوسرے لفظوں میں **عین الیقین** اور **ہدایت** اور **بصیرت** کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ اور جب ان تمام مراتب کی شدت اثر سے عارف کے دل میں ایک ایسی کیفیت حالی عشق اور محبت کی باذنہٖ تعالیٰ پیدا ہو جائے کہ تمام وجود عارف کا اس کی لذت سے بھر جائے اور آسمانی انوار اس کے دل پر بکلی احاطہ کر کے ہر ایک ظلمت و قبض و تنگی کو درمیان سے اٹھا دیں، یہاں تک کہ بوجہ کمال رابطہ ءعشق و محبت و بباعث انتہائی جوش صدق و صفا کے بلا اور مصیبت بھی محسوس اللذات و مدرک الحلاوت ہو، تو اس کا نام **اطمینان** ہے، جس کو دوسرے لفظوں میں حق الیقین اور فلاح اور نجات سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ مگر یہ سب مراتب ایمانی مرتبہ کے بعد ملتے ہیں اور اس پر مترتب ہوتے ہیں، جو شخص اپنے ایمان میں قوی ہوتا ہے، وہ رفتہ رفتہ ان سب مراتب کو پا لیتا ہے۔ لیکن جو شخص ایمانی طریق اختیار نہیں کرتا اور ہر ایک صداقت کو قبول کرنے سے اول قطعی اور یقینی اور نہایت واشگاف ثبوت مانگتا ہے، اس کی طبیعت کو اس راہ سے کچھ مناسبت نہیں۔ اور وہ اس لائق ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس قادر غنی بے نیاز کے فیوض حاصل کرے،

کیونکہ یہ سب کچھ استقامت ومجاہدات وریاضات وتزکیہ وتصفیہ نفس ملتا ہے، پہلے نہیں۔اور جو شخص پہلے ہی تمام جزئیات کی بکلی صفائی کرنا چاہتا ہے وہ قبل از صفائی اپنے بدعقائد اور بداعمالی کو کسی حالت میں چھوڑنا نہیں چاہتا، وہ اس ثواب اور اس راہ کے پانے سے محروم ہے۔ کیونکہ ایمان اس حد تک ایمان ہے، جب تک وہ امور، جن کو مانا گیا ہے کسی قدر پردۂ غیب میں ہیں۔یعنی ایسی حالت میں واقعہ ہیں جو ابھی عقلی ثبوت نے ان کا احاطہ نہیں کیا اور نہ کسی کشفی طور پر وہ نظر آئے، بلکہ ان کا ثبوت صرف غلبہ ظن تک پہنچا ہے وبس۔ یہ تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا سچا فلسفہ ہے، جس پر قدم مارنے سے کروڑہا بندگان خدا آسمانی برکتیں پا چکے ہیں۔اور جس پر ٹھیک ٹھیک چلنے سے بیشمار خلق اللہ معرفت تامہ کے درجہ تک پہنچ چکے ہیں۔اور جن اعلیٰ درجہ کے یقینیوں کو شوخی اور جلدی سے فلسفی لوگوں نے ڈھونڈا اور نہ پایا، وہ سب مراتب ایماندار بندوں کو بڑی آسانی سے مل گئے۔اور اس سے بھی بڑھ کر اس میں معرفت تامہ کے درجہ تک پہنچ گئے کہ جو کسی فلسفی کے کانوں نے اس کو نہیں سنا اور نہ اس کی آنکھ نے دیکھا۔اور نہ کبھی اس کے دل میں گزرا۔لیکن اس کے مقابلہ پر خشک فلاسفروں کا جھوٹا اور مغشوش فلسفہ، جس پر آج کی نو تعلیم یافتہ لوگ فریفتہ ہو رہے ہیں اور جس کے بدنتائج کی بیخبری نے بہت سے سادہ لوحوں کو برباد کر دیا ہے، یہ ہے کہ جب تک کسی اصل یا فرع کا قطعی طور پر فیصلہ نہ ہو جائے اور بکلی اس کا انکشاف نہ ہولے، تب تک اس کو ہرگز ماننا نہیں چاہیئے۔ گو خدا ہو یا کوئی اور چیز ہو۔ان احمقوں نے اپنے نام محققین رکھا، جن کا دوسرے نام دہریہ بھی ہے۔اس منحوس طائفہ کے اعتقاد کا ذکر خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں بالفاظ ذیل بیان فرمایا ہے۔ اِنَّ هِیَ اِلَّا حَیٰوتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْن . اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِباً وَ مَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِیْن (۱۸۔مؤمنون) قَالُوْا ا اِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ا اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ . لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَ اٰبَائُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِن هٰذَا اِلَّا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْن ۔ترجمہ۔یعنی دھریہ طائفہ کےلوگ کہتے ہیں کہ ہماری حقیقت صرف یہی دنیا کا مرنا جینا ہے اور ہم نہیں اٹھائے جائیں گے۔وہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مر کر خاک اور ہڈیاں ہو جائیں تو اٹھائے جائیں گے۔ ہم سے اور ہمارے آباء واجداد سے بھی یہی وعدے ہوتے رہے۔ یہ تو صرف پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ یہ نادان طائفہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ہمیشہ منکر ہی رہا۔ان کا بپابندی اپنے اصول قدیمہ کے یہ مذہب رہا ہے کہ چونکہ خدا تعالیٰ کا وجود قطعی طور پر بذریعہ عقل ثابت نہیں ہوسکتا اور نہ ہم نے بچشم خود اس کو دیکھا ہے۔اس لئے ایسے خدا کا ماننا ایک امر مظنون اور مشتبہ کا مان لینا ہے، جو کہ ان کے اصول مقررہ فلسفہ سے بکلی بعید ہے۔سوانہوں نے پہلے ہی خدا تعالیٰ کو درمیان سے اڑا دیا۔پھر فرشتوں

کا یوں فیصلہ کیا کہ یہ بھی خدا تعالیٰ کی طرح نظر نہیں آتے۔ چلو یہ بھی درمیان سے اٹھاؤ۔ پھر روحوں کی طرف متوجہ ہوئے اور یہ رائے ظاہر کی کہ ہم کوئی ثبوت قابل اطمینان اس بات پر نہیں دیکھتے کہ بعد مرنے کے روح باقی رہ جاتی ہے۔ نہ کوئی روح نظر آتی ہے اور نہ واپس آ کر کچھ اپنا قصہ سناتی ہے۔ بلکہ سب روحیں مفارقت بدن کے بعد خدا اور فرشتوں کی طرح بے اثر و بے نشان ہیں، سو ان کا بھی ماننا خلاف دلیل و برہان ہے۔ ان سب فیصلوں کے بعد ان کی عمیق نظر نے تکالیف شرعیہ کی مشقت اور حلال وحرام کا فرق اصول فلسفہ کا سخت مخالف سمجھا، اس لئے انہوں نے صاف صاف اپنی رائے ظاہر کر دی کہ ماں اور بہن اور جورو میں فرق کرنا یا اور چیزوں میں بلا ثبوتِ بیّن بعض چیزوں کو حرام سمجھ لینا یہ سب بناوٹی باتیں ہیں، جن پر کوئی فلسفی دلیل قائم نہیں ہوسکتی۔ اس طرح انہوں نے یہ بھی بیان کیا کہ ننگا رہنے میں کوئی شناخت عقلی ثابت نہیں ہوتی، بلکہ اس میں طبی قواعد کے رو سے فوائد ہیں۔ اسی طرح ان فلاسفروں کے اور مسائل بھی ہیں۔ اور خلاصہ ان کے مذہب کا یہی ہے کہ وہ بجز دلائل قطعیہ عقلیہ کے کسی چیز کو نہیں مانتے۔ اور ان کی فلسفیانہ نگاہ میں گو کیسی ہی کوئی بدعملی ہو، جب تک براہین قطعیہ فلسفیہ سے اس کا بد ہونا ثابت نہ ہولے، یعنی جب تک اس میں کوئی طبی ضرر یا دنیوی بدانتظامی متصور نہ ہو، تب تک اس کا ترک کرنا بیجا ہے۔ مگر جو دوسرے درجہ کے فلاسفر ہیں، انہوں نے لوگوں کے لعن طعن سے اندیشہ کر کے اپنی فلاسفری اصولوں کو کچھ نرم کر دیا ہے اور قوم کے خوف اور ہم جنسوں کی شرم سے خدا اور عالم جزا اور دوسری کئی باتوں کو ظنی طور پر تسلیم کر بیٹھے ہیں۔ لیکن یہ اعلیٰ درجہ کے کہلانے والے فلاسفر ان کو سخت نالائق اور بد فہم اور نجس الطبع بزدل اور اپنی سوسائٹی کے بدنام کنندہ خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے کچھ کچھ تو فلسفہ کے طریقہ پر قدم مارا اور کچھ عام لوگوں کی ملامت ولعنت سے ڈر کر نبیوں کے عقائد میں، جو ان کے زعم میں فلسفیوں کے منشاء کے موافق قطعی اور یقینی دلائل سے ثابت نہیں ہو سکتے، ٹانک اڑا دی۔ اس لئے یہ لوگ ان کی نظر میں نیم حکیم ہیں، حقیقی فلاسفر نہیں۔

الغرض ایمان وہ شے ہے کہ جن باتوں کو عقل قبول تو کرتی ہے، مگر بوجہ در پردہ غیب ہونے کے جیسا کہ چاہیئے ان کی حقیقت کو نہیں پہنچ سکتی۔ ان باتوں میں اپنی فراست فطرتی سے کچھ ترجیح یعنی آثار صداقت دیکھ کر اور اس قدر دلائل عقلیہ کا غلبہ اس طرف پا کر اور پھر خدا کے کلام کو اس پر شاہد ناطق و صادق معلوم کر کے ان باتوں کو مان لیا جائے، یہی ایمان ہے، جو ذریعہ خوشنودی خداوند کریم جل شانہٗ ہو جاتا ہے۔ اور بعد اس کے مرتبہ ایقان ہے۔ اور پھر اس کے بعد مرتبہ عرفان ہے یعنی جب کہ بندہ ایسی باتوں کو مان لیتا ہے، جن کو اس کی عقل امکان یا جواز یا وجوب کی صورت میں قبول تو کر لیتی ہے، مگر

انکشاف کلی کے طور پر ان کا احاطہ نہیں کر سکتی، تو خدا تعالیٰ کی نظر میں وہ شخص صادق ٹھہر جاتا ہے۔ اور حضرت خداوند کریم عزاسمہٗ بہ برکت اس ایمان کے عرفان کا مرتبہ اس کو عطا کر دیتا ہے یعنی اپنی طرف سے علم ومعرفت وسکینت اس پر نازل کرتا ہے۔ اور کشفی اور الہامی نوروں سے وہ بقیہ ظلمت بھی اٹھا دیتا ہے، جس کے اٹھانے سے عقل دود آمیز رہ گئی تھی۔ اس جہت سے خدا تعالیٰ نے جیسے انسان کی صورت میں مبادی امور کے کسی قدر سمجھنے کے لئے ایک عقلی قوت رکھی ہے۔ اس طرح انسان کی صورت میں مبادی امور کے کسی قدر سمجھنے کے لئے ایک عقلی قوت رکھی ہے۔ اسی طرح انسان میں کشف اور الہام کے پانی کی بھی ایک قوت مخفی ہے، جب عقل انسانی اپنی حد مقررہ تک چل کر آگے قدم رکھنے سے رہ جاتی ہے تو اس جگہ خدا تعالیٰ اپنے صادق اور وفادار بندوں کو کمال عرفان اور یقین تک پہنچانے کی غرض سے الہام اور کشف سے دستگیری فرماتا ہے۔ اور جو منزلیں بذریعہ کشف والہام طے ہو جاتی ہیں اور سالکین مرتبہ عین الیقین بلکہ حق الیقین تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہی سنت اللہ اور عادت اللہ ہے، جس کی راہنمائی کے لئے تمام پاک نبی دنیا میں آئے ہیں۔ اور جس پر چلنے کے بغیر کوئی شخص سچی اور کامل معرفت تک نہیں پہنچا۔ مگر کمبخت خشک فلسفی کو کچھ ایسی جلدی ہوتی ہے کہ وہ یہی چاہتا ہے کہ جو کھلتا ہے وہ عقلی مرتبہ پر ہی کھل جائے۔ اور نہیں جانتا کہ عقل انسانی اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ اٹھا نہیں سکتی۔ اور نہ اس بات کی طرف فکر دوڑاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو اس کے کمالات مطلوبہ تک پہنچانے کے لئے صرف جوہر عقل ہی عطا نہیں کیا، بلکہ کشف اور الہام پانے کی قوت بھی اس کی فطرت میں رکھی ہے۔

ہر کہ حق رایافت از الہام یافت ہر رخے کو تافت از الہام تافت
آں کجا عقلے کہ از خود واندش فہمد آں شخصے کہ او فہماندش
تو عجب داری ز پیغام خدا ایں چہ عقل وفکر تست اے خودنما
لطف او چوں خاکیاں را عشق داد عاشقاں را چوں بیفگندے زیاد
خود چو کرد از عشق خود دلہا کباب چوں نہ کردے از سر رحمت خطاب
دل نیاز آمد بجز گفتار یار گرچہ پیش دیدہا باشد نگار
پس چو خود دلبر بود اندر حجاب کے تواں کردن اصبوری از خطاب
عشق میخواہد کلام یار را روپرس از عاشق ایں اسرار را

پس جو کچھ خدا تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے وسائل خداشناسی مقرر کئے ان سے بکلی بے خبر رہنا بڑی بھاری بدنصیبی ہے۔ اور ان قوتوں کو ہمیشہ بیکار رکھ کر ضائع کر دینا اور ان سے فائدہ نہ اٹھانا

پر لے درجہ کی بے سمجھی ہے۔سو ایسا شخص سچا فلسفی ہر گز نہیں ہوسکتا کہ جو کشف اور الہام پانے کی قوت کو بالکل معطل اور بیکار چھوڑ دیتا ہے۔اور اس سے انکار کرتا ہے، حالانکہ ہزاروں مقدسوں کی شہادت سے کشف اور الہام کا پایا جانا بپایہء ثبوت پہنچ چکا ہے اور تمام سچے عارف اس طریق سے معرفت کاملہ تک پہنچے ہیں۔

بہشت، دوزخ، ملائکہ وغیرہ پر ایمان لانا موجب نجات ہونیکی وجہ

اب ہم مکرر حقیقت ایمان کو واضح کر کے لکھتے ہیں کہ تمام ثواب ایمان پر مترتب ہوتا ہے اور ایمان اس بات کا نام ہے کہ جو بات پردۂ غیب میں ہو، اس کو قرائن مرجع کے لحاظ سے قبول کیا جائے یعنی اس قدر دیکھ لیا جائے کہ مثلاً صدق کے وجوہ کذب کے وجوہ پر غالب ہیں۔ یہ بات سوچنے سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ انسان ایمان لانے سے کیوں خدا تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جن چیزوں کو ہم ایمانی طور پر قبول کر لیتے ہیں، وہ بکل الوجوہ ہم پر منکشف نہیں ہوئیں۔ مثلاً انسان خدا تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے، لیکن وہ بھی دیکھ کر نہیں۔ بہشت اور دوزخ پر ایمان لاتا ہے اور وہ بھی نظر سے غائب ہیں۔ محض حسن ظن سے مان لیتا ہے۔اس لئے خدا تعالیٰ کے نزدیک صادق ٹھہر جاتا ہے اور یہ صدق اس کے لئے موجب نجات ہو جاتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ بہشت اور دوزخ وفرشتے یعنی ملائک مخلوق خدا تعالیٰ کی ہے، ان پر ایمان لانا نجات سے کیا تعلق رکھتا ہے۔ جو چیز واقعی طور پر موجود ہے اور بدیہی طور پر اس کا موجود ہونا ظاہر ہے۔ اگر ہم اس کو موجود مان لیں، تو کس اجر کے مستحق ٹھہر سکتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم کہیں کہ ہم آفتاب کے وجود پر ایمان لائے اور زمین پر ایمان لائے کہ موجود ہے اور چاند کے موجود ہونے پر بھی ایمان لائے اور اس بات پر ایمان لائے کہ دنیا میں گدھے بھی ہیں اور گھوڑے بھی اور خچر بھی اور بیل بھی اور طرح طرح کے پرند موجود ہیں، تو کیا اس ایمان سے کسی ثواب کی توقع ہوسکتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جب ہم مثلاً ملائک کے وجود پر ایمان لاتے ہیں، تو خدا تعالیٰ کے نزدیک مومن ٹھہرتے ہیں۔اور مستحق ثواب بنتے ہیں۔اور جب ہم ان تمام حیوانات پر ایمان لاتے ہیں، جو زمین پر ہماری نظر کے سامنے موجود ہیں، تو ایک ذرہ بھی ثواب نہیں ملتا۔ حالانکہ ملائک اور دوسری سب چیزیں برابر خدا تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ پس اس کی وجہ یہی ہے کہ ملائک پردہ غیب میں ہیں اور دوسری چیزیں یقینی طور پر ہمیں معلوم ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن ایمان لانا منظور نہیں ہوگا۔ یعنی اس وقت اگر کوئی شخص خدا تعالیٰ کی تجلیات کو دیکھ کر اور اس کے ملائک اور بہشت و دوزخ کا مشاہدہ کر کے یہ کہے کہ اب میں ایمان لایا، تو اس وقت ایمان منظور نہ ہوگا۔ کیونکہ اس وقت کوئی پردۂ غیب درمیان میں نہ ہوگا۔تا

اس سے ماننے والے کا صدق ثابت ہو۔

اب پھر ذرا غور کر کے اس بات کو سمجھ لینا چاہئے کہ ایمان کس بات کو کہتے ہیں اور ایمان لانے پر کیوں ثواب ملتا ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ایمان لانا اس طرز قبول سے مراد ہے کہ جب بعضے گوشے یعنی بعض پہلو کسی حقیقت کے، جس پر ایمان لایا جاتا ہے، مخفی ہوں اور نظر دقیق سے سوچ کر اور قرائن کو دیکھ کر اس حقیقت کو قبل اس کے کہ وہ بکلی کھل جائے، قبول کر لیا جائے۔ یہ ایمان ہے، جس پر ثواب مترتب ہوتا ہے۔ ایمان لانے پر ثواب اس وجہ سے ملتا ہے کہ ایمان لانے والا چند قرائن صدق کے لحاظ سے ایسی باتوں کو قبول کر لیتا ہے، جو ہنوز مخفی ہیں۔ جیسا کہ اللہ جل شانہٗ نے مومنوں کی تعریف قرآن کریم میں فرمائی ہے۔ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ ۔ یعنی ایسی بات کو مان لیتے ہیں کہ جو ہنوز در پردہ غیب ہے، جیسا کہ صحابہ کرام نے ہمارے سید و مولیٰ محمد رسول اللہ علیہ وسلم کو مان لیا اور کسی نے نشان نہ مانگا اور کوئی ثبوت طلب نہ کیا، گو بعد اس کے اپنے وقت پر بارش کی طرح نشانات برسے اور معجزات ظاہر ہوئے۔ لیکن صحابہ کرام ایمان لانے میں معجزات کے محتاج نہیں ہوئے۔ اور اگر وہ معجزات کے دیکھنے پر ایمان موقوف رکھتے، تو ایک ذرہ برزگی ان کی ثابت نہ ہوتی اور عوام میں سے شمار کئے جاتے۔ اور خدا تعالیٰ کے مقبول اور پیارے بندوں میں داخل نہ ہو سکتے۔ کیونکہ جن لوگوں نے نشان مانگا، خدا تعالیٰ نے ان پر عتاب ظاہر کیا اور درحقیقت ان کا انجام اچھا نہ ہوا۔ اور اکثر بے ایمانی کی حالت میں ہی مرے۔ درحقیقت ایمان کے مفہوم کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ پوشیدہ چیزوں کو مان لیا جائے۔ اور جب ایک چیز کی حقیقت ہر طرح سے کھل جائے یا ایک وافر حصہ اس کا کھل جائے، تو پھر اس کا مان لینا ایمان میں داخل نہیں۔ مثلاً اب جو دن کا وقت ہے، اگر میں یہ کہوں کہ میں اس بات پر ایمان لاتا ہوں کہ اب دن ہے رات نہیں ہے، تو میرے اس ماننے میں کیا خوبی ہوگی۔ اور اس ماننے میں مجھے دوسروں پر کیا زیادت ہے۔ سعید آدمی کی پہلی نشانی یہی ہے کہ اس بابرکت بات کو سمجھ لے کہ ایمان کس چیز کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ جس قدر ابتدائے دنیا سے لوگ انبیاء کی مخالفت کرتے آئے ہیں، ان کی عقلوں پر یہی پردہ پڑا ہوا تھا کہ وہ ایمان کی حقیقت کو نہیں سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ جب تک دوسرے امور مشہودہ محسوسہ کی طرح انبیاء کی نبوت اور ان کی تعلیم کھل نہ جائے، تب تک قبول کرنا مناسب نہیں۔ اور وہ بیوقوف یہ خیال نہیں کرتے تھے کہ کھلی ہوئی چیز کو ماننا ایمان میں کیونکر داخل ہوگا۔ یہ تو ہندسہ اور حساب کی طرح کا ایک علم ہوا نہ کہ ایمان۔ پس یہی حجاب تھا کہ جس کی وجہ سے ابوجہل اور ابولہب وغیرہ اوائل میں ایمان لانے سے محروم رہے۔ اور پھر جب اپنی تکذیب میں پختہ ہو گئے اور مخالفانہ راؤں پر اصرار کر چکے، تو اس وقت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے کھلے کھلے نشانات ظاہر ہوئے۔ تب انہوں نے کہا کہ اب قبول کرنے سے مرنا بہتر ہے۔

ایمان سے نجات ملتی ہے یا فلسفہ سے

سوال ۔کیا نجات ایمان سے وابستہ ہے یا فلسفہ سے؟

جواب ۔میں بار بار کہتا ہوں اور زور سے کہتا ہوں کہ اگر عقائد دینیہ فلسفہ کے رنگ پر اور ہندسہ اور حساب کی طرح عام طور پر بدیہی الثبوت ہوتے، تو وہ ہرگز نجات کا ذریعہ نہ ٹھہر سکتے۔ بھائیو، یقیناً سمجھو کہ نجات ایمان سے وابستہ ہے اور ایمان امور خفیہ سے وابستہ ہے۔ اگر حقائق اشیا مستور نہ ہوتیں، تو ایمان نہ ہوتا۔ اور اگر ایمان نہ ہوتا، تو نجات کا کوئی ذریعہ نہ ہوتا۔ ایمان ہی ہے، جو رضاء الٰہی کا وسیلہ اور مراتب قرب کا زینہ اور گناہوں کا زنگ دھونے کیلئے ایک چشمہ ہے۔ اور ہمیں جو خدا تعالیٰ کی طرف حاجت ہے، اس کا ثبوت ایمان ہی کے ذریعہ سے ملتا ہے۔ کیونکہ ہم اپنی نجات کیلئے اور ہر ایک دکھ سے راحت پانے کیلئے خدا تعالیٰ کے محتاج ہیں۔ اور وہ نجات صرف ایمان سے ہی ملتی ہے۔ کیا دنیا کا عذاب اور کیا آخرت کا دونوں کا علاج ایمان ہے۔ جب ہم ایمان کی قوت سے ایک مشکل کا حل ہو جانا غیر ممکن نہیں دیکھتے، تو وہ مشکل ہمارے لئے حل کی جاتی ہے۔ ہم ایمان ہی کی قوت سے خلاف قیاس اور بعید از عقل مقاصد کو بھی پا لیتے ہیں۔ ایمان ہی کی قوت سے کرامات ظاہر ہوتی ہیں۔ اور خوارق ظہور میں آتے ہیں۔ اور اَن ہونی باتیں ہو جاتی ہیں۔ پس ایمان ہی سے پتہ لگتا ہے کہ خدا ہے۔ خدا فلسفیوں سے پوشیدہ رہا اور حکیموں کو اسکا کچھ پتہ نہ لگا۔ مگر ایمان ایک عاجز دلق پوش کو خدا تعالیٰ سے ملا دیتا ہے اور اس سے باتیں کرا دیتا ہے۔ مومن اور محبوب حقیقی میں قوت ایمانی دلاّلہ ہے۔ یہ قوت ایک مسکین، ذلیل خوار مردودِ خلائق کو اس قصر مقدس تک، جو عرش اللہ ہے، پہنچا دیتی ہے۔ اور تمام پردوں کو اٹھاتی اٹھاتی دلا رام ازلی کا چہرہ دکھا دیتی ہے۔ سو اٹھو، ایمان کو ڈھونڈو۔ اور فلسفہ کے خشک اور بیسود ورقوں کو جلاؤ کہ ایمان سے تمکو برکتیں ملیں گی۔ ایمان کا ایک ذرہ فلسفہ کے ہزار دفتر سے بہتر ہے اور ایمان صرف آخری نجات نہیں، بلکہ ایمان دنیا کے عذابوں اور لعنتوں سے بھی چھڑا دیتا ہے۔ اور روح کے تحلیل کرنیوالے غموں سے ہم ایمان ہی کی برکت سے نجات پاتے ہیں۔ اور وہ چیز ایمان ہی ہے، جس سے مومنِ کامل سخت گھبراہٹ اور قلق اور کرب اور غموں کے طوفان کے وقت اور اسوقت کہ جب ناکامی کے چاروں طرف سے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں اور اسباب عادیہ کے تمام دروازے مقفل اور مسدود نظر آتے ہیں مطمئن اور خوش ہوتا ہے۔ ایمان کامل سے سارے استبعاد جاتے رہتے ہیں۔ اور ایمان کو کوئی چیز ایسا

نقصان نہیں پہنچاتی، جیسا کہ استبعاد۔ اور کوئی ایسا دوست نہیں جیسا کہ ایمان۔ دنیا میں ہر ایک ماتم زدہ ہے۔ مگر ایماندار و، دنیا میں ہر کوئی سوزش اور جرقت اور جلن میں گرفتار ہے، سوائے مومن کے۔ اے ایمان کیا ہی تیرے ثمرات شیریں ہیں۔ کیا ہی تیرے پھول خوشبودار ہیں۔ سبحان اللہ کیا عجیب تجھ میں برکتیں ہیں۔ کیا ہی خوش نور تجھ میں چمک رہے ہیں۔ کوئی ثریا تک نہیں پہنچ سکتا، مگر وہی جسمیں تیری کششیں ہیں۔ خدا تعالیٰ کو یہی پسند آیا کہ اب تو آئے اور خشک فلسفہ جائے۔ **و لا راد لفضله۔**

لِلْعَقْلِ نُوْرٌوَ لِلْاِیْمَانِ اَنْوَارٌ اِنَّ الْبَصَائِرَ لِلْاَبْصَارِ اَبْصَارٌ

ترجمہ۔ عقل کا ایک نور اور ایمان کے بہت سے انوار ہوتے ہیں۔ تحقیق باطنی آنکھیں ظاہری آنکھوں کے لئے مؤید ہوتی ہیں۔

حقیقت اسلام اور اس کی وجہ تسمیہ

اسلام عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی اردو میں بطور پیشگی ایک چیز کا مول دینا اور کسی کو اپنا کام سونپنا اور طالب صلح ہونا اور کسی امر یا خصومت کو چھوڑ دینا۔ اور اصطلاحی معنے وہ ہیں، جن کا قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ ہے۔ **بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ** ۔ترجمہ۔ یعنی مسلمان وہ ہے، جو خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے تمام وجود کو سونپ دے، یعنی اپنے تمام وجود کو اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کے ارادوں کی پیروی کے لئے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وقف کر دے۔ اور پھر نیک کاموں پر خدا تعالیٰ کے لئے قائم ہو جائے اور اپنے وجود کی تمام عملی طاقتیں اس کی راہ میں لگا دے۔ مطلب یہ ہے کہ اعتقادی اور عملی طور پر محض خدا تعالیٰ کا ہو جائے۔ اعتقادی طور پر اس طرح پر کہ اپنے تمام وجود کو در حقیقت ایک ایسی چیز سمجھ لے، جو خدا تعالیٰ کی شناخت اور اس کی اطاعت اور اس کے عشق اور محبت اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ اور عملی طور پر اس طرح کہ خالصاً للہ حقیقی نیکیاں، جو ہر ایک قوت کے متعلق اور ہر ایک خدا داد توفیق سے وابستہ ہیں، بجا لائے، مگر ایسے ذوق وشوق وحضور سے کہ گویا وہ اپنی فرمانبرداری کے آئینہ میں اپنے معبود حقیقی کے چہرہ کو دیکھ رہا ہے۔ پھر بقیہ ترجم آیت مذکورہ بالا کا یہ ہے کہ جس کی اعتقادی و عملی صفائی ایسی محبت ذاتی پر مبنی ہو اور ایسے طبعی جوش سے اعمال حسنہ اس سے صادر ہوں،۔ وہ وہی ہے، جو عنداللہ مستحق اجر ہے۔ اور ایسے لوگوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ کچھ غم رکھتے ہیں، یعنی ایسے لوگوں کے لئے نجات نقد موجود ہے، کیونکہ جب انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر ایمان لا کر اس سے موافقت تامہ ہوگئی اور ارادہ اس کا خدا تعالیٰ کے ارادہ کا ہم رنگ ہو گیا اور تمام لذت اس کی

فرمانبرداری الٰہی میں ٹھہر گئی اور جمیع اعمال صالحہ نہ مشقت کی راہ سے بلکہ تلذذ اور احتظاظ کی کشش سے صادر ہونے لگیں، تو یہی وہ کیفیت ہے، جس کو فلاح اور رستگاری سے موسوم کرنا چاہئے۔اور عالم آخرت میں جو کچھ نجات کے متعلق مشہود ومحسوس ہوگا وہ درحقیقت اسی کیفیت راسخہ کے اظلال وآثار ہیں، جو اس جہان میں جسمانی طور پر ظاہر ہوجائیں گے۔مطلب یہ ہے کہ بہشتی زندگی اسی جہان سے شروع ہوجاتی ہے۔اور جہنمی عذاب کی جڑھ بھی اسی جہان کی کورانہ زیست اور گندی زندگی ہے۔اب آیت ممدوحہ بالا پر ایک غائرنظر ڈالنے سے ہر ایک سلیم العقل سمجھ سکتا ہے کہ اسلام کی حقیقت تب کسی شخص میں متحقق ہوسکتی ہے کہ جب اس کا وجود مع اپنے تمام باطنی وظاہری قویٰ کے محض خدا تعالیٰ کے لئے اس کی راہ میں وقف ہوجائے۔اور جو امانتیں اس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں، پھر اس معطی حقیقی کو واپس دی جائیں۔اور نہ صرف اعتقادی طور پر بلکہ عمل کے آئینہ میں بھی اپنے اسلام اور اس کی حقیقت کاملہ کی ساری شکل دکھلائی جائے، یعنی شخص مدعی اسلام یہ بات ثابت کردے کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں اور دل اور دماغ اور اس کی عقل اور اس کا فہم اور اس کا غضب اور اس کا رحم اور اس کا علم اور اس کا حِلم اور اس کی تمام روحانی اور جسمانی قوتیں اور اس کی عزت اور اس کا مال اور اس کا آرام اور اس کا سرور اور جو کچھ اس کے سر کے بالوں سے پیروں کے ناخنوں تک باعتبار ظاہر و باطن کے ہے، یہاں تک کہ اس کی نیّات اور اس کے دل کے خطرات اور اس کے نفس کے جذبات سب خدا تعالیٰ کے ایسے تابع ہوجائیں کہ جیسے ایک شخص کے اعضا اس شخص کے تابع ہوتے ہیں۔غرض یہ ثابت ہوجائے کہ قدم صدق اس درجہ تک پہنچ گیا ہے کہ جو کچھ اس کو ہے، وہ اس کا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا ہوگیا۔اور تمام اعضا اور قویٰ الٰہی خدمت میں ایسے لگ گئے ہیں کہ گویا وہ جوارح الحق ہیں۔

اور لفظ اسلام کی وجہ تسمیہ کا بھی یہی راز ہے جو اس لفظ کے معنوں میں مرکوز ہے یعنی سچا مسلمان اپنا سارا حسی ومعنوی وجود خدا تعالیٰ کو سپرد کردیتا ہے اور اس کے احکام کا مطیع وفرمانبردار ہوجاتا ہے۔

واضح ہو کہ اسلام کے معنے صلح وآشتی اور نیک نمونہ کے بھی ہیں۔سَلْم اور سِلْم دونوں لفظ صلح کو چاہتے ہیں۔منجملہ ان باتوں کے، جن سے اسلام نے صلح کو قائم کیا ہے، ایک یہ ہے۔لَاتَسَبُّوْ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسَبُّوْ اللّٰہَ عَدْواً بِغَیْرِ عِلْمٍ۔یعنی تمام وہ قومیں جو اللہ کے سوا کسی کو پکارتی ہیں، ان کے معبود کو، بزرگ کو، خواہ وہ اللہ کے سوا ہی ہو اور وہ اس کی پرستش کرتے ہوں، ان کو بالکل گالی مت دو، کیونکہ وہ ناسمجھی سے اللہ تعالیٰ کو گالی دیں گے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام بڑی صلح اور بہت

بڑی آشتی کو چاہتا ہے۔

اس کے معنی فرمانبرداری کے بھی ہیں، مگر ہر ایک کی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اس کے رسول کی فرمانبرداری و الوالامر کی فرمانبرداری۔ اس کا نام اسلام رکھا ہے، جس کا لغوی معنی فرمانبرداری ہے، مگر الاسلام کے معنے خاص فرمانبرداری کے ہیں۔

اسلام سے ایک لفظ سُلّم بھی نکلا ہے۔ سُلّم اس سیڑھی کو کہتے ہیں، جس سے انسان بلندی کی طرف چڑھتا ہے۔ ایسے ہی ہماری ترقیات کے لئے اور بلند مراتب تک پہنچانے کے لئے خدا تعالیٰ نے اسلام کو بھیجا ہے۔ اسکے نمونے دیکھ لو کہ جناب ابوبکرؓ صدیق اور ان کے والد مکہ کے صنادید اور عمائد میں سے نہ تھے۔ مگر اسلام ہی تھا کہ اس کی فرمانبرداری نے محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کا جانشین بنا دیا۔

حضرت عمرؓ ایک دفعہ حج سے واپس آتے ہوئے ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ کئی آدمی ساتھ تھے۔ رعب کے سبب کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وجہ دریافت کرے۔ مگر حذیفہ کو جناب سے بے تکلفی تھی۔ اس نے پوچھا، تو فرمایا۔ خطاب کا بیٹا یہاں اونٹ چراتا تھا۔ اس کے باپ نے اسے یہاں جھڑکی دی تھی۔ آج اسلام نے اسے اس بلندی پر پہنچا دیا ہے کہ لاکھوں آدمی اس کے ایک اشارہ پر خون بہانے کو تیار ہیں۔

اسی لفظ سے سلامتی نکلتی ہے، جس سے حفاظت کی معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اسلام میں سچے فرمانبردار کو آتشک وسوزاک میں کبھی مبتلا نہیں دیکھو گے۔ ایسا کبھی نہیں دیکھا گیا کہ اسلام کے باعث کسی کو بید لگے ہوں۔ کوئی تکلیف کسی کو اسلام کے سبب نہیں پہنچتی، بلکہ اگر خدا تعالیٰ کی خاطر جہاں غرق کر دینا پڑے، تو اسے پرواہ نہیں۔ کیا حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں پرواہ کی ہے۔ یہ بات نہایت سچ ہے۔

غرض اسلام سلامتی چاہتا ہے۔ اسلام کے بھیجنے والے کا نام **اَلسَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ** ہے۔ اسلام نام ہے اللہ تعالیٰ کا۔ اسلام کا نتیجہ بہشت ہے۔ بہشت کا نام بھی دارالسلام ہے۔ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے **لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ** ۔ یعنی مومنوں کے لئے خدا کے پاس سلامتی کا گھر ہے۔ ایک اور مقام میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ** ۔ ترجمہ۔ جس نے اتارا ہم کو ٹھہرنے کی گھر میں اپنے فضل سے، جس میں ہم کو نہ تو مشقت کا سامنا کرنا پڑے اور نہ تھکاوٹ کا۔

لَـمَّـا تُسَـمَّـى بِـالسَّلَامِ لِخَلْقِـهٖ	كَانَ السَّلَامُ لَهٗ الْمقامُ الشَّامِخُ
وَ الْحُكْمُ فِيْهِمْ بِالَّذِیْ قَدْ شَاء ہٗ	اَلْـعِـزُّ وَالْـمَـجْدُ التَّلِيْـهُ الْبَـاذِ خُ
اِنَّ السَّلَامَ تَـحِيَّةٌ مِـنْ رَبِّـنَـا	فِيْنَا وَ مِنْ اَسْمَائِهٖ نَرْجُو السَّلَامُ
وَ لَـنَـا التَّـاخِـرُ عَـنْ عُـلُوِّ مَقَامِـهٖ	وَ لَـهٗ التَّـقَدُّمُ وَالتَّحَكُّمُ وَالْاِمَامُ

ترجمہ۔ چونکہ خدا تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لئے بہشت کو سلام سے موسوم کیا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اور حکم (شریعت اسلام کا) جو اس نے مخلوق میں جاری کیا ہے، اس کے ذریعہ اس نے لوگوں کے لئے عزت اور بزرگی و بلندی چاہی ہے۔ ہم کو اسلام خدا کی طرف سے سلامتی کا تحفہ ملا ہے۔ سلام خدا کا نام ہے۔ پس اس کے ناموں سے ہم کو سلامتی کی امید ہے۔ ہم سلام کے بلند مقام سے پیچھے ہٹے ہیں۔ اور سلام کو ہم پر تقدم و تحکم امامت کا حق ہے۔

مومن کو جو دعا میں سلام علیکم کہا جاتا ہے، اس میں ایسی دعا کا ارادہ کیا گیا ہے، جو تمام ادعیہ کی جامع ہے۔ اسلام سُکھوں کا موجب ہے۔ اسلام میں کبھی کوئی ہلاکت نہیں ہوئی۔ اس لفظ کو الٹ پلٹ کر کے دیکھ لو۔ اس کے سارے لفظوں میں خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ **سلم** کو الٹا دیں، تو **لمس** بن جاتا ہے۔ **لمس** نرم چیز کو کہتے ہیں۔ مسلمان **اشداء علی الکفار** اور **رحماء بینھم** ہیں، یعنی آپس میں رحیم کریم ہوتے ہیں۔ اسی لفظ کو الٹا دیں، تو **لَسم** بن جاتا ہے۔ **لسم** کے معنے یہ ہیں کہ انسان حیاء کے سبب بعض وقت خاموشی اختیار کرے۔ **مَسل** بھی اس کا الٹ بنتا ہے۔ اس کے معنے ہیں پانی کو دوسری جگہ پہنچا دیں۔ مسلمان کا یہ بھی کام ہے کہ دوسرے کو نفع پہنچائے۔ **لَمُس** بھی اس کا مشتق ہے۔ اس کے معنے ہر وقت طلب میں لگے رہنے کے ہیں۔ پس مسلمان کا یہ بھی کام ہے کہ ہر وقت رضاء الٰہی کی طلب میں لگا رہے۔

سلامتی سے اسلام نکلا ہے۔ اسی واسطے خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو محفوظ رکھا۔ یہ بھی اسکی سچائی کی ایک گواہی ہے کہ کس طرح اس نے قرآن کریم کی حفاظت فرمائی کہ اسکے زیر وزبر تک محفوظ ہیں۔ پھر قرآن کے پہنچانے والوں اور اسکے معانی کے محافظین کا سلسلہ موجود ہے۔

اسلام کے معنے ہیں فرمانبرداری۔ اور **طاعت الاسلام** کے معنے ہیں خاص طاعت انقیاد حکم حاکم پر کاربند ہونا اور اس کی منع کردہ باتوں سے رک جانا۔ اور حاکم پر کوئی اعتراض نہ کرنا۔ (اقرب الموارد۔ مجمع البحار)

یہ لفظ **سِلم** سے نکلا ہے، جس کے معنے صلح وآشتی کے ہیں۔ اس کا مادہ **السلام** اور **السلامۃ** بھی کہا گیا ہے، جس کے معنے ہیں ہر قسم کے الزاموں سے بری ہونا۔ عافیت کی زندگی بسر کرنا، باہمی صلح

سے رہنا، جنگ نہ کرنا۔ عمدہ عزت و پیار کے الفاظ سے ایک دوسرے کے ساتھ پیش آنا۔ جناب الٰہی کے حضور خشوع و خضوع و انکسار سے رہنا۔ نبی کریم جو کچھ لائے ہیں، سب کا کاربند ہونا (لسان العرب) کامل اخلاص عبادت میں اختیار کرنا (مجمع البحرین) خلاصہ معانی فرمانبرداری، صلح، سلامت روی، پاک و بے عیب زندگی بسر کرنا۔ بغاوت سے بچنا۔ عبادت میں شرک سے بچنا۔ کامل انسان اور صاحب خلق عظیم کا اتباع کرنا (ماخوذ)

دلائل بر وجود باری تعالیٰ

(۱) زمانے کی ایک ابتدا بالضرور ماننی پڑتی ہے، کیونکہ اگر زمانے کی ابتدا نہیں، تو چاہئے کہ بنی آدم سے تمام زمین بھر جائے اور ایک بالشت بھر جگہ خالی نہ رہے۔ حکیموں نے تجربہ کر کے تخمینہ لگایا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت سے سات ہزار برس تک تمام مسکوں (رہائشی علاقہ) بھر سکتا ہے۔ اگر سات ہزار برس سے زیادہ مدت گزر ے، تو ان کے واسطے کوئی اور زمین چاہئے۔ ہر ایک آدمی سوچ سکتا ہے کہ اس کی قوم کے کس قدر آدمی دنیا میں پہلے پیدا ہوئے ہیں۔ مثلاً آج سے آٹھ سو برس پہلے مغل نام کا ایک شخص تھا، جس کی اولاد قوم مغل ہے۔ اب شمار کرو کہ اب تک کتنے مغل ہوئے ہیں۔ اسی طرح تین سو برس کا عرصہ گزرا ہے کہ باوا نانک صاحب ایک شخص ہوا ہے۔ اب اس کی اولاد کی تعداد ہزار ہا تک پہنچ چکی ہے۔ اس دلیل سے معلوم ہوا کہ دنیا کی ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا ہے۔ ابتدا اس سے ثابت ہے کہ جیسا اوپر کے بیان پر نظر ڈالتے جاؤ، تو دنیا کا کتنا وجود ثابت ہوتا ہے۔ اور انتہا اس سے ثابت ہے کہ زمین ایک میدان محدود ہے، غیر محدود پیدائش کی گنجائش نہیں رکھتی۔ تو ناچار کسی دن اس دنیا کا خاتمہ ہے۔ پس جس چیز کی ابتدا ہے اور انتہا ہے، وہ چیز بنائی (مصنوعی) گئی ہے، قدیم نہیں ہو سکتی۔ اور جب مصنوعی ہوئی تو اس کا ایک صانع ماننا پڑا اور وہ خدا ہے۔ اگر یہ سوال ہو کہ بعض خاندانوں میں کثرت اولاد نہیں، اتنے کے اتنے ہی رہتے ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک عارضہ ہے۔ ورنہ تجربہ سے ثابت ہے کہ آدمی ایک بکری خریدتا ہے، تو اس کا ریوڑ بن جاتا ہے۔ اور یہ ایک قاعدہ ہے کہ دنیا میں طبعی موت ساٹھ برس کے بعد آتی ہے۔ اور پرورش الٰہی بندہ کو ہر وقت شامل حال رہتی ہے۔ اور اس پر صاف دلیل یہ ہے کہ جو اجزا میرے پہلے آباد نہ تھے وہ اب آباد ہیں۔

(۲) کوئی مصنوع بغیر صانع کے نظر نہیں آتا۔ اور ایک چھوٹا کوٹھا بغیر بنانے والے کے بن نہیں سکتا۔ پھر اتنا بڑا کوٹھا کہ جس کے فرش کا محیط چوبیس ہزار میل سے زیادہ ہے اور جس کا سقف کمال صفائی سے محکم طور پر بنایا گیا ہے اور جس کے اوپر چراغ رکھے ہیں تا کہ روشنی بخشیں۔ اور ایسی ترتیب ہے کہ

ایک کوسب سے اعلیٰ بنایا ہے اور باقی کو روشن تابع مقرر کیا ہے، کس طرح بغیر بنانے والے کے خود بخود بن گیا۔

اس جگہ دہریے یہ سوال کرتے ہیں کہ دنیا کے کوٹھے بنانے والوں کو ہم بچشم خود دیکھتے ہیں۔ لیکن آسمانوں وزمین کے بنانے والا ہم کو نظر نہیں آتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوٹھا بنانے والا نظر آتا ہو، تو دلیل پکڑنے کی کیا حاجت تھی۔ دلیل تو اسجگہ پکڑی جاتی ہے کہ جب ایک شے کا وجود بغیر اس کے نظر آنے کے ثابت کرنا پڑتا ہے۔ دیکھو مصر میں ایسی ایسی قدیم عمارات موجود ہیں کہ اب اس زمانہ کے لوگ ان کو بنا نہیں سکتے۔ لیکن یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ بھی معمار تھے، جنہوں نے ان کو بنایا۔ مصنوع کے صانع پر ذاتی دلالت ہے، خواہ صانع نظر آتا ہو یا نہ آتا ہو۔ اگر ایک آدمی نئی کل بنائے، جو کسی نے پہلے نہیں بنائی اور اس جنس کی صفت پہلے کسی نے نہیں بنائی اور وہ آدمی ہم نے دیکھا بھی نہ ہو، تو کیا ہم خیال کر سکتے ہیں کہ وہ خود بخود بن گئی۔ ہر ایک عقلمندی کا کام ایک عاقل کی دستکاری پر دلالت کرتا ہے۔ یہ مثال تعصب اور تاریکی نفس ہے کہ باوجود اقرار اس بات کے کہ صفت کو دیکھ کر یہ کہیں کہ فی الحقیقت یہ عاقلانہ کام ہے۔ پھر بھی انکار کریں کہ کسی عاقل کی بنائی ہوئی ہیں۔ ذی شعور اور غیر ذی شعور کے فعل میں ہمیشہ ایک فرق ہوتا ہے۔ جس مصنوع میں یہ علامت پائی جائے کہ اس کے صانع نے اپنے مطالب کو بالارادہ مدنظر رکھا ہے اور فعل عبث نہیں، تو اس مصنوع پر عقل سلیم فیصلہ کرے گی کہ یہ کسی صانع ذی شعور کا فعل ہے۔ جیسے اگر کسی کاغذ پر سیاہی گر جائے، تو ممکن ہے کہ انسان نے گرائی ہو یا کسی چوہے نے گرائی ہو یا یوں ہی اتفاقاً گر گئی ہو۔ لیکن اگر کسی کاغذ پر ایک صفحہ کسی کتاب کا لکھا جائے، جو کوئی ضروری مطلب اس سے معلوم ہوتا ہو، تو کوئی دانا نہیں کہے گا کہ خود بخود بغیر کاتب کے لکھا گیا۔ پھر اگر یہ ایسی وضع کے حرف ہوں کہ پہلے اس وضع کے حرف ہم نے نہیں دیکھے، لیکن جب ہم نے غور سے دریافت کر لیا کہ یہ بھی حرف ہیں اور عبارت ہے، صدہا صفحہ پر برابر بنتے چلے گئے ہیں، تو پھر اگر چہ ہم نے اس کے کاتب کو نہیں دیکھا اور نہ اس نئی طرز کے کبھی حروف دیکھے ہیں، لیکن اس میں کیا شک رہیگا کہ ضرور یہ کسی کاتب کی ایجاد ہے۔ دیکھو اگر یہ کوٹھا زمین آسمان ایک چھوٹا کوٹھا ہوتا، تو تم اس کی کمال خوبصورتی دیکھ کر ضرور کہتے کہ کسی دانا انسان کا بنایا ہوا ہے۔ پس اب یہ سوچنا چاہئے کہ جس حالت میں چھوٹا کوٹھا بھی بغیر بنانے والے کے نہیں بن سکتا، تو یہ عالم، جو بڑا کوٹھا ہے، بغیر بنانے والے کے کس طرح بن گیا۔

(۳) دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک چیز دوسری چیز کی مدد سے تیار ہوتی ہے۔ جیسے درخت پانی کی مدد سے اور بارش آفتاب کی مدد سے اور وجود حیوانات دوسرے حیوانات کی مدد سے۔ زمین پر کوئی چیز نظر

نہیں آتی کہ بغیر دوسری چیز کے اس کا بچاؤ ہوسکے یا پیدا ہوسکے۔ پس ایک وجود ایسا ماننا پڑا، جو سب کا مددگار رہو۔ وہی واجب الوجود ہے۔

آدمی بنا نطفہ سے اور نطفہ بنا اناج سے اور اناج بنا مٹی سے اور مٹی کہاں سے بنی؟ اگر کہو کہ مٹی خود بخود چلی آتی ہے، تو یہ بات ناقص ہے۔ کیونکہ خود بخود اس چیز کا وجود ہوتا ہے، جو دوسرے کی کسی حالت میں محتاج نہ ہو۔ لیکن مٹی اکٹھا رہنے کے لئے پانی کی محتاج ہے۔ اگر مٹی میں پانی نہ ملا ہو، تو مٹی کو ہوا اڑا کر لے جائے۔ اور نیز مٹی نباتات کے اگانے میں پانی کی محتاج ہے۔ اور کوئی محتاج چیز قدیمی نہیں ہوسکتی۔ اور محتاج کو نہیں کہہ سکتے کہ اس کا وجود واجب ہے۔ علاوہ اس کے مٹی سے درخت پیدا ہوتے ہیں اور وہ اس سے بہتر ہیں اور مٹی ناقص ہے۔ پس ناقص واجب الوجود نہیں ہوسکتا۔

(۴) خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخَالِقِیۡنَ** ۔ اور نیز فرماتا ہے۔ **اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰاتِ وَ الۡاَرۡضِ** ۔ ان دونوں آیتوں کے یہ معنے ہیں کہ ملاحظہ عالم سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک چیز ایک چیز کی خالق اور فاطر ہے، جیسے سورج کی گرمی سے بخارات پیدا ہوتے ہیں اور بخارات سے بادل پیدا ہوتے ہے اور بادل سے پانی پیدا ہوتا ہے اور پانی سے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن خدا احسن الخالقین ہے اور اسی طرح خدا **فَاطِرِ السَّمٰوٰاتِ وَالۡاَرۡضِ** ہے، جو ان کو عدم سے وجود بخشتا ہے۔

پھر اگر وجود خدا نہ ہو، تو تمام خیرات کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، کیونکہ عام طور سے لوگ اس لئے خیرات کرتے ہیں کہ اس خیرات کے دینے سے ہمارا فائدہ ہے۔ اور کوئی شخص بلا لحاظ فائدہ و نقصان کوئی کام نہیں کرسکتا۔ بلکہ ایسا کام اس کی نظر میں محض عبث ٹھہرتا ہے۔ اسی طرح وجود خدا نہ ماننے والا بدی سے ڈر نہیں سکتا، کیونکہ بدی اس لحاظ سے بدی ہوتی ہے کہ اس کا نتیجہ بد ہوتا ہے۔ اگر اس کا نتیجہ بد نہ کہا جائے تو پھر ہرگز دل اس کو بد خیال نہیں کرسکتا۔ پھر اگر بدی کرنے میں کسی کا خوف نہ ہو، تو پھر بدی کرنے سے کون مانع ہے۔ اور اگر کہو کہ بادشاہ یا حاکم مانع ہیں، تو ہم کہتے ہیں کہ بادشاہوں اور حاکموں کو کون مانع ہے۔ جو شخص صاحب قدرت ہے، اس کو کس کا خوف ہے۔ علاوہ اس کے حاکم اور بادشاہ ہر وقت حاضر ناظر نہیں ہوتے۔ اور نہ انسان خیال کرتا ہے کہ وہ میرے کاموں کو ہر وقت دیکھتے ہیں۔

اور یہ جو کہتے ہیں کہ ہم نے زمین و آسمان کے صانع کو نہیں دیکھا۔ اس واسطے اس پر ایمان نہیں لاتے۔ یہ ان کی صاف شرارت ہے۔ کیونکہ اگر اس دنیا میں صانع دیکھا جاتا، تو پھر یہ دنیا دنیا نہ رہتی۔ اور کسی کو نیک کام کرنے میں ثواب نہ ہوتا۔ اس واسطے کہ ثواب اسی وقت تک ہے کہ جب آدمی تقویٰ

اختیار کر کے بحالت پوشیدگی خدا پر ایمان لائے۔ اور اگر خدا اپنی ذات کوخود بخود ظاہر کرے، تو پھر اس کا ثواب کیا ہوگا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے هُدًى لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ۔یعنی یہ کتاب اس متقیوں کے لئے ہدایت ہے کہ جو حالت پوشیدہ ہونے کے خدا پر ایمان لاتے ہیں۔

(۵) تمام مخلوقات کے خیالات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایک ذات رب العالمین ہے۔ اور نیز اس بات پر کہ حقیقت میں صنعت زمین و آسمان کی ایک ایسی صنعت ہے کہ بجز صانع کے بن نہیں سکتی۔ پس جس بات کو بہت دانا تجویز کریں، وہی حق ہوتی ہے۔ سوسیانے اِکومت مورکھ آپوآپنی۔

دہریہ کہتے ہیں کہ ہم نے زمین و آسمان کے صانع کو نہیں دیکھا۔ جبکہ عام طور سے ہر ایک چیز کے صانع ہم کو نظر آتے ہیں۔ پھر کس طرح زمین و آسمان کے صانع کے وجود پر یقین کریں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر صانع نظر نہ آئے، تو مصنوع تو نظر آتا ہے۔ اور اگر شے مصنوع ہے اور نہایت کاریگری سے بنائی گئی ہے، مگر اس کا صانع نظر نہیں آتا، تو یہ تو ہم ضرور کہیں گے کہ کسی شخص نے اس کو ضرور بنایا ہے۔ بحث تو یہ ہے کہ مصنوع صانع پر دلالت کرتا ہے یا نہیں۔ دہریہ کہتے ہیں کہ خواہ نہایت ہی عقلمندی کا کام ہو اور پرے درجہ کی کاریگری اس میں پائی جاتی ہو۔ مگر جب تک ہم صانع کو نہ دیکھیں گے، اس پر ایمان نہ لائیں گے۔ یہ ان کی شرارت ہے۔ ورنہ صانع کے دیکھنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ جو کام عقلمندی کا ہے جب ہم پر ثابت ہو جائے تو بلا اختیار ہمارے دل میں بیٹھ جائے گا۔ زمین و آسمان میں جتنی چیزیں ہیں، ہم ان کو بچشم خود دیکھتے ہیں کہ ایک چیز دوسری چیز کی مدد سے بنتی ہے اور ایک چیز دوسری چیز کی مدد سے قائم رہتی ہے۔ بلکہ زمین آسمان کی مدد سے اپنی طاقتیں ظاہر کرتی ہے۔ اس صورت میں یہ سوال دہریہ پر ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کس کی مدد و آسرے سے پیدا ہوئے اور اب تک قائم ہیں۔ دہریہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ زمین و آسمان اپنی شہادت سے قائم ہیں۔ پس اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ سبھاؤ باپ کا بیٹے سے پہچانا جاتا ہے۔ جو کچھ زمین و آسمان میں پیدا ہوتا ہے، وہ ان دونوں کا بیٹا ہے اور بغیر آسرے کے ٹھہر نہیں سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہی شہادت زمین و آسمان کی ہے۔ کیونکہ مولود کا والد سے مختلف سبھاؤ کبھی نہیں ہوسکتا۔

جو کام عقلمندی کا ہے اور جب ہم پر ثابت ہو جائیگا کہ یہ عقلمندی کا کام ہے تو پھر اس بات کی حاجت نہ رہے گی کہ پھر ہم اس کے صانع کو دیکھیں۔ دلیل اس پر یہ ہے کہ جس فعل کی صریح معلوم ہو کہ اس کے فاعل نے دیدہ دانستہ اس کے بنانے سے ایک بات کا قصد کیا ہے۔ اس فعل کو کوئی دانا اتفاقی طور پر ہونا نہیں مانے گا۔ بلکہ یہی سمجھے گا کہ ضرور اس کا ایک فاعل ہے۔ مثلاً اگر سیاہی کاغذ پر یوں ہی پڑ

جائے، تو اس میں شک ہوگا کہ کس طرح پڑ گئی۔ لیکن اگر ورق در ورق حرف لکھے جائیں اور حرف بھی وہ حرف، جس میں سے کوئی مقصد کاتب کا معلوم ہوتا ہو، تو کوئی عقلمند نہیں کہے گا کہ وہ خود بخود لکھے گئے۔

(۶) پھر دہریہ سے یہ سوال ہے کہ تم کو جوان اور بوڑھا کون کرتا ہے۔ یہ کس چیز کی تاثیر ہے؟ پھر دہریہ سے یہ سوال ہے کہ سورج اور چاند اور زمین اور ہوا جو تمہاری خدمت میں مشغول ہیں اور ایک دم بھی تمہاری خدمت سے الگ نہیں ہوتے تم ان کا احسان مانتے ہو یا نہیں؟ اگر تم کہو کہ وہ بغیر شعور کے اس کام میں لگے ہوئے ہیں، تو یہ غلط ہے۔ کیونکہ جو فعل بغیر شعور اور بغیر نگرانی دوسرے کے ہوتا ہے، وہ بگڑ جاتا ہے اور اگر شعور سے ہو، تو تم کو ان کا ممنون ہونا چاہئے۔

(۷) پھر دہریہ سے ہمارا سوال ہے کہ آفتاب کا نکلنا اور بارشوں کا ہونا اتفاقی ہے یا کسی کے تصرف ہوتا ہے۔ اگر اتفاقی ہے تو چاہئے کہ دنیا نہ رہے اور بہت بارشوں سے یا بہت دھوپوں سے دنیا تباہ و برباد ہو جائے۔ کیونکہ اتفاقی امر میں خطا بھی ہو جاتی ہے۔ اور اگر کسی کے تصرف سے ہے، تو وجود خدا ثابت ہوا۔ کیونکہ خدا وہی ہے، جو دنیا میں متصرف ہے۔

پھر دہریہ کہتے ہیں کہ کسی نے خدا کو نہیں دیکھا۔ اگر خدا کا وجود ہوتا، تو اس کو کوئی دیکھتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بندوں کو خدا تعالیٰ دل کی آنکھ سے اپنا دیدار دکھاتا ہے۔ پھر جو لوگ ان کے تابع ہوئے اور ان کی پیروی کی، وہ اس درجہ تک پہنچ گئے، جو ان کو خدا تعالیٰ نے اپنی پہچان بخشی۔ اس صورت میں یہ دعویٰ کہ کسی نے خدا کو نہیں دیکھا، اس کی مثال یہ ہے کہ ایک اندھا وجود آفتاب سے منکر ہو اور کہے کہ جب تک میں خود نہ دیکھ لوں آفتاب پر یقین نہ کروں گا۔ اس کا یہی جواب ہے کہ تو اندھا ہے اور آفتاب کو آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ تیرے واسطے طریق حصول تحقیق یہ ہے کہ جنہوں نے آفتاب کو دیکھا ہے، ان کے بیان پر اعتماد کر لو یا پہلے اپنی آنکھوں کا علاج کراؤ۔ پھر تو بھی اس کو دیکھ لے گا۔

(۸) ہم دہریہ سے پوچھتے ہیں کہ سکھ و دکھ دینے والا کوئی دوسرا ہے یا اپنی تدبیر سے مل سکتا ہے۔ اگر اپنی تدبیر سے مل سکتا ہے، تو کیوں تمام لوگ اپنی تدبیر سے اپنی عمر اور اپنا آرام زیادہ نہیں کر سکتے۔ ایک شخص بوڑھا ہو کر مرتا ہے، دوسرا جوان ہی مر جاتا ہے۔ حالانکہ ہر کوئی زیادہ عمر کا خواہشمند ہے۔ بعض اوقات آدمی سکھ چاہتا ہے، مگر غیب سے اس پر دکھ آپڑتا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ سکھ دکھ دینے والا کوئی اور ہے۔ اور وہی خدا تعالیٰ ہے۔

ہر دم از کاخ عالم آوازیست کہ یکش بانی و بناسا زیست
نہ کس او را شریک وانبازیست نے بکارش وخیل و ہمرازیست

ایں جہاں را عمارت اندازیست | دراز جہاں برتراست وممتاز یست
وحدہٗ لا شریک حیّ و قدیر | لم یزل لا یزال فردو بصیر
کارساز جہاں و پاک و قدیم | خالق و رزاق و کریم و رحیم
نیست از حکم او بروں چیزے | نہ از چیزے است اونہ چوں چیزے
نتواں گفت لامس اشیا ست | نے تواں گفتن اینکہ دور از ماست
نے وجود بذات او انباز | نے کسے در صفات او انباز

(۹) سنو۔ ہمارا تمہارا وجود پائدار نہیں، نہ ازل سے ہے اور نہ ابد تک رہیگا۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہم پردۂ عدم میں مستور تھے اور پھر اسی طرح ایک زمانہ آنیوالا ہے، جس میں ہمارا نام ونشان ہستی سے مٹ جائیگا۔ یہ وجود ہستی کا زوال وانفصال بآواز بلند کہتا ہے کہ ہمارا خانہ زاد نہیں، مستعار ہے۔ یعنی مثل نور زمین وگرمی آب ہے۔ مگر جیسے زمین کا نور اور آب گرم کی گرمی آفتاب اور آگ کا فیض اور اسکی عطا ہے، ایسا ہی ہمارا وجود بھی کسی ایسے کا فیض وعطا ہوگا، جسکا وجود خانہ زاد ہو، مستعار نہ ہو۔ جیسے آفتاب اور آگ پر نور اور گرمی کا قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ یوں نہیں کہہ سکتے کہ عالم اسباب میں آفتاب اور آگ سے اوپر کوئی اور ہے، جسکے فیض سے وہ منور اور یہ گرم ہے۔ ایسے ہی ہمارا وجود جس کا فیض ہوگا، اس پر وجود کا قصہ ختم ہو جائیگا۔ یہ نہ ہوگا کہ اسکا وجود کسی اور کا فیض ہو۔ ہم اس کو خدا اور اللہ اور مالک الملک کہتے ہیں۔ جب اسکا وجود اس کا ہے، کسی اور کا دیا ہوا نہیں، تو بیشک اسکا وجود اسکے ساتھ اسی طرح لازم وملزوم رہیگا، جیسے آفتاب کے ساتھ نور اور آگ کے ساتھ گرمی۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ آگ ہو اور گرمی نہ ہو۔ آفتاب ہو اور نور نہ ہو۔ ایسے ہی یہ بھی نہ ہوگا کہ خدا کی ذات ہو اور اس کا وجود نہ ہو۔ یہ خیال بھی غلط ہوگا۔ اسلئے خدا کی ذات کا ہونا بے وجود متصور نہیں ہوتا۔ اس وجود اور موجودیت ہی کو تو خدا کہتے ہیں۔

(۱۰) خداتعالیٰ نے قرآن شریف میں اپنی ہستی کی دلیل علۃ العلل ہونا قرار دی ہے، جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ وَاِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَهٰی۔ یعنی تمام سلسلۂ علل ومعلولات کا تیرے رب پر ختم ہو جاتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نظر تعمق سے معلوم ہوگا کہ یہ تمام موجودات علل ومعلول کے سلسلہ سے مربوط ہیں۔ اسی وجہ سے دنیا میں طرح طرح کے علوم پیدا ہو گئے ہیں۔ کیونکہ کوئی حصہ مخلوقات کا نظام سے باہر نہیں۔ بعض بعض کے لئے بطور اصول اور بعض بطور فروع کے ہیں۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ علت یا تو اپنی ذات سے قائم ہوگی یا اس کا وجود کسی دوسری علت کے وجود پر منحصر ہوگا۔ اور پھر یہ دوسری علت کسی اور علت پر وعلیٰ ہذا القیاس۔ اور یہ تو جائز نہیں کہ اس محدود دنیا میں علل ومعلول کا سلسلہ

کہیں جا کر ختم نہ ہو اور غیر متناہی ہو۔ بالضرور ماننا پڑا کہ یہ سلسلہ ضرور کسی آخیر علت پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ پس جس پر اس تمام سلسلہ کی انتہا ہے، وہی خدا ہے۔ آنکھ کھول کر دیکھ لو کہ یہ آیت اپنے مختصر لفظوں میں کس طرح اس دلیل مذکورہ بالا کو بیان فرما رہی ہے۔ جس کے یہ معنے ہیں کہ انتہا تمام سلسلہ کی تیرے رب تک ہے۔

(۱۱) ایک اور دلیل خدا تعالیٰ نے اپنی ہستی پر قرآن کریم میں دی ہے، جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ **لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِيْ لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ** ۔ترجمہ۔ یعنی آفتاب چاند کو نہیں پکڑ سکتا اور نہ رات، جو مظہر آفتاب ہے، دن پر، جو مظہر آفتاب ہے، کچھ تسلط کر سکتی ہے۔ یعنی کوئی ان میں سے اپنی حدود مقررہ سے باہر نہیں جاتا۔ اگر ان کا در پردہ کوئی مدبر نہ ہو، تو یہ تمام سلسلہ درہم برہم ہو جائے۔ یہ دلیل ہیئت پر غور کرنے والوں کے لئے نہایت فائدہ بخش ہے۔ کیونکہ اجرام فلکی کے اتنے بڑے عظیم الشان بیشمار گولے ہیں، جن کے تھوڑے سے بگاڑ سے تمام دنیا تباہ ہو سکتی ہے۔ یہ کیسی قدرت حق ہے کہ وہ آپس میں نہ ٹکراتے ہیں اور نہ بال بھر رفتار بدلتے اور نہ اتنی مدت تک کام دینے سے گھسے۔ اور نہ ان کی کلوں ہزاروں میں کچھ فرق آیا۔ اگر سر پر کوئی محافظ نہیں، تو کیونکہ اتنا بڑا کارخانہ بیشمار برسوں سے خود بخود چل رہا ہے۔ انہیں حکمتوں کی طرف اشارہ کر کے خدا تعالیٰ دوسرے مقام پر فرماتا ہے۔ **اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ** ۔یعنی کیا خدا کے وجود میں شک ہو سکتا ہے، جس نے ایسے آسمان اور ایسی زمین بنائی۔

(۱۲) پھر ایک دلیل قرآن کریم میں خدا تعالیٰ نے اپنی ہستی کی یہ دی ہے۔ **كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ** ۔یعنی ہر ایک چیز معرض زوال میں ہے اور جو باقی رہنے والا ہے، وہ خدا ہے، جو جلال اور بزرگی والا ہے۔ اب دیکھو کہ اگر ہم فرض کر لیں کہ ایسا ہو کہ زمین ذرہ ذرہ ہو جائے اور اجرام فلکی بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور ان پر معدوم کرنے والی ایک ایسی ہوا چلے، جو تمام نشان اس چیزوں کے مٹا دے، مگر پھر بھی عقل اس بات کو مانتی اور قبول کرتی ہے، بلکہ صحیح کانشنس اس کو ضروری سمجھتا ہے کہ اس تمام نیستی کے بعد بھی ایک چیز باقی رہ جائے، جس پر فنا طاری نہ ہو اور تبدل و تغیر کو قبول نہ کرے۔ اور اپنی پہلی حالت پر باقی رہے۔ پس وہی خدا ہے، جو تمام فانی صورتوں کو ظہور میں لایا۔ اور خود فنا کی دستبرد سے محفوظ رہا۔

(۱۳) پھر ایک اور دلیل خدا تعالیٰ اپنی ہستی پر قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ **اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى** ۔یعنی میں نے روحوں کو کہا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں۔ انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں۔ اس آیت

میں خدا تعالیٰ قصہ کے رنگ میں روحوں کی اس خاصیت کو بیان فرماتا ہے، جو ان کی فطرت میں اس نے رکھی ہوئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کوئی روح فطرت کی رُو سے خدا تعالیٰ کا انکار نہیں کرسکتی۔ صرف منکروں کو اپنے خیال میں دلیل نہ ملنے کی وجہ سے انکار ہے، مگر باوجود اس انکار کے وہ اس بات کو مانتے ہیں کہ ہر ایک حادث کے واسطے ضرور ایک محدّث ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی نادان نہیں کہ اگر مثلاً بدن میں کوئی بیماری ظاہر ہو، تو وہ اس بات پر اصرار کرے کہ در پردہ اس بیماری کے ظہور کی کوئی علت نہیں۔ اگر یہ سلسلہ دنیا کا علل اور معلول سے مربوط نہ ہوتا، تو قبل از وقت یہ بتا دیتا کہ فلاں تاریخ کو طوفان آئیگا، یا آندھی آئیگی یا خسوف ہوگا یا کسوف ہوگا۔ یا فلاں وقت بیمار مر جائے گا، یا فلاں وقت ایک بیماری کے ساتھ فلاں بیماری لاحق ہو جائیگی۔ یہ تمام باتیں غیر ممکن ہو جائیں۔ پس ایسا انسان اگرچہ خدا کے وجود کا اقرار نہیں کرتا، مگر ایک طور سے تو اس نے اقرار کر ہی دیا کہ وہ بھی ہماری طرح معلومات کے لئے علل کی تلاش میں ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا اقرار ہے۔ اگرچہ کمال اقرار نہیں۔

اگر کسی ترکیب سے منکر وجود باری کو ایسے طور سے بیہوش کیا جائے کہ وہ اس سفلی زندگی کے خیالات سے بالکل الگ ہو کر اور تمام ارادوں سے معطل رہ کر اعلیٰ ہستی کے قبضہ میں ہو جائے، تو وہ اس صورت میں خدا کے وجود کا اقرار کریگا، انکار نہیں کریگا، جیسا کہ اس پر بڑے بڑے مجربین کا تجربہ شاہد ہے۔ سو اسی حالت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ اور مطلب آیت یہ ہے کہ انکار وجود باری تعالیٰ صرف سفلی زندگی تک ہے، ورنہ اصل فطرت میں اقرار بھرا ہوا ہے۔

(۱۴) خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں اپنی ہستی پر ایک اور دلیل یہ بیان فرمائی ہے۔ رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی۔ ترجمہ۔ یعنی خدا وہ ہے کہ جس نے ہر ایک شے کے مناسب حال اسکو پیدائش بخشی۔ پھر اس شے کو اپنے کمالات مطلوبہ حاصل کرنیکی راہ دکھلا دی۔ اب اگر اس آیت کے مفہوم پر نظر رکھ کر انسان سے لیکر بحری اور بری جانوروں اور پرندوں کی بناوٹ تک کو دیکھا جائے، تو خدا تعالیٰ کی قدرت یاد آتی ہے کہ ہر ایک چیز کی بناوٹ اسکے مناسب حال معلوم ہوتی ہے۔

(۱۵) خدا تعالیٰ جو علت العلل ہے، یعنی وہ پاک ذات، جسکے وجود کے ساتھ تمام وجودوں کا سلسلہ وابستہ ہے۔ جب وہ کبھی مربیّانہ یا قاہرانہ طور پر کوئی جنبش اور حرکت ارادی کس امر کے پیدا کرنے کیلئے کرتا ہے، تو وہ حرکت اگر اتم اور اکمل طور پر ہو، تو جمیع موجودات کی حرکت کو مستلزم ہوتی ہے۔ اور اگر بعض پیشوں کے لحاظ سے، یعنی جزئی حرکت ہو، تو اسکے موافق عالم کے بعض اجزا میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ خدائے عز و جل کے ساتھ اس کی مخلوقات اور جمیع عالموں کا جو علاقہ ہے، وہ

اس علاقہ سے مشابہ ہے، جو جسم کو جان سے ہوتا ہے۔ اور جیسے جسم کے تمام اعضا روح کے ارادوں کے تابع ہوتے ہیں۔ اور جس طرف روح جھکتی ہے، اسی طرف وہ جھک جاتے ہیں۔ یہی نسبت خدا تعالیٰ اور اسکی مخلوقات میں پائی جاتی ہے۔ اگرچہ میں صاحب فصوص حضرت محی الدین ابن عربی المعروف شیخ اکبر کی طرح حضرت واجب الوجود کی نسبت تو یہ نہیں کہتا کہ خَلَقَ الْاَشْیَاءَ وَ هُوَ عَیْنُهَا۔ مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ خَلَقَ الْاَشْیَاءَ وَ هُوَ كَعَیْنِهَا. هٰذَا الْعَالِمَ كَصَرْحٍ مُمَرَّدٍ مِنْ قَوَارِیْرَ وَ مَاءَ الطَّاقَةُ الْعُظْمٰی یَجْرِیْ تَحْتِهَا وَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ یُخَیَّلُ فِیْ عُیُوْنِ قَاصِرَةٍ كَاَنَّهَا هُوَ یَحْسَبُوْنَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النَّجُوْمَ مُؤَثِّرَاتٍ بِذَاتِهَا وَ لَا مُؤَثِّرٌ اِلَّا هُوَ۔ (ماخوذ)

(۱۶) اگر بنظر امعان دیکھو گے، تو معلوم ہوگا کہ اس عالم کی ہر ایک چیز میں خدا تعالیٰ کی طرف ایک مقناطیسی کشش پائی جاتی ہے۔ اور ہر ایک ذرہ ایسا بالطبع اسکی طرف جھکا ہوا معلوم ہوتا ہے، جیسے ایک وجود کے متفرق اعضا اس وجود کی طرف جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ پس درحقیقت یہ عالم اس وجود اعظم کیلئے بطور اعضا کے واقعہ ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ قیوم العالمین کہلاتا ہے۔ کیونکہ جیسی جان اپنے بدن کی قیوم ہوتی ہے، ایسا ہی وہ تمام مخلوقات کا قیوم ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو تمام نظام عالم بگڑ جاتا۔

واضح رہے کہ اس جگہ اس مثال سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ہم نے خدا تعالیٰ کو جسمانی قرار دیا ہے۔ بلکہ یہ ایک تنزیہی مثال ہے۔ اس بارے میں ہمارا یہی عام عقیدہ ہے، جو خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے۔ لَیْسَ كَمِثْلِهٖ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۔ ترجمہ۔ یعنی خدا کی مثل کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سنتا دیکھتا ہے۔ وہ وہی بے مثل ہے، جس کا کوئی ثانی نہیں، جس کا کوئی ہم صفات نہیں۔ اور جس کی طرح کوئی فرد کسی خاص صفت سے مخصوص نہیں۔ اور جس کی کوئی طاقت کم نہیں۔ وہ قریب ہے باوجود دور ہونے کے۔ اور دور ہے باوجود نزدیک ہونے کے۔ وہ سب سے اوپر ہے، مگر نہیں کہہ سکتے کہ اس کے نیچے کوئی اور بھی ہے۔ اور وہ عرش پر ہے، مگر نہیں کہہ سکتے کہ وہ زمین پر نہیں۔ وہ مجمع ہے تمام صفات کاملہ کا۔ اور مظہر ہے تمام محامد حقہ کا۔ اور سرچشمہ ہے تمام خوبیوں کا۔ اور جامع ہے تمام طاقتوں کا۔ اور مبداء ہے تمام فیضوں کا۔ اور مرجع ہے ہر ایک شئی کا۔ اور مالک ہے ہر ایک مُلک کا۔ اور متّصف ہے ہر ایک کمال سے۔ اور منزہ ہے ہر ایک عیب اور ضعف سے۔ اور مخصوص ہے اس امر میں کہ زمین والے اور آسمان والے اسی کی عبادت کریں۔ اور اسکے آگے کوئی بات انہونی نہیں۔ تمام روح اور انکی طاقتیں اور تمام ذرات اور ان کی طاقتیں اس کی پیدائش ہیں۔ اس کے بغیر کوئی چیز ظاہر نہیں ہوتی۔ وہ اپنی طاقتوں اور قدرتوں اور اپنے شانوں سے اپنے تئیں آپ ظاہر کرتا ہے۔ اور اس کو اسی کے ذریعہ ہم پا سکتے ہیں۔ اور

وہ راستبازوں پر ہمیشہ اپنا وجود ظاہر کرتا رہتا ہے۔ اور اپنی قدرتیں ان کو دکھلاتا ہے۔ اور دیکھتا ہے بغیر جسمانی آنکھوں کے۔ اور سنتا ہے بغیر جسمانی کانوں کے۔ اور بولتا ہے بغیر جسمانی زبان کے۔ اسی طرح نیستی سے ہست کرنا اس کا کام ہے، جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ خواب کے نظارہ میں بغیر کسی مادہ کے ایک عالم پیدا کر دیتا ہے۔ اور ہر ایک فانی اور معدوم کو موجود دکھلا دیتا ہے۔ پس اسی طرح اس کی تمام قدرتیں ہیں۔ نادان وہ ہے، جو اس کی قدرتوں سے انکار کرے۔ اندھا ہے وہ، جو اس کی عمیق در عمیق طاقتوں سے بے خبر ہے۔ وہ سب کچھ کرتا ہے اور کر سکتا ہے بغیر اس امور کے، جو اس کی شان کے مخالف ہیں، یا اس کے مواعید کے برخلاف ہیں۔ وہ واحد ہے اپنی ذات میں اور صفات میں اور افعال میں اور قدرتوں میں۔ اس کی قدرت وحکمت ہر جگہ اور ہر چیز میں موجود ہے۔ اور اس کی حفاظت، جو ہر ایک چیز کے شامل حال ہے، اس کی عام خالقیت پر گواہ ہے۔ اس کی حکیمانہ طاقتیں بے انتہا ہیں۔ کون ہے، جو ان کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے۔ اس کی قادرانہ حکمتیں عمیق در عمیق ہیں۔ کون ہے، جو ان پر احاطہ کر سکتا ہے۔ ہر یک چیز کے اندر اس کے وجود کی گواہی چھپی ہوئی ہے۔ ہر یک مصنوع اس صانع کامل کی راہ دکھلا رہا ہے۔ موجود بوجود حقیقی وہی رب العالمین ہے اور باقی سب اس سے پیدا اور اسکے سہارے سے قائم اور اس کی قدرتوں کے نقش قدم ہیں۔

(۱۷) یہ بات مسلم ہے کہ اس عالم کا وجود اصلی نہیں، بلکہ عارضی چیز ہے، جیسے گرم پانی کی گرمی، جو اصلی نہیں عارضی ہے، آگ کا فیض ہے، جس کی گرمی اصلی ہے۔ ایسے ہی اس عالم کا وجود، جو عارضی ہے، کسی وجود اصلی کا فیض ہوگا۔ اور وہ موجود اصلی اس عالم کا خدا اور خالق ہے۔ مگر چونکہ سب کا وجود ایک طرح کا نظر آتا ہے، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، تو جیسے آفتاب سے گو ہزار ہا جگہ دھوپ پھیلے مگر سب کے سب ایک ہی آفتاب کا فیض ہے۔ ایسے ہی یوں سمجھنا چاہئے کہ تمام عالم کا وجود بھی ایک موجود حقیقی اور اصلی کا پرتو ہے۔ سو اسی کو ہم خدا کہتے ہیں۔

سنو۔ ہمارا خدا وہ خدا ہے، جس کی تمام صفات ازلی ابدی ہیں۔ اس کی کوئی صفت بھی معطل نہیں اور نہ کبھی ہوگی۔ وہ وہی وحدہٗ لاشریک ہے، جس کا کوئی بیٹا نہیں اور جس کی کوئی بیوی نہیں۔ اور وہ وہی بے مثل ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔ اور جس کی طرح کوئی فرد کسی خاص صفت سے مخصوص نہیں۔ اور جس کا کوئی ہمتا نہیں، جس کا کوئی ہمصفات نہیں۔ اور جس کی کوئی طاقت کم نہیں۔ وہ قریب ہے، باوجود دور ہونے کے اور دور ہے، باوجود نزدیک ہونے کے۔ وہ تمثل کے طور پر اہل کشف پر اپنے تئیں ظاہر کر سکتا ہے، مگر اس کے لئے نہ کوئی جسم ہے اور نہ کوئی شکل ہے۔ اور وہ سب سے اوپر ہے۔ مگر نہیں کہہ سکتے کہ

اس کے نیچے کوئی اور بھی ہے۔اور وہ عرش پر ہے،مگر نہیں کہہ سکتے کہ زمین پر نہیں۔وہ مجمع ہے صفات کاملہ کا۔اور مظہر ہے تمام محامد حقہ کا۔اور سرچشمہ ہے تمام خوبیوں کا۔اور جامع ہے تمام طاقتوں کا۔اور مبداء ہے تمام فیضوں کا۔اور مرجع ہے ہر ایک شے کا۔اور مالک ہے ہر ایک ملک کا۔اور متصف ہے ہر ایک کمال سے۔اور منزہ ہے ہر ایک عیب اور ضعف سے۔اور مخصوص ہے اس امر میں کہ زمین والے اور آسمان والے اسی کی عبادت کریں۔اور اس کے آگے کوئی بات بھی اَن ہونی نہیں ہوتی۔اور تمام روح اور ان کی طاقتیں اور تمام ذرات اور ان کی طاقتیں اسی کی پیدائش ہیں۔اس کے بغیر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ وہ اپنی قدرتوں اور اپنی طاقتوں اور اپنے نشانوں سے اپنے تئیں ظاہر کرتا ہے۔اور اس کو اسی کے ذریعہ سے ہم پا سکتے ہیں۔

اِلٰھِیْ کَیْفَ یَعْلَمُکُمْ سِوَاکُمْ — وَ مِثْلُکَ مَنْ تَبَارَکَ اَوْ تَعَالیٰ
اِلٰھِیْ کَیْفَ یَعْلَمُکُمْ سِوَاکُمْ — وَ ھَلْ غَیْرٌ یَکُوْنُ لِکُمْ مَثَالَا
وَ مَنْ طَلَبَ الطَّرِیْقَ بِلَا دَلِیْلٍ — اِلٰھِیْ لَقَدْ طَلَبَ الْمَحَالاَ
اِلٰھِیْ کَیْفَ تَبْصُرُ کُمْ عُیُوْنٌ — وَ لَسْتَ النَّیِّرَاتِ وَ لَا الظَّلَالَا

ترجمہ۔اے خدا تجھ کو تیری امداد کے بغیر کس طرح کوئی پہچان سکتا ہے۔اے خدا تیری طرح کون بڑی برکتوں والا اور عالی ذات ہوسکتا ہے۔اے خدا تیری امداد کے بغیر کون تجھ کو پہچان سکتا ہے۔کیا کوئی ایسا ہوسکتا،جس کی مثال تجھ سے ہو سکے۔ہرگز نہیں۔جو کوئی تیری درگاہ کا راستہ تیری ہدایت کے بغیر ڈھونڈتا ہے،پس وہ راہ محال کو ڈھونڈتا ہے۔اے خدا تجھ کو آنکھیں کس طرح دیکھ سکیں۔حالانکہ تیری ذات کو نورانی اشیاء اور سیاہ چیزوں سے مشابہت نہیں۔(ابن عربی)

سنو۔خدا تعالیٰ راستبازوں پر ہمیشہ اپنا وجود ظاہر کرتا رہتا ہے۔اور اپنی قدرتیں انکو دکھلاتا ہے۔ اسی سے وہ شناخت کیا جاتا ہے۔اور اسی سے اسکی پسندیدہ راہ شناخت کی جاتی ہے۔وہ دیکھتا ہے بغیر جسمانی آنکھوں کے اور سنتا ہے بغیر جسمانی کانوں کے۔اور بولتا ہے بغیر جسمانی زبان کے۔اسی طرح نیستی سے ہست کرنا اسی کا کام ہے،جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ خواب کے نظارہ میں بغیر کسی مادہ کے ایک عالم پیدا کر دیتا ہے۔اور ہر ایک فانی اور معدوم کو موجود دکھلا دیتا ہے۔پس اسی طرح اس کی قدرتیں ہیں۔

(۱۸) جب ہم کسی مکان کو دیکھتے ہیں،تو یہ بات بلا تامل سمجھ لیتے ہیں کہ اس کا کوئی بنانے والا ہوگا۔چھوٹے سے لے کر بڑے تک اس جہان میں ایسا کوئی مکان نہیں کہ اس کا کوئی بنانیوالا نہ ہو۔اور کوئی سراغ نہیں کہ اس کے لئے کوئی جاننے والا نہ ہو۔اتنا بڑا مکان کہ جس کو عالم کہتے ہیں،اس کا بنانے والا کوئی نہ ہو،نہیں ہوسکتا۔ہاں اگر اس کے احوال میں تفاوت نہ ہوتا اور حاجتمندی کے آثار اس میں نظر نہ پڑتے،تو یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ جیسے خدا کا کوئی بنانے والا نہیں،اپنے آپ موجود ہے،ایسا ہی خالق

عالم کوئی نہیں، خود موجود ہے۔ لیکن یہاں جس طرف نظر ڈالئے ذلت وخواری ٹپکتی ہے۔ آسمان چاند سورج ستاروں کو دیکھئے کہ ایک حال پر قرار نہیں۔ کبھی عروج کبھی نزول کبھی طلوع کبھی غروب کبھی نور کبھی گہن۔ آگ کو دیکھئے تو بیقرار ہے تھامے نہیں تھمتی۔ ہوا کا یہ حال ہے کہ کبھی حرکت کبھی سکون اور حرکت بھی ہے، تو کبھی شمال کبھی جنوب کبھی پورب کبھی پچھّم کو ماری ماری پھرتی ہے۔ اور پانی کا کرہ ہوا کے جوکھوں سے کہیں کا کہیں نکلا جاتا ہے۔ اور زمین کو بھی پستی کے سوائے لاچاری اس درجہ کی کہ اس پر کوئی ہگتا ہے، کوئی موتتا ہے، کوئی کھودتا ہے۔ کوئی بھرتا ہے۔ نباتات کا بھی چھوٹا ہونا، کبھی بڑھنا، کبھی تر ہونا، کبھی خشک ہوجانا اور اس پر باوجود آب وخاک کے ایک ہونے کے اس قدر طرح طرح کے پھول پھل لگتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ علیٰ ھٰذا القیاس۔ حیوانات علی الخصوص افراد بشر باوجود کہ سب کے سب اربعہ اناصر ہی کے مرکب ہیں، شکل وشمائل، خوبو، خاصیت مزاج میں اتنے مختلف ہیں کہ کہا نہیں جاتا۔ علاوہ اس کے بھوک، پیاس، گوہ، مُوت، صحت، مرض، گرمی، سردی، حرص وہوا، بہت سے موکل ان کے پیچھے ایسے لگا دیئے ہیں کہ جس سے شرف حیات کو بھی بٹا لگا۔ حضرت انسان کے پیچھے تو اتنا کچھ لشکر کا لشکر حرص وہوا اور حاجات کا متعین کیا کہ جس نے اس کی فہم ودانش کو لاچار کر کے تمام شرف وعزت کو خاک میں ملا دیا۔ دوسرے جاندار تو فقط کھانے اور پینے ہی کے محتاج ہیں۔ کپڑا، مکان، گھوڑا، عزت منصب، جاگیر، مٹھے کھٹے، نمکین کی کچھ پرواہ نہیں رکھتے۔ اور انسان کی بغیر ان کے گزر نہیں ہوسکتی۔ جب انسان جو بالاتفاق اہل عقل اشرف المخلوقات ہے، اس قدر ذلیل اور محکوم ٹھہرا کہ چار طرف سے پیادگان سرکاری اسکی گردن پکڑے ہوتے ہیں۔ اور باقی عالم کا آسمان سے لیکر زمین تک مجمل حال معلوم ہو ہی چکا۔ تو پھر کیونکر عقل گوارا کرے کہ یہ سب کارخانہ بے سرا ہے۔ جو کوئی ایسی بات کہے، اسکو بیوقوف نہ کہئے، تو کیا کہئے۔ بلکہ غور کیجئے تو یوں نظر آتا ہے کہ جس میں کوئی خوبی زیادہ تر ہے، اسکو اوروں سے زیادہ قید قیود میں رکھا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بادشاہ اگر غریبوں کو قید کرتے ہیں، تو کئی کئی قیدیوں کے لئے ایک سپاہی محافظ کافی ہوتا ہے۔ اور اگر بادشاہ یا امیر ان کی قید میں آجاتا ہے، تو گو اسے تعظیم سے رکھیں، مگر اس پر بہت بہت پہرے اور بڑے بڑے بہادر حفاظت کے لئے مقرر کرتے ہیں۔ سو ہم جو دیکھتے ہیں۔ آسمان میں چاند سورج سے زیادہ اشرف کوئی نظر نہیں آتا۔ اور زمین میں انسان سے بہتر کوئی معلوم نہیں ہوتا۔ اور حقیقت میں دیکھئے تو انسان سب سے افضل ہے۔ چاند سورج میں اگر نور شعاع ہے، تو انسان میں نور عقل ہے۔ نور شعاع سے اگر زمین وآسمان روشن ہوتے ہیں، تو نور عقل سے کون ومکان، زمین وزمان منور ہوتے ہیں۔ بہر حال جب ایسے ایسے اشرف اجزاء عالم اس

ذلت وخواری میں گرفتار ہیں، جس کا کچھ حال اوپر مذکور ہوا۔ اور ایسے ناچار ہیں کہ ان قیدوں میں مقید ہیں، تو بلاشبہ دل میں آتا ہے کہ ان کے سر پر کوئی ایسا حاکم ہے کہ ان سے ہر دم مثل قیدیوں کے یہ سب بیگاریں لیتا ہے اور چین سے نہیں رہنے دیتا تاکہ یہ مغرور نہ ہوجائیں اور اوروں کو ان پر بے نیازی کا گمان نہ ہو۔ بلکہ ان کو خوار و ذلیل دیکھ کر یہ بھی اور دوسرے بھی خدا کو پہچانیں۔

ایں جہاں آئینہ دارِ روے او	ذرہ ذرہ رہ نماید سوے او
کرد در آئینۂ ارض و سماء	آں رخ بے مثل خود جلوہ نما
ہر گیاہے عارفے بنگاہِ او	دست ہر شاخے نماید راہ او
نور مہرو ماہ ز فیضِ نورِ اوست	ہر ظہور تابع منشور اوست
ہر سرے سرے ز خلوت گاہِ او	ہر قدم جوید درے باجاہِ او
مطلب ہر دل جمال روئے اوست	گمرہے گرہست بہر کوئے اوست
مہر و ماہ و انجم و خاک آفرید	صد ہزاراں کرد صنعتہا پدید
ایں ہمہ صنعش کتاب کار اوست	بے نہایت اندریں اسرار اوست

(۱۹) سب سے پہلے انسان پر خدا تعالیٰ کی صفت قہاری واضح ہوتی ہے، کیونکہ یہ امر نہایت بدیہی اور محسوس ہے کہ ایک طاقت عظمیٰ نے ہر ایک چیز کو اپنا مقہور اور مغلوب بنا رکھا ہے۔ جو لوگ خدا تعالیٰ کی تمام صفات سے منکر ہوجاتے ہیں، وہ بھی اس امر بدیہی سے انکار نہیں کر سکتے کہ ایک ذات باری کے سوا آزادی مطلق کسی چیز کو حاصل نہیں۔ اشرف المخلوقات انسان ہے، جو خود اپنے آپ کو باعتبار علم اور عقل تمام مخلوقات پر ترجیح دیتا ہے۔ مگر وہ بھی اپنے نفس کو مجبور ہی پاتا ہے۔ ایک انگلی بھر اپنا قد بڑھا نہیں سکتا۔ ایک دن اپنی عمر کا زیادہ نہیں کرسکتا۔ پس ہر ایک چیز کا مقہور اور مغلوب ہونا ایک قاہر کی ذات پر اول دلیل ہے۔ اور جس طرح بچے کو بوقت شروع سن تمیز کے پہلے پہل بدیہات پر اطلاع ہوتی ہے۔ اسی طرح جو شخص بیضہ بشریت کے غفلت خانہ سے پہلے پہل متنبہ ہو کر کچھ دیکھتا ہے، وہ یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی صفت قہاریت کو تمام زیر و بالا پر محیط پاتا ہے۔ وہ کسی چیز کو اس کے پنجۂ تصرف سے باہر نہیں دیکھتا۔ پس اس عظمت کے مشاہدہ سے اول قدم جو وہ خدا کی طرف رکھتا ہے، وہ توبہ اور سرکشی سے پرہیز کرنا ہے۔ خدا کی صفت قہاری واضح بدیہات میں سے بدیں وجہ ہے کہ دنیا میں کسی مخلوق کو ایسی آزادی حاصل نہیں کہ جس میں اس کو ساری مرادیں حاصل ہوں۔ خواہ ایک شخص خدا سے منکر ہی کیوں نہ ہو، وہ بھی اپنے آپ کو آزاد اور خود مختار نہیں کہہ سکتا۔ اس کو بھی جب موت اور اس عالم فانی سے گزر جانا یاد آتا

ہے،تو وہ بھی اپنے آپ کونہایت ہی لاچاراور مجبور پاتا ہے۔ پس وہ اگر چہ اپنی نادانی سے ایک ذات قاہر کا منکر ہے۔مگر وہ مقہور ہونے سے منکر نہیں ہوسکتا۔ پس یہی مقہور ہونا اس کی کمر کوتوڑتا ہے۔ ہر روز ہزار ہالوگوں کومرتے دیکھ کراور ہزارطرح کی لاچاریاں مشاہدہ کر کے بدیہی طور پرسمجھ جاتا ہے کہ میں آزادنہیں بلکہ مقہوراور مجبور ہوں۔ پس اس سے ثابت ہے کہ پہلی صفت قاہریت باری تعالیٰ کی انسان پر مشہود ہوتی ہے۔اور وہی طبعاً تمام صفات پرمقدم ہے۔ پھر جب دوسری بارانسان نظر دقیق سے ملاحظہء عالم کرتا ہے،تو تمام عالم کوخداوندتعالیٰ کے الاءاورنعماء سے پُر پاتا ہے۔اوراس کی رحمت کو ہرایک چیز پر محیط دیکھتا ہے۔تو پھر اس ملاحظہ ثانی سے اس میں امید اور توکل پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے اول ملاحظہ قاہریت سے خوف پیدا ہو گیا تھا۔ پھر تیسری بار جب نظر ادق سے عالم کودیکھتا ہے،تو خود خدا تعالیٰ کوایک حقیقی نعمت پاتا ہے۔اورلذت اعلیٰ اس کے وصال کومشاہدہ کرتا ہے۔ یہ انسان کی آخری نظر ہے کہ جس سے بڑھ کر کوئی نظر نہیں۔ یعنی وہ پہلا خیال، جوانسان کوخدا کی طرف کھینچتا ہے، وہ یہی ہے۔ یہی پہلا خیال ہے جو ہر یک شخص خدا کی طرف رجوع کرنے کے وقت دل میں قائم کرتا ہے۔

چند دہریوں کے ساتھ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مناظرہ

اورامام صاحب کے آگےان کالا جواب ہونا

دارالسلطنت بغداد میں کچھ ایسے آدمی جمع ہو گئے، جو دہریہ تھے۔ان میں سے چند آدمی ایک دفعہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے پاس آئے۔ جب امام صاحب نے ان کواپنے مکان میں جمع ہوتے دیکھا، تو ایک نہایت متفکر چہرہ بنالیا۔انہوں نے کہا۔حضرت آپ کس خیال میں ہیں،ہم تو ایک مسئلہ آپ سے دریافت کرنے کو آئے ہیں۔آپ نے فرمایا۔ میں تو اس حیرت میں ہوں کہ یہاں بغداد میں لاکھوں آدمی رہتے ہیں، ہرایک کی ضرورت مختلف ہے۔کوئی چین سے کوئی حبش سے کوئی کسی اور بحری مقام سے وابستہ ہے۔ ہرایک ضرورت کے لئے جہاز پر جہاز چلے آتے ہیں اور سنتا ہوں کہ نہ ان پر کوئی ملاح ہے نہ ان کا کوئی مالک ہے، نہ ان کو کوئی چلانے والا ہے۔اس پر اس دہریہ جماعت کا بڑا آدمی بولا کہ معلوم ہوتا ہے آپ کے دماغ کو کچھ صدمہ ہو گیا ہے۔ یہ کام بغیر کسی مدبر بالا رادہ کے نہیں چل سکتا اور نہ چل رہا ہے۔حضرت امام نے فرمایا۔ بغداد کی کاروائی تو بغیر کسی مدبر بالا رادہ کے نہ چلے،مگر آسمان وزمین کا کارخانہ خود بخود چلتا رہے۔اس پر وہ بہت نادم ہوئے اور لاجواب ہو کر چلے گئے۔(نور)

ممانعت شرک اوراس کی مذمت کی وجہ

وہ گناہ جو انسانی کمال اور ترقی کا راستہ بالکل مسدود کر دیں، ان میں سے ایک وہ ہے، جس کا تعلق مبداء کی ذات سے ہے۔ آدمی کو اپنے پروردگار سے ہی لاعلمی ہو یا اس کا علم وہ رکھتا ہو، لیکن مخلوق کے اوصاف اس میں ثابت کرتا ہو یا خدا کی صفات مخلوق میں ثابت کرتا ہو۔ دوسری صورت تشبہ کی ہے۔ اور تیسری شرک کی۔ نفس میں کبھی تقدیس و پاکی وصفائی پیدا نہیں ہوسکتی، جب تک علوی تجرد اور تدبیر عام کا، جو تمام عالم کو محیط ہو رہی ہے، بصیرت کی آنکھ سے مطالعہ نہ کرتا رہے۔ جب اس قسم کا غور نہیں کرتا، تو نفس اپنی ہی حالت میں مشغول رہا کرتا ہے۔ اور کبھی اس سے بیگانگی کا پردہ دور نہیں ہوتا اور بقدر سرسوزن بھی اس میں انکشاف پیدا نہیں ہوتا۔ یہ نہایت سخت بلا ہے۔ دوسری قسم بڑے گناہ کی یہ ہے کہ آدمی اس امر کا اعتقاد کرے کہ بجز اس زندگی کے اور کوئی زندگی نہیں ہے۔ اور بدن کے لئے اور کوئی دوسرا کمال نہیں ہے، جس کا طلب کرنا ضروری ہو۔

شریک باری تعالیٰ ممتنع و ناممکن ہونیکی وجہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۔ یعنی اگر ایک معبود برحق کے سوا زمین و آسمان میں کئی خدا ہوتے، تو زمین و آسمان ٹوٹ پھوٹ جاتے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اگر دو یا کئی صانع ہوں گے، تو لازم آئیگا کہ یہ عالم نیست و نابود ہو جائے۔ کیونکہ یہ تو ہم یقیناً مانتے ہیں کہ جو خدا ہوگا، اس میں کسی طرح کا نقص نہ ہوگا۔ اگر نقص ہوگا، تو ہم میں اور اس میں کیا فرق باقی رہا۔ ہم بھی تو بندے اسی سبب سے ہیں کہ ہم میں طرح طرح کے نقص ہیں اور جس میں نقص ہوتا ہے، وہ آپ سے موجود نہیں ہوسکتا۔ ورنہ ہم کو اگر وجود کا اختیار ہوتا، تو اپنے لئے ساری خوبیاں جمع کر لیتے۔ جس کو کسی چیز کا اختیار ہوتا ہے، تو وہ اپنے لئے کب کمی رہنے دیتا ہے۔ جب یہ بات قرار پائی، تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آدھی مخلوقات ایک کی ہو اور آدھی دوسرے کی۔ اگر ایسا ہو تو خدا میں آدھوں آدھ کی خدائی کی کمی اور کسر ہوگی۔ بلکہ ہر خدا ساری ساری خدائی کا مالک ہوگا۔ اس صورت میں جیسا وہ کامل ہوگا، دوسرے پر بھی اس کی تاثیر کامل ہی پڑے گی۔ اس واسطے کہ موجودات اور خالق کی ایسی مثال ہے، جیسے آفتاب یا چاند وغیرہ اور زمین و آسمان وغیرہ کی۔ آفتاب سے آفتاب کی طرح کا اور چاند سے چاند کی طرح کا نور پھیلتا ہے۔ اور ہر ایک کو حسب قابلیت منور کر دیتا ہے۔ اور چیزیں تو فقط نظر ہی آنے لگتی ہیں۔ ہر آئینہ کا اتنے ہی نور سے کچھ اور حال ہو جاتا ہے، خود بھی منور ہوتا ہے اور اوروں کو بھی منور کر دیتا ہے۔ الغرض جتنا چاند اور سورج میں فرق ہے، اتنا ہی ان کی شعاعوں میں اور اور چیزوں کے منور ہونے میں فرق ہے۔ پس جب خدا کا وجود بڑا ہی کامل ہوگا، تو تھوڑا بہت کامل ہی کامل مخلوقات میں سرایت کرے گا۔ اب اگر ایسے

ایسے دو یا کئی خدا ہوں گے اور مخلوقات مشترک ہوگی، تو ہر طرف سے کامل ہی کامل وجود پر مخلوق کے اندازہ اور حوصلہ کے موافق آئے گا۔ گز میں گز بھر اور بالشت میں بالشت بھر۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سانچہ میں دو چیزیں اور ایک سیر بھر کے برتن میں دو سیر اناج اور ایک جوتی میں ایک جیسے دو قدم اور ایک انگر کھے میں اس کے موافق دو بدن اور ایک نیام میں اسی مقدار کی دو تلواریں اور ایک مکان میں اسی گنجائش کے موافق دو چند اسباب نہیں سماتا۔ اور دھینگا دھینگی سے ایک میں دو کو تونی لگتے ہیں، تو وہ سانچے اور برتن وغیرہ ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جاتے ہیں۔ سو اگر دونوں خداؤں کی طرف سے پورا پورا وجود ایک مخلوق میں پورا پورا سمانے لگے، تو بیشک وہ خلوق معدوم ہونے لگے۔ ہاں اگر خدا تعالیٰ کے وجود کا کمال ثابت نہ ہوتا، بلکہ احتمال نقص ہوتا، تو یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ جیسے دو چراغوں کا نور مل کر کامل نور ہو جاتا ہے۔ دو خداؤں کے وجود کا پرتو مل کر کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ مگر چونکہ اس کا کمال ثابت ہو چکا ہے، تو اب بجز معدوم ہو جانے کے، جیسا کہ مرقوم ہو چکا ہے، اور کچھ نتیجہ دو خداؤں کے پرتو کے ملنے سے حاصل نہ ہوتا۔ ان دو وجودوں سے تو ایک ہی بھلا۔ اس سے قطع نظر ہم پوچھتے ہیں کہ وہ دو وجود، جو دو خداؤں کی طرف سے مخلوق کو ملتے، اگر ایک ہی خدا کے خزانے میں ہوتے، تو بیشک دونوں مل کر ایک سے بڑھ جاتے۔ پس اس صورت میں پھر خدا میں آدھوں آدھ کا نقصان نکلا۔ سو ہمارا ایسے خداؤں کو جن میں نقص اور کمی پائی جاتی ہے سلام ہے۔ ہم اس کو خدا جانتے ہیں، جو بے عیب اور بے نقص ہے۔ اور اس سے وجود کون و مکان ہے۔ سب چیزیں اسی کے سہارے اور بھروسے پر قائم ہیں۔ وہ کسی کے سہارے کا محتاج نہیں۔ وہ سب کی اصل ہے۔ اور سب اسکی فرع ہیں۔ اور کیوں نہ ہو، جس کارخانہ کو دیکھئے ایک اصل پر قرار ہے۔ نور آفتاب کو دیکھئے، تو ہزاروں مکانوں اور ہزاروں روشندانوں میں جدا جدا جلوہ دکھلا رہا ہے۔ پھر سب کو افتاب کے ساتھ رابطہ ہے، جو اس سے ٹوٹ کر بگاڑے، تو ایک کا بھی پتہ نہ رہے۔ عدد کے سلسلے پر نظر کیجئے، تو ایک الی غیر النہایت پھیلا ہوا ہے۔ کہیں دو ہیں، کہیں تین، کہیں چار، کہیں پانچ، کہیں دس، کہیں بیس، کہیں سو، کہیں ہزار علی ہذا القیاس۔ اور اسپر کہیں جذر، کہیں مُجذور، کہیں حاصل ضرب، کہیں مضروب، کہیں مصروب فیہ، کہیں حاصل قسمت، کہیں مقسوم، کہیں مقسوم علیہ وغیرہ۔ سب کی اصل وہی ایک ہے۔ اگر ایک نہ ہو، تو سب سلسلہ اعداد نیست و نابود ہو جائے۔ موجوں اور بلبلوں کے کارخانہ کو دیکھئے، تو سب ایک اصل میں، جسے انسانیت وغیرہ کہئے، شریک ہیں۔ اسی طرح جس طرف نظر پڑتی ہے، کوئی ایسا کارخانہ نظر نہیں آتا کہ جس کا سر منشا نہ ہو۔ پھر ان سر منشاؤں کو دیکھئے، تو ان کا کوئی اور سر منشا ہے۔ اور اسی طرح اوپر تک چلے چلو۔

مسئلہ توحید وجودی وشہودی پر محققانہ ریمارک

اس عاجز نے ہر چند ایک مدت دراز تک غور کیا اور کتاب اللہ اور احادیث نبویہ کو بتدبر و تفکر تام دیکھا۔ اور محی الدین ابن عربی وغیرہ کی تالیفات پر بھی نظر ڈالی کہ جو اس طور کے خیالات سے بھری پڑی ہیں۔ اور خود عقل خداداد کی رو سے بہت سوچا اور فکر کیا، لیکن آج تک اس دعویٰ بے بنیاد پر کوئی دلیل اور حجت صحیح ہاتھ نہیں آئی۔ اور کسی نوع کی برہان اس کی صحت پر قائم نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے ابطال پر براہین قویہ اور حجج قطعیہ قائم ہوتی ہیں کہ جو کسی طرح اٹھ نہیں سکتیں۔ اول بڑی بھاری دلیل مسلمانوں کے لئے، بلکہ ہر ایک لئے کہ جو حق پر قدم مارنا چاہتا ہے، قرآن شریف ہے۔ کیونکہ قرآن شریف کی آیات محکمات میں بار بار تاکیدی طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جو کچھ مافی السموات والارض ہے، وہ سب مخلوق ہے۔ اور وہ خدا اور انسان میں ابدی امتیاز ہے کہ جو نہ اس عالم میں اور نہ دوسرے عالم میں مرتفع ہوگا۔ اس جگہ بھی بندگی بیچارگی ہے، بلکہ اس پاک کلام میں نہایت تصریح سے بیان فرمایا گیا ہے کہ انسان کی روح کے لئے عبودیت دائمی اور لازمی ہے۔ اور اسکی پیدائش کی عبودیت ہی علت غائی ہے، جیسا کہ فرمایا ہے۔ وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ۔ یعنی میں نے جن اور انس کو پرستش دائمی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور پھر انسان کامل کی روح کو اس آخری وقت پر مخاطب کر کے فرماتا ہے یَاۤاَیُّھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۔ یعنی اے نفس بحق آرام یافتہ اپنے رب کی طرف واپس چلا آ۔ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ سو میرے بندوں میں داخل ہو اور میرے بہشت کے اندر آ جا۔ ان دونوں آیات جامع برکات سے ظاہر ہو رہا ہے کہ انسان کی روح کے لئے بندگی اور عبودیت دائمی ولازمی ہے۔ اور اس عبودیت کی غرض سے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ بلکہ آیت مؤخر الذکر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ جو انسان اپنی سعادت کاملہ کو پہنچ جاتا ہے اور اپنے تمام کمالات فطرتی کو پا لیتا ہے اور اپنی جمیع استعدات کو انتہائی درجہ تک پہنچا دیتا ہے، اس کو آخری حالت پر عبودیت کا خطاب ملتا ہے۔ اور فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ کے خطاب سے پکارا جاتا ہے۔ سو اب دیکھئے اس آیت سے کس قدر بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ انسان کا کمال مطلوب عبودیت ہے۔ اور سالک کا انتہائی مرتبہ عبودیت تک ہی ختم ہوتا ہے۔ اگر عبودیت انسان کے لئے ایک عارضی جامہ ہوتا اور اصل حقیقت اس کی الوہیت ہوتی، تو چاہئے تھا کہ بعد طے کرنے تمام مراتب سلوک کے الوہیت کے نام سے پکارا جاتا۔ لیکن فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ کے لفظ سے ظاہر ہے کہ عبودیت اُس جہاں میں بھی دائمی ہے، جو ابد الآباد رہے گی۔ اور آیت با آواز بلند پکار رہی ہے کہ انسان گو کیسے ہی کمالات حاصل

کرے،مگر وہ کسی حالت میں عبودیت سے باہر ہو ہی نہیں سکتا۔اور ظاہر ہے کہ جس کیفیت سے کوئی شے کسی حالت میں باہر نہ ہو سکے، وہ کیفیت اس کی حقیقت اور ماہیت ہوتی ہے۔پس چونکہ از روئے بیان واضح قرآن شریف کے انسان کے نفس کے لئے عبودیت ایسی لازمی چیز ہے کہ نہ نبی بن کر نہ رسول بن کراور نہ صدیق بن کراور نہ شہید بن کراور نہ اِس جہان میں اور نہ اُس جہان میں الگ ہو سکے۔ جومہتر اور بہتر انبیاء تھے،انہوں نے عَبۡدَہٗ وَ رَسُوۡلَہٗ ہونا اپنا فخر سمجھا۔تو اس سے ثابت ہے کہ انسان کی اصل ماہیت وحقیقت عبودیت ہی ہے،الوہیت نہیں۔اور اگر کوئی الوہیت کا مدعی ہے،تو بمقابلہ اس محکم اور بین آیت کے جو فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبَادِیۡ ہے،کوئی دوسری آیت ایسی پیش کرے،جس کا مفہوم فَادۡخُلِیۡ فِیۡ ذَاتِیۡ ہو۔اور خود قرآن شریف جابجا اپنے نزول کی علت غائی یہی ٹھہراتا ہے کہ تا عبودیت پر لوگوں کو قائم کرے۔اور خدا نے اپنی کتاب عزیز میں ان لوگوں پر لعنت بھیجی ہے،جنہوں نے مسیح اور بعض دوسرے نبیوں کو خدا سمجھا تھا۔پس کیونکر وہ لوگ رحمت کے مستحق ہو سکتے ہیں۔جنہوں نے تمام جہان کو یہاں تک کہ ناپاک اور نجاست خوار جانوروں کو بھی بلکہ پلید روحوں کو بھی کہ جو شرارت اور فسق وفجور سے بھرے ہوئے ہیں،خدا سمجھ لیا ہے۔ہاں یہ بات سچ ہے کہ قرآن شریف کی تعلیم کی رو سے توحید تین مرتبہ پر منقسم ہے۔ایک ادنیٰ اور ایک اوسط اور ایک اعلیٰ۔تفصیل اس کی یہ ہے کہ ادنیٰ مرتبہ توحید کا کہ جس کے بغیر ایمان متحقق ہو ہی نہیں سکتا،نفی شرک ہے۔یعنی اس شرک سے بیزار ہونا کہ جو مشرکین بعض ظلم اور زیادتی کی راہ سے مخلوق چیزوں کو خدا کے کاموں میں شریک سمجھتے ہیں،جیسے کسی قوم نے سورج اور چاند یا آگ اور پانی کو دیوتے قرار دے لیا ہے۔اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں۔اور کسی قوم نے بعض انسانوں کو خدائی کا مرتبہ دے رکھا ہے اور خداوند کریم کی طرح اس کو قادر مطلق اور قاضی الحاجات خیال کر رکھا ہے۔سو یہ شرک صریح اور بدیہی ظلم ہے کہ جو ہر ایک عاقل کو بہ بداہت نظر آتا ہے۔ لیکن دوسری قسم شرک کی، جو قرآن شریف نے بیان کی ہے،جس کے چھوڑنے پر توحید کی دوسری قسم موقوف ہے، وہ اس کی نسبت کچھ باریک ہے کہ عوام کاالانعام اس کو سمجھ نہیں سکتے۔یعنی اسباب کو کارخانہءقدرت احدیت الٰہی میں شریک سمجھنا اور فاعل اور مؤثر حقیقی خدا ہی کو نہ جاننا مثلاً ایک دوکاندار مسلمان جب عین ہجوم خریداروں کے وقت میں بانگ نماز جمعہ سنتا ہے،تو دل میں خیال کرتا ہے کہ اس وقت جمعہ کی نماز کے لئے اپنی دوکان بند کر کے گیا،تو میرا بڑا ہی حرج ہوگا۔جمعہ کی نماز میں خطبہ سننے اور نماز پڑھنے اور پھر شاید وعظ سننے میں ضرور دیر لگے گی۔اور اس عرصہ میں سب خریدار چلے جائیں گے۔ اور جو آمدنی اب یہاں ٹھہرے رہنے سے متصور ہے،اس سے محروم رہونگا۔سو یہ شرک فی الاسباب ہے۔

کیونکہ اگر دوکاندار جانتا ہے کہ میرا ایک رازق قادر و متصرف مطلق ہے، جس کے ہاتھ میں تمام قبض وبسط رزق ہے اور اس کی اطاعت میں کوئی نقصان عاید حال نہیں ہوسکتا۔ اور اس کے ارادہ کے برخلاف کوئی تدبیر وسیلہ رزق کو فراغ نہیں کرسکتی، تو وہ اس شرک میں ہرگز مبتلا نہ ہوتا۔ اور یہ قسم دوم شرک کی چونکہ باریک ہے، اس وجہ سے ایک عالم اس میں مبتلا ہو رہا ہے۔ اور اکثر لوگ اسباب پرستی پر اسقدر جھک رہے ہیں کہ گویا وہ اپنے اسباب کو اپنا رب سمجھ رہے ہیں۔ اور یہ شرک دق کی بیماری کی طرح ہے، جو اکثر نظروں سے مخفی اور محتجب رہتا ہے۔ اور تیسری قسم شرک کی کہ جو قرآن شریف میں بیان کی گئی ہے، جس کے چھوڑنے پر تیسری قسم توحید کی موقوف ہے، وہ نہایت ہی باریک ہے کہ بجز خاص بالغ نظروں کے کسی کو معلوم نہیں ہوتی۔ اور بغیر افراد کامل کے کوئی اس سے خلاصی نہیں پاتا۔ اور وہ یہ ہے کہ ماسوا اللہ کی یادداشت کا دل پر غالب رہنا اور ان کی محبت یا عداوت میں اپنے اوقات کو ضائع کرنا اور ان کی ناچیز ہستی کو کچھ چیز سمجھنا اور اس شرک کا چھوڑنا، جس پر کامل توحید موقوف ہے، تب متحقق ہوتا ہے کہ جب محبّ صادق پر اس قدر محبت اور عظمت الٰہی کا استیلا ہو جائے کہ اس کی نظر شہود میں ہر ایک موجود ماسوا اللہ باوجود ہونے کے معدوم دکھائی دے، یہاں تک کہ اپنا وجود بھی فراموش ہو جائے۔ اور محبوب حقیقی کا نور ایسا کامل طور پر چمکے کہ اس کے آگے کسی چیز کی ہستی اور حقیقت باقی نہ رہے۔ اور اس توحید کا کمال اس بات پر موقوف ہے کہ ماسوا اللہ واقعی طور پر موجود تو ہو، مگر سالک کی نظر میں کہ جو محبت اللہ سے کامل طور پر بھر گئی ہے، وہ وجود غیر کالعدم دکھائی دے۔ اور غلبہ محبت احدیت کی وجہ سے اس کے ماسوا کو منتفی اور معدوم خیال کرے۔ کیونکہ اگر وجود ماسوا کا فی الحقیقت منتفی اور معدوم ہی ہو، تو پھر اس توحید درجہ سوم کی تمام خوبی برباد ہو جائے گی۔ وجہ یہ کہ ساری خوبی اس توحید درجہ سوم میں یہ ہے کہ محبوب حقیقی کی محبت اور عظمت اس قدر دل پر استیلا کرے کہ بوجہ غلبہ اس شہود تام کے دوسری چیزیں معدوم دکھائی دیں۔ اب اگر دوسری چیزیں فی الحقیقت معدوم ہی ہیں، تو پھر اس استیلائے محبت اور غلبہء شہود عظمت کی تاثیر کیا ہوئی اور کونسا کمال اس توحید سے ثابت ہوا۔ کیونکہ جو چیز واقعہ میں معدوم ہے، اس کو معدوم ہی خیال کرنا یہ ایسا امر نہیں ہے کہ جو استیلائے محبت پر موقوف ہو۔ بلکہ محبت اور شہود عظمت تامہ کی کمالیت اسی حالت میں ثابت ہوگی کہ جب عاشق دلدادہ محض استیلاء عشق کی وجہ سے نہ کسی اور وجہ سے اپنے محبوب ماسوا کو معدوم سمجھے اور اپنے معشوق کے غیر کو کالعدم خیال کرے، گو عقل وشرح اس کو سمجھاتی ہوں کہ وہ چیزیں حقیقت میں معدوم نہیں ہیں۔ جیسے ظاہر ہے کہ جب دن چڑھتا ہے اور لوگوں کی آنکھوں پر نور آفتاب استیلاء کرتا ہے، تو باوجود اس کے کہ لوگ جانتے ہیں کہ ستارے اس وقت معدوم نہیں، مگر پھر بھی بوجہ

اسیتلائے نور کے ستاروں کو دیکھ نہیں سکتے۔ پس ایسا ہی استیلائے محبت اور عظمت اللہ کا محبّ صادق کی نظر میں ایسا ظاہر کرتا ہے کہ گویا تمام عالم بغیر اس کے محبوب کے معدوم ہے اور اگرچہ عشق حقیقی میں یہ تمام انوار کامل واتم طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔لیکن کبھی کبھی عشق مجازی کا مبتلا بھی اس غایت درجہ عشق پر پہنچ جاتا ہے کہ اپنے معشوق کے غیر کو یہاں تک کہ خود اپنے نفس کو کالعدم سمجھنے لگتا ہے۔ چنانچہ منقول ہے کہ مجنون، جس کا نام قیس ہے، اپنے عشق کی آخری حالت میں ایسا دیوانہ ہوگیا کہ یہ کہنے لگا کہ میں آپ ہی لیلیٰ ہوں۔سو یہ بات نہیں کہ درحقیقت وہ لیلیٰ ہی ہوگیا تھا۔مگر اسکا یہ باعث تھا کہ چونکہ وہ مدت تک تصور لیلیٰ میں غرق رہا تھا۔اسلئے آہستہ آہستہ اس میں خود فراموشی کا اثر ہونے لگا۔ ہوتے ہوتے اسکا استغراق بہت ہی کمال کو پہنچ گیا اور محویت کے اس حد تک جا پہنچا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جنونِ عشق سے انا لیلیٰ کا دعویٰ کرنے لگا۔اور یہ خیال دل میں بند گیا کہ فی الحقیقت میں ہی لیلیٰ ہوں۔غرض غیر کو معدوم سمجھنا لوازم عشق میں سے ہے۔اور اگر غیر فی الحقیقت ہی ہے، تو پھر وہ ایسا امر نہیں ہے کہ جس کو استیلائے محبت اور جنون عشق سے کچھ بھی تعلق نہیں۔اور غلبہ عشق کی حالت میں محویت کے آثار پیدا ہو جانا کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس کو انسان مشکل سے سمجھ سکے۔شیخ مصلح الدین شیرازی نے خوب کہا ہے۔

نہ از چینم حکایت کن نہ از روم   کہ دارم دلستانے اندریں بوم

چو روئے خوب او آید بیادم   فراموشم شود موجود و معدوم

اور خود وہ محویت کا ہی اثر تھا، جس سے زلیخا کی سہیلیوں نے اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔اب خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن شریف میں کمال توحید کا بھی درجہ بیان کیا گیا ہے کہ محبت صادق بوجہ استیلائے محبت اور شہود عظمت محبوب حقیقی کے غیر کے وجود کو کالعدم خیال کرے، نہ یہ کہ فی الواقع غیر معدوم ہی ہو۔کیونکہ معدوم کو معدوم خیال کرنا ترقیات عشق اور محبت سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔سو عاشق صادق کے لئے توحید ضروری اور لابدی ہے کہ جو اس کے کمال عشق کی علامت ہی یہی توحید ہے کہ جو اس کا شہود بجز ایک کے نہ ہو، نہ یہ کہ عقلی طور پر بھی فی الواقع ایک ہی موجود سمجھتا ہو۔کیونکہ وہ اپنی عقل میں ہو کر ایسی باتیں ہرگز منہ پر نہیں لاتا۔اور حق الیقین کے مرتبہ کے لحاظ سے جب دیکھتا ہے، تو حقائق اشیاء سے انکار نہیں کرسکتا۔ بلکہ جیسا کہ اشیاء فی الواقعہ موجود ہیں۔ایسا ہی ان کے موجودات کا اقرار رکھتا ہے۔اور چونکہ یہ توحید شہودی فنا کے لئے لازمی اور ضروری ہے، اس لئے خدا تعالیٰ نے اس کا ذکر اپنی پاک کلام میں بسط سے فرمایا ہے۔اور نادان جب ان بعض آیات کو دیکھتا ہے تو اس دھوکے میں پڑ جاتا ہے کہ گویا وہ آیات توحید وجودی کی طرف اشارہ ہے۔اور اس بات کو نہیں سمجھتا کہ خداوند تعالیٰ کی کلام میں تناقض

نہیں ہوسکتا۔جس حالت میں اس نے آیات بیّنات اور نصوص صریحہ میں اپنے وجود اور مخلوق کے وجود میں امتیاز کلی ظاہر کر دیا ہے۔اور مصنوعات کو بوجہ واقعی قرار دے کر اپنی صانعیت کے لئے اس سے ثابت کیا ہے۔اور اپنے غیر کو شقی اور سعید کی قسموں میں تقسیم کیا ہے۔اور بعض کے لئے خلود جنت اور بعض کے لئے خلود جہنم قرار دیا ہے۔اور اپنے تمام نبیوں اور مرسلوں اور صدیقوں کو بندہ کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ اور نصرت میں اس کی عبودیت دائمی غیر منقطع کا ذکر فرمایا ہے،تو پھر ایسے صاف صاف اور کھلے کھلے بیان کے مقابلہ پر کہ جو بالکل عقلی طریق سے بھی مطابق ہے،بعض آیات کے اور کسی طرح پر معنے بیان کرنا صرف ان لوگوں کا کام ہے،جو راہ راست کے طالب نہیں۔ بلکہ آرام پسند اور آزاد طبع ہو کر صرف الحاد اور زندقہ میں اپنی عمر بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر انسان صرف عقل کے رو سے بھی نظر کرے،تو وہ فی الفور معلوم کر لیگا کہ مشت خاک کو حضرت پاک سے کچھ بھی نسبت نہیں۔انسان دنیا میں آ کر بہت سی مکروہات اپنی مرضی کے برخلاف دیکھتا ہے اور بہت سے مطالب باوجود دعا اور تضرع کے بھی حاصل نہیں ہوتے۔ پس اگر انسان فی الحقیقت خدا ہی ہے،تو کیوں صرف کن فیکون کے اشارہ سے اپنے تمام مقاصد حاصل نہیں کر لیتا۔اور کیوں صفات الوہیت اس میں متحقق نہیں ہوتیں۔کیا کوئی حقیقت اپنے لوازم ذاتی کے سوا ہو سکتی ہے۔پس اگر انسان کی حقیقت الوہیت ہے،تو کیوں اشارہ الوہیت اس سے ظاہر نہیں ہوتے۔حضرت یعقوبؑ چالیس برس تک روتے رہے،مگر اپنے فرزند عزیز کا کچھ پتہ نہ ملا، مگر اسی وقت کہ جب خدا نے چاہا۔پس جب صفات الوہیت ان میں ظاہر نہ ہوئیں،تو اور کوئی ہے جس میں ظاہر ہوں گے۔اور جبکہ اب تک کوئی ایسا مرد پیدا نہ ہوا کہ جس نے میدان میں آ کر تمام مخالفوں اور موافقوں کے سامنے الوہیت کی طاقتیں دکھلائی ہوں۔تو پھر آئندہ وہ کیونکر امید رکھیں۔ ماسوا اس کے یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ انسان سے کیسے کیسے برے امر اور ناپاک کام صادر ہوتے ہیں۔ پس کیا عقل کسی عاقل کی تجویز کر سکتی ہے کہ یہ سب ناپاکیاں خدا کی روح کر سکتی ہے۔ پھر علاوہ اس کے مخلوق کے وجود سے انکار کرنا دوسرے لفظوں میں اس بات کا دعویٰ ہے کہ خدا تعالیٰ قادر مطلق نہیں، کیونکہ اگر ان کو قادر مطلق مان لیا جاوے،تو پھر اس کی قدرت تامہ اسی بات پر موقوف ہے کہ جو چاہے پیدا کرے،نہ یہ کہ ہندوؤں کے اُتاروں کی طرح ہر جگہ برے بھلے کام کے لئے آپ ہی جنم لیتا رہے۔سو خدا کی ذات سے سلب قدرت کرنا اور اس کو طرح طرح کے گناہوں اور پاپوں اور بے ایمانیوں کا مورد ٹھہرانا اور انواع و اقسام کی جہالتوں کو اس پر روا دکھنا،اس توحید وجودی کا نتیجہ ہے،جس کو وجودی لوگ نہیں سمجھتے۔عقلمند انسان کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ ایسے دعوے ہرگز نہیں کرتا،جس دعوے کا ثبوت اس کے پاس موجود نہیں

ہوتا۔ پس اگر یہ لوگ عاقل ہوتے، تو ایسا دعویٰ کرنے سے باز آتے۔ زیادہ تر خرابی ان میں یہ ہے کہ ان کے فعل اور عمل پر نفسانیت غالب ہو رہی ہے۔ ذرہ خیال نہیں کرتے کہ ہم کو نفس امارّہ نے کہاں تک پہنچا رکھا ہے۔ اور کس قسم کی ظلمت ہمارے دلوں پر طاری ہو رہی ہے۔ اور کیونکر ہم دن دات جیفہء دنیا میں غرق ہو رہے ہیں۔ اگر وہ لوگ ایسا خیال کرتے اور انسانی ترقیات کو حال کے ذریعہ دیکھتے نہ صرف قال کے ذریعہ سے، تو یہ تمام اوہام ان کے خود بخود اٹھ جاتے۔ مثلاً عاقل سیاح کے پاس یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب کوئی سیاح فلاں جزیرہ میں پہنچتا ہے، تو بجائے دو آنکھوں کے اس کی چار آنکھیں ہو جاتی ہیں اور منہ سے سنتا ہے اور کانوں کے ساتھ دیکھ سکتا ہے۔ تو ایسی خلاف قیاس خبر پر صرف اس حالت میں عقلمند یقین کریگا کہ جب بیان کنندہ اس خبر کا خود اس جزیرہ میں ہو کر آیا ہو اور یہ چار آنکھیں اور ایسا منہ اور ایسے کان اس نے دکھلا دیئے ہوں یا کوئی اور انسان پیش کر دیا ہو، جس میں یہ صفتیں موجود ہوں۔ اور اگر ایسا نہیں کیا، تو ہرگز وہ عاقل اس بات کو تسلیم نہیں کریگا۔ اور غایت کار اس احمق کو وہ جواب دیگا کہ بھائی میں بھی اس جزیرہ کی طرف چلا جاتا ہوں، سو اگر ایسا ہی خاصیت اس جزیرہ میں ہے، تو میری بھی وہاں چار آنکھیں ہو جائیں گی۔ اور میں بھی منہ سے سنوں گا اور کانوں سے دیکھوں گا۔ تب خود میں تیری اس بات کو قبول کرلوں گا۔ اب میں بلا ثبوت کیونکہ قبول کر سکتا ہوں۔ سو سمجھنا چاہئے کہ جو انسان اپنے نفس کو دھوکہ نہیں دیتا۔ اور اپنے خیال کو گمراہی میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ وہ یہ باتیں چھوڑ دیتا ہے اور کام کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور سرگرمی سے منزل مقصود کی طرف قدم رکھتا ہے۔ پھر اس راہ کے تمام عجائبات اس کو بلضرور دیکھنے پڑتے ہیں۔ اور بڑی آسانی سے حق الامر اس پر کھل جاتا ہے۔ مگر جو کوئی صرف باتوں میں مبتلا رہتا ہے اور محض سنے سنائے قصوں پر کہ جو عقل اور شرع کے بکلی منافی ہیں جم جاتا ہے اور اپنے نفس کو آپ ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ حقیقت میں ایسے لوگ خداوند تعالیٰ سے بالکل بے غرض ہیں اور وسیع مشربی کے پردہ میں اپنے نفس امارہ کی خواہشوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ان کی سرشت میں کچھ بوئے صدق ہے، تو پہلے انسان بن کر کھلائیں۔ پیچھے الوہیت کا دعویٰ کریں۔ کیونکہ انسان بننے کے ایسے لوازم ہیں، جن کی ابھی تک ان میں بُو نہیں آئی نہ اس کے حصول کی کچھ پرواہ رکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ امت محمدیہ کی آپ اصلاح کرے۔ عجب خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ (ماخوذ)

اس تمام تقریر سے واضح ہو جاتا ہے کہ توحید وجودی کے قائل سخت غلطی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ دراصل توحید شہودی درست ہے۔ اور سارے قرآن کریم میں توحید شہودی پر قائم رہنے کا ذکر ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت علاءالدولہ سمنانی، حضرت ابوالحسن خرقانی، شیخ احمد مجدد الف ثانی رحمہم

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں میں توحید شہودی کی صحت اور توحید وجودی کے غلط ہونے کا ذکر بڑے شدّ ومدّ سے کیا ہے۔

حقیقت تقدیر ازلی الٰہی

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ الْخَلْقَ فِیْ ظُلْمَۃٍ فَاَلْقٰی عَلَیْھِمْ مِنْ نُوْرِہٖ فَمَنْ اَصَابَہٗ مِنْ ذٰلِکَ النُّوْرِ اِھْتَدٰی وَ مَنْ اَخْطَاہُ ضَلَّ فَلِذٰلِکَ اَقُوْلُ جَفَّ الْقَلَمُ عَلٰی عِلْمِ اللّٰہِ ۔ترجمہ۔یعنی خدا تعالیٰ نے خلقت کو اول ایک تاریکی کی حالت میں پیدا کیا اور پھر اپنا نور ان (کی اولاد) پر ڈالا۔ان میں سے جس کسی کو وہ نور پہنچ گیا، اس کو تو ہدایت ہوگئی او جس پر اس نور کا پرتو نہیں پڑا، وہ گمراہ رہا۔اس وجہ سے میں کہتا ہوں کہ قلم خشک ہو چکا۔اس سے مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے پیدا کرنے سے پہلے ان کا اندازہ کیا، تو وہ سب کے سب فی حد ذاتہم کمال سے بالکل عاری تھے۔اس واسطے مناسب ہوا کہ ان کی طرف رسول بھیجے جائیں اور ان پر کتابیں نازل کی جائیں۔بعضوں کو تو اس سے راہبری ہوگئی اور بعض گمراہ ہی رہے۔خدا تعالیٰ نے ایک ہی دفعہ یہ سب اندازہ کرلیا۔مگر جو ان کی ذاتی حالت ہے، اس کو اس حالت پر، جو بعثت رسل کے بعد پیدا ہوئی ہے، تقدم ہے۔

یہ جو حدیث شریف میں وارد ہے۔ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا ھُوَ کَائِنٌ ۔یعنی جو کچھ ہونا ہے، وہ پہلے ہی دن لوح تقدیر میں لکھا جا چکا ہے، یہ بالکل سچ ہے۔لیکن اس کے معنے وہ نہیں ہیں، جو عوام سمجھتے ہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ طے ہو چکا کہ ہر کام کا خاص نتیجہ ہے۔یہ طے ہو چکا کہ ہر چیز کا سبب ہے۔یہ طے ہو چکا کہ نیکی و بدی یکساں نہیں۔یہ طے ہو چکا کہ نیکی کا نتیجہ نیک ہوگا اور بدی کا بد۔چنانچہ اس بارے میں حضرت مولانا روم لکھتے ہیں۔

ہمچنیں تاویل قد جف القلم	بہر تحریص است بر شغل آہم
پس قلم بنوشت کہ ہر کار را	لائق آن است تاثیر و جزا
کجروی جف القلم کج آیدت	راستی آری سعادت زائدت
چوں بدزدی دست شد جف القلم	خورد بادہ مست شد جف القلم
ظلم آری مُد بری جف القلم	عدل آری بر خوری جف القلم
بلکہ آن معنے بود جف القلم	نیست یکساں تر د او عدل و ستم
فرق بنہادم میاں خیر و شر	فرق بنہادم زبد و از بدبتر
بادشاہے کہ بہ پیش تخت او	فرق نبود از امین و ظلم خو

فرق نہ کند ہر دو یک باشد برش　　شاہ نبود خاک تیرہ بر سرش
ذرہ بر جہد تو افزوں نے شود　　در ترازوئے خدا موزوں شود
معنۓ جف القلم کے ایں بود　　کہ جفا ہا با وفا یکساں شود
بل جفا را ہم جفا جف القلم　　داں وفا را ہم وفا جف القلم

یہ جوآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے،جس کا ٹھکانہ دوزخ اور جنت میں لکھا ہوا نہ ہو۔اس سے مراد لوگوں کے اقسام واصناف کی طرف اشارہ ہے۔کوئی صنف ایسی نہ ہوگی،جس میں کمال اور نقصان اور عذاب وثواب نہ ہوگا۔

حقیقت قضا الٰہی ودُعا

اگر چہ دنیا کی کوئی چیز خیر وشر سے خالی نہیں۔تاہم قدرت نے اس کے حصول کے لئے اسباب مقرر کر رکھے ہیں۔جن کے صحیح اور سچے اثر میں کسی عقلمند کو کلام نہیں۔مثلاً اگر چہ مقدر پر لحاظ کر کے دوا کا کرنا درحقیقت ایسا ہی ہے،جیسا کہ دعا یا ترک دعا مگر کیا کوئی یہ رائے ظاہر کرسکتا ہے کہ مثلاً علم طب سراسر باطل ہے کہ علم حقیقی نے دعاؤں میں کچھ بھی اثر نہیں رکھا۔جبکہ خدا تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ تربد اور سقمونیا اور سنا اور حب الملوک میں تو ایسا قوی اثر رکھے کہ ان کی پوری خوراک کھانے کے ساتھ دست چھوٹ جاتے ہیں۔یا مثلاً سم الفار اور بیس اور دوسری ہلاہل زہروں میں وہ غضب کی تاثیر رکھ دی ہے کہ ان کا کامل قدر شربت چند منٹوں میں ہی اس جہان سے رخصت کردے،تو پھر کیونکر یہ امید کی جائے کہ خدا تعالیٰ اپنے برگزیدوں کی توجہ اور عقد ہمت اور تضرع کی بھری ہوئی دعاؤں کو فقط مردہ کی طرح رہنے دے،جن میں ایک ذرہ بھی اثر نہ ہو۔کیا یہ ممکن ہے کہ نظام الٰہی میں اختلاف ہو۔اور وہ ارادہ ،جو خدا تعالیٰ نے دواؤں میں اپنے بندوں کی بھلائی کے لئے کیا تھا،وہ ان میں مرعی نہ ہو۔

جو شخص دعا کی اعلیٰ تاثیروں پر ذاتی تجربہ نہ رکھتا ہو اور استجابت دعا کا قائل نہ ہو،اس کی مثال ایسی ہے،جیسے کوئی ایک مدت تک ایک پرانی اور سالخوردہ اور مسلوب القویٰ دوا کو استعمال کرے اور پھر اس کو بے اثر پا کر اس دوا پر عام حکم لگا دے کہ اس میں کچھ بھی تاثیر نہیں۔استجابت دعا یعنی قبول دعا کا مسئلہ درحقیقت دعا کے مسئلہ کی ایک فرع ہے۔اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس شخص نے اصل کو سمجھا ہوا نہیں ہوتا۔اس کو فرع کے سمجھنے میں مشکلات پیش آتی ہیں اور دھوکے لگتے ہیں۔

دعا کی ماہیت یہ ہے کہ ایک سعید بندے اور اس کے رب میں ایک تعلق مجاذبہ ہے،یعنی پہلے خدا تعالیٰ کی رحمانیت بندہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے،پھر بندے کے صدق کی کوششوں سے خدا تعالیٰ اس

سے نزدیک ہو جاتا ہے۔ اور دعا کی حالت میں وہ تعلق ایک خاص مقام پر پہنچ کر اپنے خواص عجیبہ پیدا کرتا ہے۔ سو جس وقت بندہ کسی سخت مشکل میں مبتلا ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف کامل یقین اور کامل امید اور کامل محبت اور کامل وفاداری اور کامل ہمت کے ساتھ جھکتا ہے اور نہایت درجہ کا بیدار ہو کر غفلت کے پردوں کو چیرتا ہوا فنا کے میدانوں میں آگے آگے نکل جاتا ہے، پھر آگے کیا دیکھتا ہے کہ بارگاہ الوہیت ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ تب اسکی روح اس آستانہ پر سر رکھ دیتی ہے۔ اور قوت جذب جو اس کے اندر رکھی گئی ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کی عنایات کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ تب اللہ جلشانہ اس کام کے پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس دعا کا اثر تمام مبادی اسباب پر ڈالتا ہے، جن سے ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں، جو اس مطلب کے حاصل ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً اگر بارش کے لئے دعا ہے، تو بعد استجابت دعا کے وہ اسباب طبعیہ جو بارش کے لئے ضروری ہوتے ہیں، اس دعا کے اثر سے پیدا کئے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ بات ارباب کشف اور کمال کے نزدیک بڑے بڑے تجارب سے ثابت ہو چکی ہے کہ کامل دعا میں ایک قوت تکوین پیدا ہو جاتی ہے، یعنی باذنہ تعالیٰ وہ دعا عالم سفلی اور علوی میں تصرف کرتی ہے۔ اور عناصر اور اجرام فلکی اور انسانوں کے دلوں کو اس طرف لے آتی ہے، جو طرف مؤید مطلوب ہے۔ خدا تعالیٰ کی پاک کتابوں میں اس کی نظریں کچھ کم نہیں ہیں۔ بلکہ اعجاز کے بعض اقسام کی حقیقت بھی دراصل استجابت دعا ہی ہے۔ اور جس قدر ہزاروں معجزات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ظہور میں آئے ہیں، یا کچھ اولیائے کرام ان دنوں تک عجائب کرامات دکھلاتے رہے ہیں، اس کا اصل اور منبع یہی دعا ہے۔ اور اکثر دعاؤں کے اثر سے ہی طرح طرح کے خوارق قدرت قادر کا تماشا دکھلاتے رہے ہیں۔

وہ جو عرب کے بیابانی ملک میں ایک عجیب ماجرا گذرا ہے کہ لاکھوں مردے تھوڑے دنوں میں زندہ ہو گئے اور پشتوں کے بگڑے ہوئے الٰہی رنگ پکڑ گئے اور آنکھوں سے اندھے بینا ہو گئے، اور گونگوں کی زبان پر الٰہی معارف جاری ہوئے، اور دنیا میں دفعۃً ایک ایسا انقلاب پیدا ہوا کہ نہ پہلے اس سے کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا۔ کچھ جانتے ہو کہ وہ کیا تھا؟ وہ ایک فانی فی اللہ کی اندھیری راتوں کی دعائیں ہی تھیں، جنہوں نے دنیا میں شور مچا دیا۔ اور وہ عجائب باتیں دکھلائیں، جو اس بیکس سے محال کی طرح نظر آتی تھیں۔ **اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَ بَارِکْ عَلَیْہِ وَ اٰلِہٖ بَعَدَ دِھَمِّہٖ وَ غَمِّہٖ وَ حُزْنِہٖ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ وَ اَنْزِلْ عَلَیْہِ اَنْوَارَ رَحْمَتِکَ اِلَی الْاَبَدِ۔**

سوال۔ دیکھا جاتا ہے کہ بعض دعائیں خطا جاتی ہیں اور ان کا کچھ اثر معلوم نہیں ہوتا۔

جواب۔ ہم کہتے ہیں کہ یہی حال دواؤں کا بھی ہے۔کیا دواؤں نے موت کا دروازہ بند کر دیا ہے یا ان کا خطا جانا غیر ممکن ہے۔مگر کیا باوجود اس بات کے کوئی ان کی تاثیر سے انکار کرسکتا ہے؟ یہ سچ ہے کہ ہر ایک امر پر تقدیر محیط ہو رہی ہے۔مگر تقدیر نے علوم کو ضائع اور بے حرمت نہیں کیا اور نہ اسباب کو بے اعتبار کر کے دکھلایا۔ بلکہ اگر غور کر کے دیکھو، تو یہ جسمانی اور روحانی اسباب بھی تقدیر سے جدا نہیں ہیں۔مثلاً اگر ایک بیمار کی تقدیر نیک ہو، تو اسباب علاج پورے طور پر میسر آ جاتے ہیں۔اور جسم کی حالت بھی ایسے درجہ پر ہوتی ہے کہ وہ ان سے نفع اٹھانے کے لئے مستعد ہوتا ہے۔تب دوا نشانہ کی طرح جا کر اثر کرتی ہے۔ یہی قاعدہ دعا کا بھی ہے یعنی دعا کے لئے بھی تمام اسباب و شرائط قبولیت اس جگہ جمع ہوتے ہیں، جہاں ارادہ الٰہی اس کے قبول کرنے کا ہے۔خدا تعالیٰ نے اپنے نظام جسمانی اور روحانی کو ایک ہی سلسلہ مؤثرات اور متاثرات میں باندھ رکھا ہے۔

آثار قبولیت دُعا

دعا جب قبول ہونے والی ہوتی ہے، تو اللہ تعالیٰ بندے کے دل میں ایک سچا جوش اور اضطراب پیدا کر دیتا ہے اور بسا اوقات اللہ تعالیٰ خود ہی ایک دعا سکھا دیتا ہے اور الہامی طور پر اس کا پیرایہ بتا دیتا ہے۔جیسا کہ فرماتا ہے۔فَتَلَقّٰی آدَمَ مِنْ رَبِّہٖ کَلِمَاتٍ ۔ترجمہ۔آدم کو اس کے رب کی طرف سے کلمات سکھائے گئے۔اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے راستباز بندوں کو قبول ہونے والی دعائیں خود الہاماً سکھا دیتا ہے۔بعض اوقات ایسی دعا میں ایسا حصہ بھی ہوتا ہے، جس کو دعا کرنے والا ناپسند کرتا ہے، مگر وہ قبول ہو جاتی ہیں۔تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس آیت کی مصداق ہوتی ہیں۔ عَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَ ھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ۔ترجمہ۔ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لئے خیر کا موجب ہو۔

وہ دعا، جو معرفت کے بعد اور فضل کے ذریعہ سے پیدا ہوتی ہے، وہ اور رنگ اور کیفیت رکھتی ہے۔ وہ فنا کرنے والی چیز ہے۔وہ گداز کرنے والی آگ ہے۔وہ رحمت کو کھینچنے والی ایک مقناطیسی کشش ہے۔وہ موت ہے، پر آخر کو زندہ کرتی ہے۔وہ ایک تُند سیل ہے، پر آخر کو کشتی بن جاتی ہے۔ ہر ایک بگڑی ہوئی بات اس سے بن جاتی ہے اور ہر ایک زہر آخر اس سے تریاق ہو جاتا ہے۔

مبارک وہ قیدی، جو دعا کرنے میں نہیں تھکتے، کیونکہ ایک دن رہائی پائیں گے۔مبارک وہ اندھے، جو دعاؤں میں سست نہیں ہوتے، کیونکہ ایک دن دیکھنے لگیں گے۔مبارک وہ، جو قبروں میں پڑے ہوئے دعاؤں کے ساتھ خدا تعالیٰ کی مدد چاہتے ہیں، کیونکہ ایک دن قبروں سے باہر نکالے جائیں

گے۔ مبارک تم جب کہ تم دعا کرنے میں کبھی ماندہ نہیں ہوتے اور تمہاری روح دعا کے لئے پگھلتی اور تمہاری آنکھ آنسو بہاتی اور تمہارے سینے میں ایک آگ پیدا کر دیتی ہے۔ اور تمہیں تنہائی کا ذوق اٹھانے کے لئے اندھیری کوٹھڑیوں اور سنسان جنگلوں میں لے جاتی ہے۔ اور تمہیں بیتاب اور دیوانہ اور ازخود رفتہ بنا دیتی ہے، کیونکہ آخر تم پر فضل کیا جائے گا۔

آنے والی بلائیں خواہ پیشگوئی کے رنگ میں ظاہر کی جائیں اور خواہ صرف خدا تعالیٰ کے ارادہ میں مخفی ہوں، وہ دعا و صدقہ و خیرات و توبہ و استغفار سے ٹل سکتی ہیں۔ تب ہی تو لوگ مصیبت کے وقت صدقہ و خیرات دیا کرتے ہیں۔ اور تمام نبیوں کا اس پر اتفاق ہے کہ دعا و صدقہ و خیرات و توبہ و استغفار سے ردّ بلا ہوتا ہے۔

ہماری اسلامی تفسیروں اور نیز بائبل میں بھی لکھا ہے کہ ایک بادشاہ کی نسبت وقت کے نبی نے پیشگوئی کی تھی کہ اس کی عمر پندرہ روز رہ گئی ہے۔ مگر وہ بادشاہ تمام رات روتا رہا۔ تب اس نبی کو دوبارہ الہام ہوا کہ ہم نے پندرہ دن کو پندرہ سال کے ساتھ بدل دیا ہے۔

صورتِ دُعا

دعا وہ اکسیر ہے، جو ایک مشت خاک کو کیمیا کر دیتی ہے۔ وہ ایک پانی ہے، جو اندرونی غلاظتوں کو دھو دیتا ہے۔ دعا کے ساتھ روح پگھلتی ہے اور پانی کی طرح بہ کر آستانہ حضرت احدیت پر گرتی ہے۔ وہ خدا کے حضور کھڑی بھی ہوتی ہے اور رکوع بھی کرتی ہے اور سجدہ بھی کرتی ہے۔ اور اس کی ظل وہ نماز ہے، جو اسلام نے دکھائی ہے۔ روح کا کھڑا ہونا یہ ہے کہ وہ خدا کے لئے ہر ایک مصیبت کی برداشت اور حکم ماننے کے بارے میں مستعدی ظاہر کرتی ہے اور اس کا رکوع یعنی جھکنا یہ ہے کہ وہ تمام محبتوں اور تعلقوں کو چھوڑ کر خدا تعالیٰ کی طرف جھک جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کے لئے ہو جاتی ہے۔ اور سجدہ یہ ہے کہ وہ خدا کے آگے اپنے تئیں بکلی کھو دیتی ہے۔ اور اپنے نقش وجود کو مٹا دیتی ہے۔ یہی دعا ہے، جو خدا سے ملاتی ہے۔ اور شریعت اسلامی نے اس کی تصویر معمولی نماز میں کھینچ کر دکھلائی ہے، تا وہ جسمانی نماز روحانی نماز کی طرف محرک ہو، کیونکہ خدا تعالیٰ نے انسان کے وجود کو ایسی بناوٹ پر پیدا کیا ہے کہ روح کا اثر جسم پر اور جسم کا اثر روح پر ضرور ہوتا ہے جب تمہاری روح غمگین ہو، تو آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اور جب روح میں خوشی پیدا ہو، تو چہرہ پر بشاشت ظاہر ہوتی ہے، یہاں تک کہ بسا اوقات ہنسنے لگتا ہے۔ ایسا ہی جب جسم کو کوئی تکلیف اور درد پہنچے، تو اس درد میں بھی شریک ہو جاتی ہے۔ اور جب جسم کسی ٹھنڈی ہوا سے خوش ہو، تو روح بھی اس سے کچھ حصہ لیتی ہے۔ پس جسمانی عبادت کی

غرض یہی ہے کہ روح اور جسم کے باہمی تعلقات کو وجہ سے روح میں حضرت احدیت کی طرف حرکت پیدا ہو۔ اور وہ روحانی قیام اور رکوع اور سجود میں مشغول ہو جائے، کیونکہ انسان ترقیات کے لئے مجاہدات کا محتاج ہے۔ اور یہ بھی ایک قسم کا مجاہدہ ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جب دو چیزیں باہم پیوست ہوں، تو جب ہم ان میں سے ایک چیز کو اٹھائیں گے، تو اس اٹھانے سے دوسری چیز کو بھی، جو اس سے ملحق ہے، کچھ حرکت ہوگی۔ لیکن صرف جسمانی قیام اور رکوع اور سجود میں کچھ اثر نہیں ہے، جب تک اس کے ساتھ کوشش شامل نہ ہو کہ روح بھی اپنے طور سے قیام اور رکوع اور سجود سے کچھ حصہ لے اور یہ حصہ لینا معرفت پر موقوف ہے۔ اور معرفت فضل الٰہی پر موقوف ہے۔

اقسام قضاء الٰہی

قضاء الٰہی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک کا نام معلّق ہے اور دوسری کو مبرم کہتے ہیں۔ اگر کوئی قضاء معلق ہو، تو دعا اور صدقات اس کو ٹلا دیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس کو بدل دیتا ہے۔ اور مبرم ہونے کی صورت میں وہ صدقات اور دعا اس قضا کے متعلق کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ ہاں وہ عبث اور فضول بھی نہیں رہتے۔ کیونکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے، بلکہ وہ اس دعا اور صدقات کا اثر اور نتیجہ کسی دوسرے پیرایہ میں انسان کو پہنچا دیتا ہے۔ بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی قضاء میں ایک وقت تک توقف اور تاخیر ڈال دیتا ہے۔ قضائے معلق کا ماخذ اور پتہ قرآن کریم سے ہی ملتا ہے۔ گو یہ الفاظ نہیں، مثلاً قرآن کریم میں خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ** ۔ یعنی دعا مانگو، میں قبول کروں گا۔ اب یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا قبول ہو سکتی ہے۔ اور دعا سے عذاب ٹل جاتا ہے اور ہزار ہا کیا بلکہ کل کام دعا ہی سے نکلتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کل چیزوں پر قادرانہ تصرف ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اسکے پوشیدہ تصرفات کی لوگوں کو خبر ہو یا نہ ہو، مگر صدہا تجربہ کاروں کے وسیع تجربے اور ہزار ہا دردمندوں کی دعاؤں کے صریح نتیجے بتلا رہے ہیں کہ اس کا ایک پوشیدہ اور مخفی تصرف ہے۔ وہ جو چاہتا ہے محو کرتا ہے اور جو چاہتا ہے اثبات کرتا ہے۔ ہمارے لئے یہ ضروری امر نہیں کہ ہم اس کی تہہ تک پہنچنے اور اسکی کنہ کو معلوم کرنیکی کوشش کریں۔ جبکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ایک شے ہونے والی ہے، اسلئے ہم کو جھگڑنے اور بحث میں پڑنے کی کچھ حاجت نہیں۔ خدا تعالیٰ نے انسان کی قضاء وقدر کو مشروط بھی رکھا ہے۔ جو توبہ خشوع وخضوع سے ٹل سکتی ہے۔ جب کسی قسم کی تکلیف اور مصیبت انسان کو پہنچتی ہے تو وہ فطرتاً اور طبعاً اعمال حسنہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اپنے اندر کے قلق اور کرب کو محسوس کرتا ہے، جو اسے بیدار کرتا ہے اور نیکیوں کی طرف کھینچے لئے جاتا ہے اور گناہ سے ہٹاتا

ہے۔جس طرح پر ہم ادویات کے اثر کو تجربہ کے ذریعہ سے پا لیتے ہیں، اسی طرح پر ایک مضطرب الحال انسان جب خداتعالیٰ کے آستانہ پر نہایت تذلل اور نیستی کے ساتھ گرتا ہے۔اور ربیّ ربیّ کہ کر اسکو پکارتا اور دعائیں مانگتا ہے، تو وہ رویا صالحہ یا الہام صحیح کے ذریعہ سے ایک بشارت اور تسلی پالیتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جب صبر اور صدق سے دعا انتہا کو پہنچے، تو وہ قبول ہو جاتی ہے۔دعا صدقہ اور خیرات سے عذاب کا ٹلنا ایک ایسی ثابت شدہ بات ہے، جس پر ایک لاکھ بیس ہزار نبیوں کا اتفاق ہے۔اور کروڑہا دیگر صلحا و اتقیا و اولیاء کے ذاتی تجربے اس پر گواہ ہیں۔

حقیقتِ خلقِ افعالِ خالق ومخلوق

(۱) جب انسان سے کوئی فعل صادر ہوتا ہے، تو اسی کے مطابق خداتعالیٰ بھی اپنی طرف سے ایک فعل صادر کرتا ہے۔مثلاً انسان جس وقت اپنی کوٹھڑی کے تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے، تو انسان کے اس فعل کے بعد خداتعالیٰ کا یہ فعل ہوگا کہ وہ کوٹھڑی میں اندھیرا پیدا کر دے گا۔کیونکہ جو امور خداتعالیٰ کے قانون قدرت میں ہمارے کاموں کے لئے بطور ایک نتیجہ لازمی کے مقدر ہو چکے ہیں۔وہ سب خداتعالیٰ کے فعل ہیں۔وجہ یہ کہ وہی علت العلل ہے۔ایسا ہی اگر کوئی شخص زہر قاتل کھالے، تو اس کے فعل کے بعد خداتعالیٰ کا یہ فعل صادر ہوگا کہ اسے ہلاک کر دیگا۔ایسا ہی اگر کوئی ایسا بیجا فعل کرے، جو کسی متعدی بیماری کا موجب ہو، تو اس کے فعل کے بعد خداتعالیٰ کا یہ فعل ہوگا کہ وہ متعدی بیماری اس کو پکڑ لے گی۔پس جس طرح ہماری دنیوی زندگی میں صریح نظر آتا ہے کہ ہمارے ہر ایک فعل کے لئے ایک ضروری نتیجہ ہے۔اور وہ نتیجہ خداتعالیٰ کا فعل ہے۔ایسا ہی دین کے متعلق بھی یہی قانون ہے، جیسا کہ خداتعالیٰ دو مثالوں میں صاف فرماتا ہے۔**اَلَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللہُ قُلُوْبَھُمْ**۔یعنی جو لوگ اس فعل کو بجالائے کہ انہوں نے خداتعالیٰ کی جستجو میں پوری کوشش کی، تو اس فعل کے لئے لازمی طور پر ہمارا یہ فعل ہوگا کہ ہم ان کو اپنی راہ دکھا دیں گے۔اور جن لوگوں نے کجی اختیار کی اور سیدھی راہ پر چلنا نہ چاہا، تو ہمارا یہ فعل ان کی نسبت ہوگا کہ ہم ان کے دلوں کو کج کر دیں گے۔

فعلِ حق و فعلِ ما ہر دو بہ بین — فعل مارا ہست و آں پیدا است ایں
خلق حقِ افعالِ ما را موجد است — فعل ما آثارِ خلقِ ایزد است
لیک ہست ایں فعلِ ما مختارِ ما — زو جزا گہ مار گہ یارِ ما

(۲) ہم جو بُرے کام کرتے ہیں، ان کے کرنے سے بُرے کہلاتے ہیں۔اور ہماری طرف وہ برائی عاید ہوتی ہے۔اگر خدا کو ان کاموں کا خالق کہیں گے، تو اس کی طرف ان کی برائی رجوع کرے گی یا

نہیں۔اور اسے بھی ہم ان کاموں کے سبب برا کہہ سکیں گے یا نہیں۔سو واضح ہو کہ پیدا کرنا کجا اور کام کرنا کجا۔ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔قیاس کرنے سے یہ بات ضرور ہے کہ دونوں چیزیں ایک سی ہوں۔اگر یہی قیاس ہے تو ہم کہتے ہیں کہ ناپاک چیز کے لگنے سے چیز ناپاک ہو جاتی ہے۔پرنور آفتاب پاخانہ پیشاب پر پڑتا ہے اور ناپاک نہیں ہوتا۔بلکہ الٹا اسے بھی منور کر دیتا ہے۔اسی طرح خدا کا نور ہر چیز کے وجود کو محیط ہے۔پھر ان چیزوں کی برائی اس تک نہیں پہنچتی۔بلکہ غور کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے کہ بری اور ناپاک چیز کا جس جگہ وجود ہوتا ہے، وہ جگہ ہی بری اور ناپاک ہو جاتی ہے اور اس کا بنانے والا برا اور ناپاک نہیں ہوسکتا۔ظاہر ہے کہ اگر کوئی ہوشیار کوزہ گر جان بوجھ کر کوئی بری سی شکل کا برتن بنالے، یا کوئی بڑا مشاق خوشنویس دیدہ دانستہ ایک بُرا لفظ کاغذ پر لکھ دے، یا کوئی آدمی کسی چیز سے کچھ پاخانہ اٹھا کر کسی کپڑے وغیرہ پر ڈال دے، تو اس برتن اور اس حرف ہی کو برا کہیں گے اور کوزہ گر اور خوشنویس کو بُرا نہ کہیں گے۔اور اس کپڑے کو ناپاک سمجھیں گے۔پھر اس آدمی کو، جس نے اسے ناپاک بنا دیا، ناپاک کہیں گے۔اور جس صورت میں ہمارا نزاع ہے، وہ تو یوں ہی ہے کہ انسان ان حرکات اور سکنات کا محل اور مقام ہے۔سو ان کی برائی سے اگر انسان بُرا ہو جائے، تو عجب نہیں۔ہر خالق بُرا نہیں ہو سکتا۔دیکھنے کی جگہ ہے کہ پتلیوں کے سانگ والے کسی پتلی سے تو اچھا کام لیتے ہیں اور حرکات موزوں اور خوش آیندہ مثل ناچ وغیرہ کے کراتے ہیں اور کسی کو یوں ہی بے قاعدہ ہلاتے ہیں اور حرکات ناموزوں کراتے ہیں، تو سب یونہی کہتے ہیں کہ فلاں پتلی خوب ناچتی ہے، فلاں بُری۔پر یوں نہیں کہتے کہ پتلی والا خوب ناچا یا بُرا ناچا یا اس نے بُرا کیا۔بلکہ اس کا نچانا بھی اس کے حق میں اچھا گنا جاتا ہے۔اس لئے کہ اس کی غرض جو تماشا ہے، دونوں کاموں سے خوب نکلتی ہے۔الغرض بُرے کام کے پیدا کرنے سے خدا کی طرف برائی عاید نہیں ہوسکتی۔اور جب بُرائی عاید نہیں ہوسکتی، تو اس کے حق میں بُرا بھی نہ ہوا۔اور جب بُرا نہ ہوا، تو اچھا ہوگا۔

آخر شب میں آسمانِ دنیا پر نزول الٰہی کی حقیقت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔يَنْزِلُ رَبَّنَا تَبَارَكَ وَ تَعَالىٰ اِلٰى سَمَاءَ الدُّنْيَا حِيْنَ يَبْقِىْ ثُلٰثِ اللَّيْلِ ۔یعنی جب رات کا آخر تہائی حصہ باقی رہتا ہے، تو ہمارا رب تبارک وتعالیٰ آسمان دنیا کی جانب نزول فرماتا ہے۔محققین کہتے ہیں کہ آوازوں کے سکون کی وجہ سے، جو حضور قلب کے مانع ہوتے ہیں، اور اشغال مشوشہ سے دل کے صاف ہونے اور ریا کا احتمال نہ ہونے کے سبب سے انسان کو رحمت الٰہیہ کے نزول کی جو قابلیت حاصل ہوتی ہے، اس حدیث میں اسی رحمت الٰہی کی جانب

اشارہ ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ ہے جو قلب کے اندر پیدا ہوتی ہے، جس کو نزول سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ انہیں دو اسرار کی وجہ سے انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ **اَقْـرَبُ مَا یَـکُـوْنَ الـرَّبُّ مِنَ الْعَبْدِ فِیْ جَوْفِ اللَّیْلِ الْاٰخِرِ** ۔یعنی سب سے زیادہ خدا تعالیٰ اور اس کے بندہ میں جو قربت ہوتی ہے وہ رات کے اخیر میں ہوتی ہے۔

کیا خدا تعالیٰ اب بھی بولتا ہے یا چپ ہے؟

(ا) اس سوال کا جواب عموماً وخصوصاً تمام ان لوگوں کے لئے، جو کسی مذہب کے پابند ہیں، یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے صفاتی اسماءِ حیّ وعلیم۔ سمیع۔ بصیر۔ متکلم۔ قیوم وغیرہ وغیرہ جو ہر فرقہ کے نزدیک مسلم و ثابت ہیں اور جن کا ذکر قرآن کریم میں بھی آچکا ہے، ان سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنی صفات کی رو سے کبھی معطل نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ پس یہ کیونکر سمجھا جائے کہ پہلے وہ کسی زمانہ میں بولتا بھی تھا اور سنتا بھی۔ مگر اب وہ سنتا ہے بولتا نہیں۔ پس جیسا کہ وہ پہلے زندہ تھا، اب بھی زندہ ہے۔ اور جیسا کہ وہ پہلے سنتا تھا، اب بھی سنتا ہے۔ اور جیسا کہ وہ پہلے بولتا تھا، اب بھی بولتا ہے۔ اگر وہ اس زمانہ میں بولتا نہیں، تو یقیناً وہ اب سنتا بھی نہیں اور نہ دیکھتا ہے۔ سو سچا مذہب وہی ہے، جو اس زمانہ میں بھی خدا کا سننا اور بولنا دونوں ثابت کرتا ہے۔ **ھُوَ الْاٰنَ کَمَا کَانَ** ۔(ترجمہ۔ وہ اب بھی ویسا ہی ہے، جیسا کہ وہ پہلے تھا)۔

یہ بڑی غلطی ہے ان لوگوں کی جو خدا تعالیٰ کی بعض صفات کو معطل قرار دیتے ہیں۔ کیا ان کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے کہ خدا کی بعض صفات مرورِ زمانہ کی وجہ سے دائمی طور پر معطل ہو جایا کرتی ہیں۔ شیخ المشائخ حضرت عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ "ستین مجالس" میں تحریر فرماتے ہیں، جس کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ "اے احمق خدا تعالیٰ جیسا سنتا ہے، ویسا ہی بولتا بھی ہے۔ تو اس کو گونگا جانتا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ تو اس کو بہرہ بھی قرار نہیں دیتا"۔

آریہ کہتے ہیں کہ مکالمہ الٰہی وید پر ختم ہو گیا۔ اور یہود کہتے ہیں کہ موسیٰ کے بعد خدا نے کسی سے کلام نہیں کیا۔ اور عیسائی کہتے ہیں کہ مکالمہ الٰہی مسیح پر ختم ہوا اور پھر خدا بولنے سے چپ ہو گیا۔ مگر قرآن شریف مکالمہ ومخاطبہ الٰہیہ کے سلسلہ کو بند نہیں کرتا۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ **یُلْقِیَ الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِہٖ عَلٰی مَـنْ یَّشَاءُ مِنْ عِبَادِہٖ** ۔ترجمہ۔ یعنی خدا جس پر چاہتا ہے، اپنا کلام نازل کرتا ہے۔ اور فرماتا ہے۔ **لَھُمُ الْبُشْـرٰی فِـی الْـحَیٰوۃِ الدُّنْیَا** ۔یعنی مومنوں کے لئے مبشر الہام باقی رہ گئے ہیں، گو شریعت ختم ہو گئی ہے۔ پس ہم خدا کے کلام اور مخاطبات پر کسی زمانہ میں مہر نہیں لگاتے۔ بیشک وہ اب بھی ڈھونڈنے والوں کو الہامی چشمہ سے سیراب کرنے کو تیار ہے، جیسا کہ پہلے تھا۔ اور اب بھی اس کے فیضان کے

ایسے دروازے کھلے ہیں، جیسا کہ پہلے تھا۔ ہاں ضرورتوں کے ختم ہونے پر شریعتیں اور حدود ختم ہو گئیں اور تمام رسالتیں اور نبوتیں اپنے آخری نقطہ پر آ کر، جو ہمارے سید و مولیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود باجود تھا، کمال کو پہنچ گئیں۔ اس آخری نور کا عرب سے ظاہر ہونا بھی خالی از حکمت نہ تھا، جس کا ذکر ہم انشاء اللہ آگے لکھیں گے۔

(۲) عشاق کی تسلی اور تسکین کے لئے دیدار یا گفتار دو ہی چیزیں ہیں۔ جہاں دیدار نہیں ہوسکتا، وہاں گفتار دیدار کی جا بجا اور قائم مقام ہو جاتی ہے۔ ایک مادر زاد نابینا گفتار کے ذریعہ شناسائی کر سکتا ہے۔

دیدار گر نہیں ہے تو گفتار ہی سہی   حسن و جمال و یار کے آثار ہی سہی

(۳) جب تک خدا تعالیٰ اپنے موجود ہونے کو اپنے کلام سے ظاہر نہ کرے، جیسا کہ اس نے اپنے کام سے ظاہر کیا، تب تک صرف کام کا ملاحظہ تسلی بخش نہیں ہوسکتا۔ مثلاً اگر ہم ایک ایسی کوٹھڑی کو دیکھیں، جس میں یہ بات عجیب ہو کہ اندر سے کنڈیاں لگائی گئی ہیں، تو اس فعل سے ہم ضرور اول یہ خیال کریں گے، کہ کوئی انسان اندر ہے، جس نے اندر سے زنجیر کو لگایا ہے، کیونکہ باہر سے اندر کی زنجیروں کو لگانا غیر ممکن ہے۔ لیکن جب ایک مدت تک بلکہ برسوں تک اور باوجود بار بار آواز دینے کے اس انسان کی طرف سے کوئی آواز نہ آئے، تو آخر ہماری یہ رائے کہ کوئی اندر ہے بدل جائیگی۔ اور ہم یہ خیال کریں گے کہ اندر کوئی نہیں ہے اور کسی حکمت عملی سے اندر کی کنڈیاں لگائی گئی ہیں۔ یہی حال ان فلاسفروں کا ہے، جنہوں نے صرف فعل کے مشاہدہ پر اپنی معرفت کو ختم کر دیا ہے۔ یہ بڑی غلطی ہے کہ خدا کو ایک مردہ کی طرح تصور کیا جائے، جس کو قبر سے نکالنا صرف انسان کا کام ہے۔ اگر خدا ایسا ہوتا، جو صرف انسانی کوشش سے اس کا پتہ لگایا جاتا، تو ایسے خدا کی نسبت عارفوں کی امیدیں عبث ہو جاتیں۔ بلکہ خدا تو وہی ہے، جو ہمیشہ سے اور قدیم سے آپ **اَنَا الْمَوْجُوْد** کہہ کر لوگوں کو اپنی طرف بلاتا رہا۔ یہ بڑی گستاخی ہوگی کہ کوئی ایسا خیال کرے کہ اس کی معرفت میں انسان کا اس پر احسان ہے۔ اور اگر فلاسفر نہ ہوتے، تو گویا وہ گم کا گم ہی رہتا۔ یہ بڑی بے ادبی کا لفظ ہے۔ **نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ**۔

(۴) اللہ تعالیٰ چونکہ غیر محدود ہے اور اس کی ذات ایسی نہیں کہ اس کی رویت اور دیدار جسمانی چیزوں کی طرح ہو سکے، اس واسطے اس نے اپنی گفتار، جس کو بالفاظ دیگر الہام، وحی۔ مکالمات کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، دیدار کے قائم مقام رکھ دیا ہے۔ جن کو دیدار ہوتا ہے، وہ بھی اکثر گفتار ہی کے ذریعہ تسلی پاتے اور طمانیت حاصل کرتے ہیں۔

ہر کہ ذوق یار جانی یافت است	آں ز وحی آسمانی یافت است
عشق از الہام آمد در جہاں	درد از الہام شد آتش فشاں
شوق و انس و الفت و مہر و وفا	جملہ از الہام می دارد ضیا
ہر کہ حق را یافت از الہام یافت	ہر رخ کو تافت از الہام تافت
عشق می خواہد کلام یار را	رو بپرس از عاشق ایں اسرار را
دل نمی گیرد تسلی جز خدا	ایں چنیں اوفتاد فطرت ز ابتدا
دل ندارد صبر از قول نگار	کاشتند ایں تخم از آغار کار
آنکہ انساں را چنیں فطرت بداد	چوں کمالے فطرتش دادے بباد
آنکہ زو ہر قدرتے گشتہ عیاں	قدرت گفتار چوں ماندے نہاں
آنکہ شد ہر وصف پاکش جلوہ گیر	پس چرا ایں وصف ماندے نہاں
ہر کہ او غافل بور از یاد دوست	چارہ ساز غفلتش پیغام اوست
تو عجب داری ز پیغام خدا	ایں چہ عقل وفکر تست اے خود نما
لطف او چوں خاکیاں را عشق داد	عاشقاں را چوں بیفگندے زیاد
عشق چو بخشید از لطف اتم	چوں نہ بخشیدے دوائے آں الم
خود چو کرد از عشق خود دلہا کباب	چوں نہ کردے از سر رحمت خطاب
دل نیار آمد بجز گفتار یار	گرچہ پیش دید ہا باشد نگار
پس چو خود دلبر بود اندر حجاب	کے تواں کردن صبوری از خطاب
لیک آں داند کہ او دل دادہ است	در طریق عاشقی او فتادہ است

خدا کیونکر بولتا ہے، کیا اس کی زبان ہے؟

بڑے بیباک ہیں وہ لوگ جو ایسا اعتراض کرتے ہیں۔ کیا اس نے جسمانی ہاتھوں کے بغیر تمام آسمانی اجرام اور زمین کو نہیں بنایا۔ کیا وہ جسمانی آنکھوں کے بغیر تمام دنیا کو نہیں دیکھتا۔ کیا وہ جسمانی کانوں کے بغیر ہماری آوازیں نہیں سنتا۔ کیا یہ ضروری نہ تھا کہ وہ اسی طرح کلام بھی کرے۔

رحمانی وشیطانی الہام میں معیارِ تمیز

اس جگہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بھلا یہ کیونکر معلوم ہو کہ وہ گفتار جو انسان سنتا ہے واقعی خدا کا

کلام ہے، کسی اور کا نہیں۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کے کلام کے ساتھ خدائی طاقت، جبروت اور عظمت ہوتی ہے۔ جس طرح تم لوگ ایک معمولی انسان یا بادشاہ کے کلام میں فرق کر سکتے ہو، اسی طرح اس احکم الحاکمین کے کلام میں بھی شوکت وسطوت سلطانی ہوتی ہے، جس سے شناخت ہو سکتی ہے کہ واقعی یہ کلام بجز خدائے عزّ وجلّ کے اور کسی کا نہیں۔

دوسرا بھاری نشان اس شناخت اور تمیز کا یہ ہوتا ہے کہ جس انسان سے خدا کلام کرتا ہے، وہ خالینہیں ہوتا، بلکہ اس میں بھی خدائی شان جلوہ گر ہوتی ہے اور وہ بھی ایک گونہ خدائی صفات کا مظہر اور جلوہ گاہ ہوتا ہے۔ اس میں وہ لوازم پائے جاتے ہیں، جو اوروں میں نہیں ہوتے۔ اس میں ایک خاص امتیاز ہوتا ہے۔ علوم غیبی، جو سفلی خیالات کے انسانوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں آ سکتے، وہ اس کو عطا کئے جاتے ہیں۔ اسکی دعائیں قبول کر کے اسکو اطلاع دی جاتی ہے اور اس کے کاروبار میں خاص نصرت اور مدد کی جاتی ہے۔ اور جس طرح خدا سب پر غالب ہے اور اس کوئی جیت نہیں سکتا، اسی طرح انجام کار وہ بھی غالب اور ہر طرح سے مظفر ومنصور اور کامیاب اور بامراد ہو جاتا ہے۔ اور اس قدرت الٰہی کا نمونہ دیکھنا ہو، تو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ابتدائی وآخری حالات بغور پڑھو۔

یہ نشان ہوتے ہیں، جن کے ذریعہ سے عقل مند انسان کو ضرورتاً ماننا پڑتا ہے کہ واقعی یہ انسان مقرب بارگاہ الٰہی ہے۔ اور پھر یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ خدا بھی ضرور ہے۔ جو لوگ صرف مصنوعات سے صانع کو پہچاننے اور شناخت کرنے کی راہ اختیار کرتے ہیں، وہ ادھوری راہ پر چلتے ہیں۔ اس راہ سے انسان کو حقیقی معرفت اور یقین کامل، جو انسان کی عملی حالت پر اثر ڈال سکے، ہرگز ممکن نہیں۔ زیادہ سے زیادہ بس یہی ہوتا ہے کہ خدا ہونا چاہئے۔ مگر ہے اور ہونا چاہئے میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اس بیان سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ معرفت بھی وہی فائدہ بخش ہو سکتی ہے۔ جس سے انسان میں ایک تبدیلی بھی پیدا ہو۔ ایک شخص جو قوت بینائی اور قوت رویت کا دعویٰ کرے، مگر اس کے دعوے کے ساتھ کوئی عملی ثبوت نہ ہو، اور وہ کھڑا ہوتے ہی دیواروں سے ٹکریں کھائے، کیا ایسا دعویٰ قابل پذیرائی ہو سکتا ہے، ہرگز نہیں۔ کار آمد صفت کمال ہی ہے۔ نیم ملاں خطرہ ایمان اور نیم حکیم خطرہ جان مشہور مقولے ہیں۔ پس کمال معرفت کی تلاش کرنا شرط ہے۔ اور وہ اسی راہ سے میسر آ سکتی ہے، جو راہ انبیاء دنیا میں لائے۔

حقیقت وحی اور اس کے نزول کی وجہ

(۱) وحی لغتِ عرب میں اشارت اور پیغام اور دل میں کسی بات کے ڈالنے کو کہتے ہیں۔ اور شرح میں عند الضرورتِ حقہ تائید اسلام کے لئے خدا تعالیٰ کا اپنا پیغام کسی بندے کے دل میں اتارنے

کو کہتے ہیں۔قرآن شریف نے وحی والہام کی سنت قدیمہ پر قانون قدرت سے گواہی لانے کے لئے ایک مقام میں قسم کھائی ہے۔اوروہ یہ ہے۔ **وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَ مَا هُوَ بِالْهَزْلِ** ۔ترجمہ یعنی اس آسمان کی قسم ہے،جس کی طرف سے بارش آتی ہے اور اس زمین کی قسم ہے، جو بارش سے طرح طرح کی سبزیاں نکالتی ہے کہ یہ قرآن خدا کا کلام اوراس کی وحی ہے۔اور وہ باطل اورحق میں فیصلہ کرنے والا ہے۔اور عبث اور بے ہودہ نہیں،یعنی بے وقت نہیں آیا، موسم کے مہینے کی طرح آیا ہے۔

اب خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کے ثبوت کے لئے ، جواس کی وحی ہے،ایک کھلے کھلے قانون قدرت کوقسم کے رنگ میں پیش کیا،یعنی قانون قدرت میں ہمیشہ یہ بات مشہوداور مرئی ہے کہ ضرورتوں کے وقت آسمان سے بارش ہوتی ہے اورتمام مدار زمین کی سرسبزی کا آسمان کی بارش پر ہے۔اگر آسمان سے بارش نہ ہو،تو رفتہ رفتہ کنوئیں بھی خشک ہو جاتے ہیں۔پس دراصل زمین کے پانی کا وجود بھی آسمان کی بارش پرموقوف ہے۔اسی وجہ سے جب کبھی آسمان سے پانی برستا ہے،تو زمین کے کنوؤں کا پانی چڑھ آتا ہے۔کیوں چڑھ آتا ہے؟ اس کا سبب یہی ہے کہ آسمانی پانی زمین کے پانی کواوپر کی طرف کھینچتا ہے۔یہی رشتہ وحی اللہ اور عقل میں ہے۔وحی اللہ یعنی الہام الٰہی آسمانی پانی ہے اور عقل زمینی پانی ہے۔ اور یہ پانی ہمیشہ آسمانی پانی سے ، جو الہام ہے،تربیت پاتا ہے اور اگر آسمانی پانی یعنی وحی ہونا بند ہو جائے ،تو یہ زمینی پانی بھی رفتہ رفتہ خشک ہوجاتا ہے۔

کیا اسکے واسطے یہ دلیل کافی نہیں کہ جب ایک زمانہ دراز گذر جاتا ہے اورکوئی الہام یافتہ زمین پر پیدا نہیں ہوتا،تو عقلمندوں کی عقلیں نہایت گندی اور خراب ہوجاتی ہیں، جیسے زمینی پانی خشک ہوجاتا ہے،سڑ جاتا ہے۔ایسا ہی عقلوں کا حال ہوتا ہے۔اس بات کو سمجھنے کے لئے اس زمانہ پر نظر غائر ڈالنی چاہیئے ، جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے پہلے اپنا رنگ دنیا میں دکھلا رہا تھا۔ چونکہ اس وقت حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ کو چھ سو برس گزر گئے تھے اوراس عرصہ میں کوئی الہام یافتہ پیدا نہیں ہوا تھا۔اسلئے تمام دنیا نے اپنی حالت کوخراب کردیا تھا۔ ہرایک ملک کی تاریخیں پکار پکار کر کہتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے تمام دنیا میں خیالات فاسدہ پھیل گئے تھے۔ ایسا کیوں ہوا تھا اوراسکا کیا سبب تھا؟ یہی تو تھا کہ الہام کا سلسلہ مدتوں تک بند ہو گیا تھا۔آسمانی سلطنت صرف عقل کے ہاتھ میں تھی۔پس اس ناقص عقل نے کن کن خرابیوں میں لوگوں کو ڈالا تھا۔کیا اس سے کوئی ناواقف بھی ہے؟ دیکھو الہام کا پانی جب مدت تک نہ برسا،تو عقلوں کا پانی کیسا خشک ہو گیا تھا۔سو

ان قسموں میں بھی یہی قانون قدرت اللہ تعالیٰ پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ تم غور کر کے دیکھو کہ کیا خدا کا یہ حکم اور دائمی قانون قدرت نہیں کہ زمین کی تمام سرسبزی کا مدار آسمان کا پانی ہے۔ سواس پوشیدہ قانون قدرت کے لئے ، جو الہام الٰہی کا سلسلہ ہے، کھلا کھلا قانون قدرت بطور گواہ کے ہے۔ سواس گواہ سے فائدہ اٹھاؤ۔ اور صرف عقل کو اپنا رہبر نہ بناؤ کہ وہ ایسا پانی نہیں کہ جو آسمانی پانی کے سوا موجود رہ سکے۔ جس طرح آسمانی پانی کا یہ خاصہ ہے کہ خواہ کسی کنویں میں اسکا پانی پڑے یا نہ پڑے، وہ اپنی طبعی خاصیت سے تمام کنوؤں کے پانی کو اوپر چڑھا دیتا ہے۔ ایسا ہی جب خدا کا ایک الہام یافتہ دنیا میں ظہور فرماتا ہے ،خواہ کوئی عقلمند اسکی پیروی کرے یا نہ کرے، مگر اس الہام یافتہ کے زمانہ میں خود عقلوں میں ایسی روشنی اور صفائی آ جاتی ہے کہ اس سے پہلے موجود نہ تھی۔ لوگ خواہ مخواہ حق کی تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور غیب سے ایک حرکت انکی قوت متفکرہ میں پیدا ہو جاتی ہے۔ سو یہ تمام عقلی ترقی اور دلی جوش اس الہام یافتہ کے قدم مبارک سے پیدا ہو جاتا ہے اور بالخاصیت زمین کے پانیوں کو اوپر اٹھاتا ہے۔ جب تم دیکھو کہ مذاہب کی جستجو میں ہر ایک شخص کھڑا ہو گیا ہے اور زمینی پانی میں کچھ ابال آیا ہے، تو اٹھو اور خبر دار ہو جاؤ۔ اور یقیناً سمجھو کہ آسمان سے زور کا مینہ برسا ہے اور کسی دل پر الہام کی بارش ہوگئی ہے۔

الغرض وحی و الہام الٰہی اور بارش آسمانی یہ دونوں سلسلے آپس میں بالمقابل بلحاظ اصلاح عالم جسمانیت و روحانیت ایک دوسرے کی دائمی ضرورتوں کے مقتضی ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا روم اپنی مثنوی میں سلسلہ وحی و الہام کی ضرورت کو بمطابق سائنس جدید نظم کے نہایت ہی لطیف پیرایہ میں بیان فرماتے ہیں۔

آب بہر آن ببارد از سماک — تا پلیداں را کند از خبث پاک
آب چوں بیکار گردد شد نجس — تا چناں شد کاب را رد کردِ حس
حق ببروش باز در بحر صواب — تا بشتش از کرم آں آبِ آب
سال دیگر آمد او دامن کشاں — ہے کجا بودی بدریائے خوشاں
من نجس زینجا شدم پاک آمدم — بستدم خلعت سوئے خاک آمدم
من بیائدا ے پلیداں سوئے من — کہ گرفت از خوئے یزداں خوئے من
در پذیرم جملہ زشتیہائے را — چوں ملک پاکی و ہم عنقریب را
چوں شوم آلودہ از آنجا روم — سوئے اصل ِ اصل پاکی ہا شوم
دلق چرکیں بر کنم آنجا ز سر — خلعت پاکم دھد بار دگر
کارِ او این است کار من ہم ایں — عالم آرائیست رب العالمین
گر نبودے ایں پلید یہائے ما — کے بدُے ایں بار نامہ آب را
کیسہائے زر بدز دیدہ است او — می رود جویاں مفلس سو بسو
تا بر یزد بر گیا و رستۂِ — تا بشوید روے ہر ناشستۂ
تا بگیرد بر سر او جمال دار — کشتی بیدست و پا را در بحار
صد ہزاراں دارد اندروئے نہاں — ز آنکہ دارد زو برید در جہاں
جان ہر درد و دل ھر دانۂ — میرود و درجو چو داروخانۂ
زد یتیماں زمین را پرورش — تشنگان خاک ر از وے خورش
چوں نماید مایہ اش تیرہ شود — ہمچو ماہ اندر زمین خیرہ شود
تالہ از باطن بر آرد کائے خدا — آنچہ وادی وادم و ماندم گدا
ریختم سرمایہ بر پاک و پلید — اے شۂ سرمایہ دہ ہل من مزید
ابر را گوید ببر جائے خوشش — ہم تو خورشید آببالا بر کشش
راہ ہائے مختلف مے راندش — تار ساند سوئے بحر بیحدش
باز آید زام طرف دامن کشاں — از طہرات محیط آرد نشان
از تیمّم دارہاند جملہ را — در تحری طالبان قبلہ را

تعریف وحی والہام الٰہی

تعریف وحی والہام کے متعلق حضرت امام غزالی وشاہ ولی اللہ وحضرت شیخ عبدالقادر جیلانی و ابن عربی خاتم الاولیاء وغیرھم رحمہم اللہ تعالیٰ اولیائے امت محمدیہؐ اصحاب حال بیان ذیل کے ساتھ متفق الکلمہ ہیں، جس کو ہم ان کی کتابوں سے اردو زبان میں ترجمہ کرکے یہاں درج کرتے ہیں۔

(۱) کبھی انبیاء اور اولیاء کو بیداری اور صحت میں خوبصورت صورتیں نظر آتی ہیں، جو جواہر ملائکہ کے مشابہ ہوتی ہیں۔ انہی صورتوں کے ذریعہ سے انبیاء اور اولیاء کو وحی اور الہام ہوتا ہے۔ تو غیب کے امور جو اوروں کو خواب میں معلوم ہوتے ہیں، انبیاء اور اولیاء کو صفائی باطن کی وجہ سے بیداری میں معلوم ہوتے ہیں، جیسا کہ خدا تعالیٰ نے کہا ہے کہ مریم کے سامنے جبریل ٹھیک آدمی کی صورت بن کر آیا۔ اور جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل کو اکثر دفعہ دیکھا۔

اہل کشف یعنی انبیاء واولیاء ہیبت ناک آوازیں سنتے ہیں۔ ان کی نسبت نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دماغ میں ہوا کے تموج سے پیدا ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہوا کا تموج، جو اس زور کے ساتھ دماغ سے ٹکرائے، خیال میں نہیں آسکتا۔ بلکہ وہ اس آواز کی تصویر ہے، جو عالم مثال میں موجود ہے۔

انبیاء واولیاء کو عالم غیب کی جو باتیں معلوم ہوتی ہیں، تو وہ کبھی لکھی ہوئی سطروں میں نظر آتی ہیں، کبھی آواز کی صورت میں، جو کبھی لذیز ہوتی ہے اور کبھی مہیب۔ اور کبھی وہ لوگ کائنات کی صورتیں دیکھتے ہیں، جو ان سے نہایت لطیف کلام کے ساتھ خطاب کرتی ہیں اور ان سے غیب کی باتیں کہتی ہیں۔ اور کبھی وہ صورتیں، جو خطاب کرتی ہیں، نہایت لطیف صنعتی پیکروں میں نظر آتی ہیں۔ اور کبھی پُر خطر معلوم ہوتی ہیں۔ اور کبھی وہ لوگ معلق مثالیں دیکھتے ہیں، جو خواب میں پہاڑ، دریا، زمین، سخت آوازیں اور اشخاص نظر آتے ہیں۔ یہ سب مثالی صورتیں ہیں، جو بذات خود قائم ہیں۔

(۲) وحی الٰہی ایک تجلی خاص کا نام ہے، جو بکثرت انہی پر ہوتی ہے، جو خاص اور مقرب ہوں۔ اور اس کی علت غائی یہ ہے کہ شبہات اور شکوک سے نکالنے کے لئے یا ایک نئی یا مخفی بات کے بتانے کے لئے یا خدا تعالیٰ کی مرضی اور عدم مرضی اور اس کے ارادہ پر مطلع کرنے کے لئے یا کسی محل خوف سے مامون اور مطمئن کرنے کے لئے یا کسی بشارت کے دینے کے لئے منجانب اللہ پیرایہ مکالمہ مخاطبہ اور ایک کلام لذیز کے رنگ میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ وہ ایک غیبی القاء لفظوں کے ساتھ ہے، جس کا ادراک غالباً غیبتِ حس کی حالت میں سماع کے طور پر یا جریان علی اللسان کے طور پر یا رویت کے طور پر ہوتا ہے۔ اور اپنے نفس اور امور خیالیہ کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا، بلکہ وہ محض الٰہی

تحریک اور بانی نفخ سے ایک قدرتی آواز ہے، جس کو مورد وحی کی قوت حاسہ دریافت کر لیتی ہے۔ جب انسان کی روح نفسانی آلائشوں سے پاک ہوکراور اسلام کی واقعی حقیقت سے کامل رنگ پکڑ کر خدا تعالیٰ کی بے نیاز جناب میں رضا اور تسلیم کے ساتھ پوری پوری وفاداری کو لے کر اپنا سر رکھ دیتی ہے اور ایک سچی قربانی کے بعد، جو فدائے نفس و مال وعزت و دیگر لوازم محبوبہ نفس سے مراد ہے، محبت اور عشق مولیٰ کے لئے کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور تمام حجت نفسانی، جو اس میں اور اس کے رب میں دوری ڈال رہے تھے، معدوم اور زائل ہو جاتے ہیں اور ایک انقلاب عظیم اور سخت تبدیلی اس انسان کی صفات اور اس کی اخلاقی حالت اور اس کی زندگی کے تمام جذبات میں پیدا ہوکر ایک نئی پیدائش اور نئی زندگی ظہور میں آ جاتی ہے اور اس کی نظر شہود میں وجود غیر بکلی معدوم ہو جاتا ہے۔ تب ایسا انسان اس لائق ہو جاتا ہے کہ مکالمہ الٰہی سے بکثرت مشرف ہو۔ اور مکالمہ الٰہی کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ محدود اور مشتبہ معرفت سے انسان ترقی کر کے اس درجہ شہود پر پہنچتا ہے کہ گویا خدا تعالیٰ کو اس نے دیکھ لیا ہے۔ سو یہ وہ مقام ہے جس پر تمام مقامات معرفت وخدا شناسی کے ختم ہو جاتے ہیں۔ اور یہی وہ آخری نقطہء کمالات بشریہ کا ہے، جس سے بڑھ کر عرفان کے پیاسوں کے لئے اس دنیا میں ہرگز میسر نہیں آسکتا اور نبیوں اور محدثوں کے لئے اس کے حصول کا اکثر طور پر قدرتی طریق یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ کسی پر ان میں سے اپنا کلام نازل کرے، تو روحانی طور پر بغیر توسط جسمانی اسباب کے اس پر ربودگی اور بیہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ تب وہ شخص اپنے وجود سے بکلی گم ہو کر بلا اختیار جناب الٰہی کی ایک خاص کشش سے گہرے غوطہ میں چلا جاتا ہے۔ اور ہوش آنے کے وقت اپنے ساتھ ایک کلام لذیز لے آتا ہے۔ وہی وحی الٰہی ہے۔

حضرت خاتم الاولیاء لکھتے ہیں کہ وحی الٰہی دل پر ایسے گرتی ہے، جیسے کہ آفتاب کی شعاع دیوار پر۔ اس بارے میں وہ اپنا ذاتی تجربہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ میں ہر روز دیکھتا ہوں کہ جب مکالمہ الٰہیہ کا وقت آتا ہے، تو اول یک دفعہ مجھ پر ایک ربودگی طاری ہوتی ہے۔ تب میں ایک تبدیل شدہ چیز کی مانند ہو جاتا ہوں۔ اور میری حس اور میرا ادراک اور ہوش گو بگفتن باقی ہوتا ہے، مگر اس وقت میں پاتا ہوں کہ گویا ایک وجود شدید الطاقت نے میرے تمام وجود کو اپنی مٹھی میں لے لیا ہے۔ اور اس وقت احساس کرتا ہوں کہ میری ہستی کی تمام رگیں اس کے ہاتھ میں ہیں اور جو کچھ میرا ہے، اب وہ میرا نہیں بلکہ اس کا ہے۔ جب یہ حالت ہو جاتی ہے، تو اس وقت سب سے پہلے خدا تعالیٰ دل کے ان خیالات کو میری نظر کے سامنے پیش کرتا ہے، جن پر اپنے کلام کی شعاع ڈالنا اس کو منظور ہوتا ہے۔ تب ایک عجیب کیفیت سے وہ خیالات یکے بعد دیگرے نظر کے سامنے آتے ہیں اور ایسا ہوتا ہے کہ جب ایک خیال

مثلاً زید کی نسبت دل میں آیا کہ فلاں مرض سے صحت یاب ہوگا یا نہ ہوگا۔ تو جھٹ اس پر ایک ٹکڑا کلام الٰہی کا ایک شعاع کی طرح گرتا ہے اور بسا وقات اس کے گرنے کے ساتھ تمام بدن ہل جاتا ہے۔ پھر وہ مقدمہ طے ہو کر دوسرا خیال سامنے آتا ہے۔ ادھر وہ خیال نظر کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور ادھر ساتھ ہی ایک ٹکڑا الہام کا اس پر گرتا ہے، جیسا کہ ایک تیر انداز ہر یک شکار نکلنے پر تیر مارتا ہے۔ اور عین اس وقت میں محسوس ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ خیالات کا ہماری ملکہ فطرت سے پیدا ہوتا ہے۔ اور کلام جو اس پر گرتا ہے، وہ اوپر سے نازل ہوتا ہے۔ اگرچہ شعراء وغیرہ کو بھی سوچنے کے بعد القاء ہوتا ہے۔ مگر اس وحی کو اس سے مناسبت دینا سخت بے تمیزی ہے۔ کیونکہ وہ القاء خوض اور فکر کا ایک نتیجہ ہوتا ہے اور ہوش وحواس کی قائمی اور انسانیت کی حد میں ہونے کی حالت میں ظہور کرتا ہے۔ لیکن یہ القاء صرف اس وقت ہوتا ہے کہ جب انسان اپنے تمام وجود کے ساتھ خدا تعالیٰ کے تصرف میں آجاتا ہے اور اپنا ہوش اور اپنا خوض کسی طور سے اس میں دخل نہیں رکھتا۔ اس وقت زبان ایسی معلوم ہوتی ہے کہ گویا اپنی زبان نہیں اور ایک زبردست طاقت اس سے کام لے رہی ہے۔

وحی والہام کی صورت مذکورہ سے صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ فطرتی سلسلہ کیا چیز ہے اور آسمان سے کیا نازل ہوتا ہے۔ حضرت ابن فارض مصری نے اپنے دیوان میں اور مولانا روم نے اپنی مثنوی شریف میں ایسا ہی ظاہر کیا ہے۔

چوں پری را ایں دم و قانون بود　　　کرد گار آں پری خود چوں بود

حضرت محی الدین ابن عربی المعروف شیخ اکبر اپنی کتاب فتوحات مکیہ کی جلد سوم باب ۳۱۵ صفحہ ۴۷ پر تحریر فرماتے ہیں۔ **اذا اراد حق ان یوحی الی ولی من اولیائه بامر ما تجلی الحق فی صورة ذالک الامر** ۔ترجمہ۔ جب خدا تعالیٰ ارادہ کرتا ہے کہ کسی کام کی بابت اپنے کسی ولی دوست پر وحی نازل کرے، تو اس کام کی صورت میں اس پر تجلی فرماتا ہے۔

اقسام وحی والہام

وحی قسم اول یا خواب محض علم الیقین تک پہنچاتی ہے، جیسا کہ ایک شخص اندھیری رات میں ایک دھواں دیکھتا ہے اور اس سے ظنی طور پر استدلال کرتا ہے کہ اس جگہ آگ ہوگی۔ اور وہ استدلال ہرگز یقینی نہیں ہوتا، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ دھواں نہ ہو، بلکہ ایسا غبار ہو، جو دھوئیں سے متشابہ ہو، یا دھواں تو ہو، مگر وہ ایک ایسی زمین سے نکلتا ہو، جس میں کوئی مادہ آتشی موجود ہو۔ پس یہ علم ایک عقلمند کو اس کے ظنوں سے رہائی نہیں بخش سکتا۔ اور اس کو کوئی ترقی نہیں دے سکتا۔ بلکہ صرف ایک خیال ہے، جو اپنے ہی دماغ میں

پیدا ہوتا ہے۔پس اس علم کی حد تک ان لوگوں کی خوابیں اور الہام ہیں، جو محض دماغی بناوٹ کی وجہ سے ان کو آتی ہیں۔کوئی عملی حالت ان میں موجود نہیں۔ یہ تو علم الیقین کی مثال ہے اور جس شخص کے خواب اور الہام کا سر چشمہ یہی درجہ ہے، اس کے دل پر اکثر شیطان کا تسلط رہتا ہے۔اور اس کو گمراہ کرنے کے لئے وہ شیطان بعض اوقات ایسی خوابیں یا الہام پیش کر دیتا ہے، جن کی وجہ سے وہ اپنے تئیں قوم کا پیشوا یا رسول کہتا ہے اور ہلاک ہو جاتا ہے۔

ہاں عنایت ازلی سے، جو انسانی فطرت کو ضائع نہیں کرنا چاہتی، تخم ریزی کے طور پر اکثر افراد انسانی میں یہ عادت اپنی جاری رکھی ہے کہ کبھی کبھی سچی خوابیں یا سچے الہام ہو جاتے ہیں، تا وہ معلوم کر سکیں کہ ان کے لئے قدم رکھنے کے لئے ایک راہ کھلی ہے۔لیکن ان کی خوابوں اور الہاموں میں خدا کی قبولیت اور محبت اور فضل کے کچھ آثار نہیں ہوتے اور نہ ایسے لوگ نفسانی نجاستوں سے پاک ہوتے ہیں۔اور خوابیں محض اس لئے آتی ہیں کہ تا ان پر خدا کے پاک نبیوں پر ایمان لانے کے لئے ایک حجت ہو۔ کیونکہ اگر وہ سچی خوابوں اور سچے الہاموں کی حقیقت کو سمجھنے سے قطعاً محروم ہوں اور اس بارے میں ایسا علم جس کو علم الیقین کہنا چاہیئے ان کو حاصل نہ ہو، تو خدا تعالیٰ کے سامنے عذر ہو سکتا ہے کہ وہ نبوت کی حقیقت کو سمجھ نہیں سکتے تھے، کیونکہ اس کوچہ سے بکلی ناآشنا تھے۔اور کہہ سکتے ہیں کہ نبوت کی حقیقت سے ہم محض بے خبر تھے۔اور اس کے سمجھنے کے لئے ہماری فطرت کو کوئی نمونہ نہیں دیا گیا تھا۔پس ہم اس مخفی حقیقت کو کیونکر سمجھ سکتے۔اس لئے سنت اللہ قدیم سے، اور جب سے دنیا کی بنیاد ڈالی گئی، اس طرح پر جاری ہے کہ نمونہ کے طور پر عام لوگوں کو قطع نظر اس سے کہ وہ نیک ہوں یا بد ہوں اور صالح ہوں یا فاسق ہوں اور مذہب میں سچے ہوں یا جھوٹا مذہب رکھتے ہوں، کسی قدر سچی خوابیں دکھائی جاتی ہیں یا سچے الہام بھی دیئے جاتے ہیں۔تا ان کا قیاس اور گمان، جو محض نقل اور سماع سے حاصل ہے، علم الیقین تک پہنچ جائے اور تا روحانی ترقی کیلئے ان کے ہاتھ میں کوئی نمونہ ہو۔اور حکیم مطلق نے اس مدعا کے پورا کرنے کے لئے انسانی دماغ کی بناوٹ ہی ایسی رکھی ہے اور ایسے روحانی قویٰ اس کو دیئے ہیں کہ وہ بعض سچی خوابیں دیکھ سکتا ہے۔اور بعض سچے الہام پا سکتا ہے۔مگر وہ سچی خوابیں اور سچے الہام کسی وجاہت اور بزرگی پر دلالت نہیں کرتے، بلکہ وہ محض نمونہ کے طور پر ترقی کے لئے ایک راہ ہوتی ہے۔اور اگر ایسی خوابوں اور ایسے الہاموں کی کسی بات پر کچھ دلالت ہے، تو صرف اس بات پر کہ ایسے انسان کی فطرت صحیح ہے بشرطیکہ جذبات نفسانیہ کی وجہ سے انجام بد نہ ہو۔اور ایسی فطرت سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر درمیان میں روکیں اور حجاب پیش نہ آ جائیں، تو وہ ترقی کر سکتا ہے، جیسے مثلاً ایک زمین ہے، جس کی

نسبت بعض علامات سے ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ اس کے نیچے پانی ہے، مگر وہ پانی زمین کی کئی تہوں کے نیچے دبا ہوا ہے اور کئی قسم کا کیچڑ اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اور جب تک ایک پوری مشقت سے کام نہ لیا جائے، اور زمین کو بہت دنوں تک کھودا نہ جائے۔ تب تک وہ پانی، جو شفاف اور شیریں اور قابل استعمال ہے، نکل نہیں سکتا۔ پس یہ کمال شقوت اور نادانی اور بدبختی ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ انسانی کمال بس اسی پر ختم ہے کہ کسی کو کوئی سچی خواب آ جائے یا سچا الہام ہو جائے۔ بلکہ انسانی کمال کے لئے اور بہت سے لوازم اور شرائط ہیں۔ اور جب تک وہ متحقق نہ ہوں، تب تک وہ خوابیں اور الہام مکر اللہ میں داخل ہیں۔ خدا ان کے شر سے ہر ایک سالک کو محفوظ رکھے۔ پس الہام کے فریفتہ کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ بسا اوقات وحی الابتلاء بھی ہوتی ہے۔ اور وحی الاصطفاء بھی۔ وحی الابتلاء بعض اوقات موجب ہلاکت ہو جاتی ہے، جیسا کہ بلعم اسی وجہ سے ہلاک ہوا، مگر صاحب وحی الاصطفاء کبھی ہلاک نہیں ہوتا۔

وحی قسم دوم۔ دوسری حالت وہ ہے کہ جیسے انسان اندھیری رات میں اور سخت سردی کے وقت ایک روشنی کو دور سے مشاہدہ کرتا ہے اور وہ روشنی اس کو اگرچہ راہ راست کو دیکھنے میں مدد دیتی ہے، مگر سردی کو دور نہیں کر سکتی۔ اس درجہ کا نام عین الیقین ہے اور اس درجہ کا عارف خدا تعالیٰ سے تعلق تو رکھتا ہے، مگر وہ کامل نہیں ہوتا۔ اس مذکورہ درجہ پر شیطانی الہامات بکثرت ہوتے ہیں، کیونکہ ابھی ایسے شخص کا جس قدر شیطان سے تعلق ہوتا ہے، خدا تعالیٰ سے نہیں ہوتا۔

وحی قسم سوم۔ تیسری حالت وہ ہے کہ جب انسان اندھیری رات اور سخت سردی کے وقت میں نہ صرف آگ کی روشنی پاتا ہے۔ بلکہ اس آگ کے حلقہ کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور اسکو محسوس ہو جاتا ہے کہ درحقیقت آگ یہ ہے اور اس سے اپنی سردی کو دور کرتا ہے۔ یہ وہ کامل درجہ ہے، جسکے ساتھ ظن جمع نہیں ہو سکتا۔ اور یہی وہ درجہ ہے جو بشریت کی سردی اور قبض کو بکلی دور کرتا ہے۔ اس حالت کا نام حق الیقین ہے۔ اور یہ مرتبہ محض کامل افراد کو حاصل ہوتا ہے، جو تجلیات الٰہیہ کے حلقہ کے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور علمی و عملی حالتیں ان کی درست ہو جاتی ہیں۔ اس درجہ سے پہلے نہ علمی حالت کمال کو پہنچتی ہے اور نہ عملی۔ اس درجہ کو پانے والے وہی لوگ ہوتے ہیں، جو خدا تعالیٰ سے کامل تعلق رکھتے ہیں۔ اور حقیقت میں وحی کا لفظ انہیں کی وحی پر اطلاق پاتا ہے۔ کیونکہ وہ شیطانی تصرفات سے پاک ہوتی ہے۔ اور وہ ظن کے درجہ پر نہیں ہوتی، بلکہ یقینی اور قطعی ہوتی ہے۔ اور وہ نور ہوتا ہے، جو خدا تعالیٰ کی طرف سے انکو ملتا ہے اور ہزارہا برکات انکے ساتھ ہوتی ہیں۔ اور بصیرت صحیحہ انکو حاصل ہوتی ہے، کیونکہ وہ دور سے نہیں دیکھتے، بلکہ نور کے حلقہ کے اندر داخل کئے جاتے ہیں۔ اور انکے دل کو خدا سے ایک ذاتی تعلق ہوتا ہے۔

اس درجہ میں انسان محبت الٰہی کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ٹھہر کر اپنی نفسانی وجود سے بالکل نیست ہو جاتا ہے۔اور اس مرتبہ پر انسانی معرفت پہنچ کر قال سے حال کی طرف انتقال کرتی ہے اور سفلی زندگی بالکل جل کر خاک ہو جاتی ہے۔اور ایسا انسان خدا تعالیٰ کی گود میں بیٹھ جاتا ہے۔اور جیسا کہ ایک لوہا آگ میں پڑ کر بالکل آگ کے رنگ میں آ جاتا ہے اور آگ کی صفات اس سے ظاہر ہونی شروع ہو جاتی ہیں ،ایسا ہی اس درجہ کا آدمی صفات الٰہیہ سے ظلی طور پر متصف ہو جاتا ہے۔اور اس قدر طبعاً مرضات الٰہیہ میں فنا ہو جاتا ہے کہ خدا میں ہو کر بولتا ہے اور خدا میں ہو کر دیکھتا ہے اور خدا میں ہو کر سنتا ہے اور خدا میں ہو کر چلتا ہے۔گویا اس کے جبہ میں خدا ہی ہوتا ہے۔یہی وہ مرتبہ ہے جس کے متعلق حضرت مولوی رومی اپنی مثنوی میں لکھتے ہیں۔

گفتن او گفتن اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

اس مرتبہ ثالثہ کی ،جو اعلیٰ اور اکمل مرتبہ ہے ،ہم اس طرح تصویر کھینچتے ہیں کہ وہ ولی کامل اور اقسام ثلاثہ میں سے تیسری قسم کی وحی ہے، جو کامل فرد پر نازل ہوتی ہے۔اس کی یہ مثال ہے کہ جیسے سورج کی دھوپ اور شعاع ایک مصفّا آئینہ پر پڑتی ہے، جو عین اس کے مقابل میں پڑا ہے۔یہ تو ظاہر ہے کہ اگر چہ سورج کی دھوپ ایک چیز ہے،لیکن بوجہ اختلاف مظاہر کے اس کے ظہور کی کیفیت میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔پس جب سورج کی شعاع زمین کے کسی اپنے کثیف حصہ پر پڑتی ہے، جس کی سطح پر ایک شفاف اور مصفّا پانی موجود نہیں ، بلکہ سیاہ اور تاریک خاک ہے، سطح بھی مستوی نہیں ،تب شعاع نہایت کمزور ہوتی ہے۔خاص کر اس حالت میں جبکہ سورج اور زمین میں کوئی بادل بھی حائل ہو۔لیکن جب وہی شعاع ،جس کے آگے کوئی بادل حائل نہیں، شفاف پانی پر پڑتی ہے، جو ایک مصفّا آئینہ کی طرح چمکتا ہے،تب وہی شعاع ایک سے دہ چند ہو کر ظاہر ہوتی ہے، جسے آنکھ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔

پس اسی طرح جب نفس تزکیہ یافتہ پر، جو تمام کدورتوں سے پاک ہو جاتا ہے، وحی نازل ہوتی ہے،تو اس کا نور فوق العادت طور پر نمایاں ہوتا ہے۔اور اس نفس پر صفات الٰہیہ کا انعکاس پورے طور پر ہو جاتا ہے۔اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ جیسے آفتاب نکلتا ہے تو ہر ایک پاک اور ناپاک جگہ پر اس کی روشنی پڑتی ہے، یہاں تک کہ ایک پاخانہ کی جگہ بھی ، جو نجاست سے پُر ہے، اس سے حصہ لیتی ہے۔تاہم پورا فیض اس سے روشن آئینہ صافی یا آب صافی کو حاصل ہوتا ہے، جو اپنی کمال صفائی سے خود سورج کی تصویر کو اپنے اندر دکھلا سکتا ہے۔اسی طرح کہ بوجہ اس کے کہ خدا تعالیٰ بخیل نہیں ہے، اس کی روشنی سے ہر ایک فیض یاب ہے۔مگر تاہم وہ لوگ ، جو اپنی نفسانی حیات سے مر کر خدا تعالیٰ کی ذات کا مظہر اتم ہو جاتے

ہیں، ان کی حالت سب سے الگ ہے۔ جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ اگرچہ سورج آسمان پر ہے، لیکن تاہم جب وہ ایک نہایت شفات پانی یا مصفّا آئینہ کے مقابل پر پڑتا ہے، تو یوں دکھائی دیتا ہے کہ وہ اس پانی یا آئینہ کے اندر ہے۔ لیکن دراصل وہ اس پانی یا آئینہ کے اندر نہیں ہے۔ بلکہ پانی یا آئینہ نے اپنے کمال صفائی یا آب وتاب کی وجہ سے لوگوں دکھلا دیا ہے کہ گویا وہ پانی یا آئینہ کے اندر ہے۔

واضح ہو کہ میں نے وحی والہام کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ سب گذشتہ اولیائے کرام و اصحاب حال کے کلمات طیّبات کا انتخاب ہے۔ میں نے اپنی طرف سے کوئی بات اس میں زائد نہیں لکھی۔(مؤلف)

سوال ۔تقریر مذکور کی رو سے ہر زمانہ میں اصحاب الہام کا ہونا لازم آتا ہے۔ پس اگر یہ بات سچ ہے، تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کون کون صاحب الہام گزرے ہیں؟

جواب(۱) ۔جس طرح فیض عام حضرت احدیت نے ہر ایک کو بجز شاذونادر لوگوں کے جسمانی صورت میں آنکھ اور ناک اور کان اور قوت شامہ اور دوسری تمام قوتیں عطا فرمائی ہیں اور کسی قوم سے بخل نہیں کیا، اسی طرح روحانی طور پر بھی اس نے کسی زمانہ اور کسی قوم کے لوگوں کو روحانی قویٰ کی تخم ریزی سے محروم نہیں رکھا۔ اور جس طرح تم دیکھتے ہو کہ سورج کی روشنی ہر ایک جگہ پر پڑتی ہے اور کوئی لطیف یا کثیف جگہ اس سے باہر نہیں ہے، یہی قانون قدرت روحانی آفتاب کی روشنی کے متعلق ہے کہ نہ کثیف جگہ اس روشنی سے محروم رہ سکتی ہے اور نہ لطیف جگہ۔ ہاں مصفیٰ اور شفاف دلوں پر وہ نور عاشق ہے۔ جب وہ آفتاب روحانی مصفیٰ چہروں پر اپنا نور ڈالتا ہے، تو اپنا کل نور ان میں ظاہر کر دیتا ہے۔

پس اب بھی جو پاک وصاف دل ہو جاتے ہیں، ان کو وہی فیوض وانوار ملتے ہیں، جو پہلوں کو ملے۔ اور صفائی دل بجز قبول اسلام حاصل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ آفتاب اگرچہ تمام اطراف عالم میں اپنی کرنیں وشعاعیں چھوڑ رہا ہے، مگر وہ وہاں ہی منعکس ہوتی ہیں، جہاں ان کے مقابل میں صاف پانی یا آئینہ موجود ہو۔

جواب (۲) ۔ایک روحانیت ہی ایسی شے ہے کہ جو خاصۂ اسلام ہے اور کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ پس اگر شریعت میں روحانیت ہی نہ رہی، تو پھر سوائے اساطیر کے اور کیا باقی رہا۔ جو اہل دل ہیں، وہ سمجھتے ہیں، مگر جو کودن ہیں، وہ ان امور سے ناواقف ہیں۔ جس کو خدا تعالیٰ نے قلب سلیم عطا کیا ہے اور دینی ضرورتوں سے واقفیت رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ سلسلہ الہام کبھی بند نہیں ہوتا۔ ہاں ایسی وحی، جو قرآن کریم کے سوا کوئی نئی شریعت تجویز کرتی ہے، وہ بالکل بند ہے۔ اور جو کوئی اس کا مدعی ہو، وہ

بلا شک و شبہ خارج از اسلام ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ وہ نبوت ختم ہو گئی ہے ۔لیکن ایسے مکالمات و مخاطبات،جن سے ایمان کو ترقی ہوتی ہے،وہ جاری ہیں اور رہیں گے۔کیونکہ اگر آواز کا سلسلہ ہی بند ہو جائے،تو پھر یقین کامل کا طریق کوئی نہیں رہتا۔ایک بند مکان پر اگر آوازیں مارتے رہو اور کوئی جواب نہ آئے،تو آخر یہی کہو گے کہ اس میں کوئی نہیں ہے۔پس اسی طرح اگر خدا کی طرف سے کوئی آواز نہ آئے،تو اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ ہے بھی؟اور اگر سلسلہ الہام بند ہو گیا ہوا ہے۔تو اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡهِمۡ کو نماز میں دہرانے کا کیا فائدہ ہے۔کیونکہ منعم علیہ گروہ میں تو انبیاء بھی ہیں اور دوسرے صلحاء وغیرہ،جن پر خدا نے انعام الہام و وحی کیا تھا۔اور اگر اب اس کا دروازہ ہی مسدود ہے،تو پھر اس دعا کا کیا فائدہ؟ یہ تو ظاہر ہے کہ انبیاء و رسل پر انعام الٰہی مال و دولت کے رنگ میں نہیں ہوتے،اور نہ وہ ان باتوں کے لئے دنیا میں آتے ہیں۔بلکہ اس کے برعکس فقر و فاقہ کو پسند کرتے ہیں۔اور بالآخر ماننا پڑے گا کہ ان پر صرف مکالمات و مخاطبات الٰہی کا انعام ہی تھا۔ اور قرآن شریف سے بھی یہی ظاہر ہے،تو اب اس کا سلسلہ منقطع کرنا کس قدر ناشکری کی بات ہے۔

علاوہ اس کے ہمیں یہ ایمان رکھنے کے باوجود کہ ہماری خیر الامت ہے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بنی اسرائیل کی عورتیں اس امت کے مردوں سے بدرجہا اچھی ٹھہریں،کیونکہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ماں سے تو خدا تعالیٰ نے کلام کیا اور اس کو وحی کی۔پس اس امت کے مرد اسرائیلی امت کی عورتوں کی مانند بھی نہ ہوئے۔تو پھر ہماری خیر الامت کیوں کر ہوئی؟

ایمان کا ستون تو یقین ہے اور وہ الہام سے حاصل ہوتا ہے۔پھر جب الہام نہ رہا،تو پھر صرف باتیں اور قصے رہ گئے۔اور آسمانی اور روحانی امور نہ رہے،تو کیا باقی رہا۔قاعدہ کی بات ہے کہ انسان کے ہاتھ میں جب تک کسی بات کی نظیر اور نمونہ نہ رہے،تو پھر وہ رفتہ رفتہ اس سے منکر ہو جاتا ہے۔اسی لئے خدا تعالیٰ نے اسلام میں یہ انتظام کیا ہے کہ اس میں صاف صاف الہام ہوتے رہتے ہیں تاکہ ان نمونوں کو دیکھ کر شجر ایمان و یقین ہمیشہ تر و تازہ رہے۔**ما خلقت الجن و الانس ال لیعبدون** کے یہ معنے ہیں کہ جنّ و انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ معرفت الٰہی حاصل کریں۔اب جب کہ خدا کی طرف سے آواز ہی نہ آئے،تو پھر معرفت کیا ہوئی۔اور انسانی خلقت (پیدائش) سے جو اصل مقصد تھا،وہ پورا نہ ہوا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بھی بڑی علت غائی یہی تھی کہ معرفت تامہ حاصل ہو۔مکالمہ و مخاطبہ الٰہی کا مسئلہ ایسا ہے کہ کل اکابروں کو اس پر اتفاق ہے۔اگر میں ان تمام صلحاء و اولیائے کرام کے نام لکھوں،جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد مکالمہ و مخاطبہ الٰہی سے مشرف ہوئے،تو ایک ضخیم کتاب بن

جائے۔ یہاں بطور اختصار چند ایک کے نام نامی معہ حوالہ ان کی مؤلفات و دعویٰ کے لکھے جاتے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "فتح الربانی وستین مجالس" مطبوعہ استنبول صفحہ ۱۵۳ پر لکھتے ہیں۔ وَیْلَکَ یَا مُبْتَدِعُ اَمَا یَقْدِرُ اللّٰہ تَعَالیٰ اَنْ یَّقُوْلَ اِنِّی اَنَا اللّٰہ اَلَا اللّٰہ رَبُّنَا عَزَّ وَ جَلَّ مُتَکَلِّمٌ لَیْسَ بِاَخْرَسٍ لَہ' کَلَامٌ یَّسْمَعُ وَ یَفْھَمُ ۔ترجمہ۔اے بدعتی تیری خرابی ہو۔کیا خدا تعالیٰ طاقت نہیں رکھتا کہ کہے، میں خدا ہوں۔سو ہمارا خدا غالب اور بزرگ ہے۔وہ بات کرنیوالا ہے۔گونگا نہیں۔اس کا کلام سنائی دیتا ہے اور سمجھا جاتا ہے۔حضرت شیخ موصوف نے اپنی ساری کتابوں میں اپنی نسبت اہل الہام ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

حضرت امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "احیاء العلوم الدین" جلد سوم مطبوعہ مصر صفحہ ۶۴۔ ۶۵ میں لکھتے ہیں۔ ان العلم انما یحصل فی قلوبنا بواسطۃ الملائکۃ و الیہ الاشارۃ بقولہ تعالیٰ و ما کان بشر ان یکلمہ اللہ الا وحیًا او من وراء الحجاب او یرسل رسولا فنوحی باذنہ ما یشاء۔ترجمہ۔یقیناً ہمارے دلوں میں علم الٰہی بذریعہ ملائکہ کرام حاصل ہوتا ہے۔اور اس کی طرف خدا تعالیٰ کے کلام میں اشارہ ہے کہ کسی انسان کی طاقت نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ اس سے کلام کرے بغیر وحی یا پردہ کے پیچھے سے یا اس کی طرف کوئی رسول بھیجے اور اس کو وحی کرے، جو چاہے۔

حضرت عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ "لطائف المنن" جلد دوم صفحہ ۱۲۹ پر لکھتے ہیں۔ وَ مِمَّا اَنْعَمَ اللّٰہ تَبَارَکَ وَ تَعَالیٰ بِہٖ عَلَیَّ اِنَّہ' جَعَلَنِیْ مِنْ اَھْلِ الْاَلْھَام الصَّحِیْح ۔یعنی خدا تعالیٰ کی نعمتوں میں سے، جو اس نے مجھ پر کی ہیں، ایک یہ ہے کہ اس نے مجھے صاحب الہام کیا ہے۔آپ لکھتے ہیں۔و یسمیٰ ھذا ایضاً وحی المبشرات المشار الیھا بقولہ تعالیٰ لھم البشریٰ فی الحیٰوۃ الدنیا و فی الآخرۃ ۔یعنی اس الہام کو بشارتوں کی وحی بھی کہتے ہیں۔چنانچہ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ مومنوں کو دنیا کی زندگی میں بھی خوش خبری دی جاتی ہے اور آخرت میں بھی۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دیوان کے صفحہ ۵۶ مطبوعہ نولکشور پر لکھتے ہیں۔

دمبدم روح القدس اندر معینے می دمد　　　من نمید انم مگر من عیسیٰء ثانی شدم

"فتوحات مکیہ" میں حضرت محی الدین ابن عربی المعروف شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ اور "فیوض الحرمین" میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضر امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے اپنے مکتوبات میں اپنی نسبت خدا تعالیٰ کے ساتھ شرف مکالمہ ومخاطبہ الٰہی کا ذکر کیا ہے۔علیٰ ہذا القیاس اور بھی بیشمار صلحائے کرام امت نبویہ میں گزرے ہیں، جو مکالمہ ومخاطبہ الٰہی کے ساتھ مشرف ومعزز تھے۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی اپنے مکتوبات میں ایک مرید کو لکھتے ہیں۔ **اعلم ایھا الصدیق ان کلامه سبحانه مع البشر قد یکون شفاهاً و ذالک الافراد من الانبیاء و قد یکون ذالک لبعض المکمل من متابعیھم** ۔ترجمہ۔اے صدیق واضح ہو کہ خداتعالیٰ کا مکالمہ کبھی انسان کے ساتھ روبرو واقع ہوتا ہے۔اور اس قسم کا مکالمہ الٰہی بعض خاص انبیاء اور ان کے بعض کامل تابعین کے ساتھ ہوتا ہے۔

آں شہ عالم کہ نامش مصطفےٰ　　سید عشاق حق شمس الضحےٰ
تابعش چوں انبیا گردد ز نور　　نورش افتد بر ہمہ نزدیک و دور

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اپنی کتاب "فتح الربانی" کی پچاسویں مجلس میں لکھتے ہیں، جس کا اردو ترجمہ یہ ہے۔" خلقت میں سے بعض فرد ہوتے ہیں، جن کے دلوں پر وحی کی جاتی ہے اور خاص کلمات ان کو القاء کئے جاتے ہیں"۔(دیکھو۔تحفہ سبحانی ص۲۵۲)

گیرم ایں وحی نبی گنجور نیست　　ہم کم از وحی دل زنبور نیست
چونکہ وحی الرب الی النحل آمدہ است　　خانہ وحیتش پر از حلوا شدہ است
او بنور وحی حق عز و جل　　کرد عالم را پر از شمع و عسل
آنکہ کز منا است بالا مے رود　　وحیتش از زنبور کے کمتر بود
نے تواعطینا**ک کوثر** خواندہء　　پس چرا خشکی و تشنہ ماندہء
یا مگر فرعونی و کوثر چوں نیل　　بر تو خوں گشتہ است و ناخوش اے علیل
ہر کرا دیدی ز کوثر سر خرو　　او محمد خوست با او گیر خو

(کذا فی مثنوی مولانائے روم)

یاد رکھنا چاہئے کہ جیسے ہمیں روشنی بخشنے کے لئے ہر روز تازہ طور پر آفتاب نکلتا ہے اور ہم صرف اس قدر قصہ سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور نہ تسلی پا سکتے ہیں، اگر ہم اندھیرے میں ہوں اور روشنی کا نام و نشان نہ ہو اور کہا جائے کہ آفتاب ہے تو سہی، مگر وہ پہلے کسی زمانے میں طلوع کرتا تھا اور اب ہمیشہ کے لئے پوشیدہ ہے۔اسی طرح جیسے وہ حقیقی آفتاب، جو دلوں کو روشن کرتا ہے، ہر روز تازہ بتازہ طلوع کرتا ہے اور اپنی قولی و فعلی تجلیات سے انسان کو حصہ بخشتا ہے، وہی خدا سچا ہے اور وہی مذہب سچا ہے، جو ایسے خدا کے وجود کی بشارت دیتا ہے اور ایسے خدا کو دکھلاتا ہے۔اسی زندہ خدا سے نفس پاک ہوتا ہے۔یوں تو بجز دہریہ لوگوں کے تمام دنیا کسی نہ کسی رنگ میں خداتعالیٰ کے وجود کی قائل ہے۔مگر چونکہ قائل ہونا

صرف اپنا تراشیدہ خیال ہے اور زندہ خدا کی اپنی ذاتی تجلی سے نہیں ہے اس لئے خیال سے زندہ ایمان حاصل نہیں ہوسکتا، جب تک خدا تعالیٰ کی طرف انــا الـمو جود کی آواز زوردار اور طاقتوں کے ساتھ معجزانہ رنگ میں اور خارق عادت کے طور پر سنائی نہ دے۔ اور فعلی طور پر اس کے ساتھ دوسرے زبردست نشان نہ ہوں۔ اس وقت تک اس زندہ خدا پر ایمان آ نہیں سکتا۔ ایسے لوگ محض سنی سنائی باتوں کا نام خدا یا پرمیشر رکھتے ہیں۔ اور صرف گلے پڑا ڈھول بجا رہے ہیں اور اپنی شناسائی کی حد سے زیادہ لاف وگزاف کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے۔

مذاہب باطلہ کے پیرو، جو اسلام کے مخالف ہیں، وہ تو الہام اور وحی الٰہی کے بند ہونے پر ابدی مہر لگا چکے ہیں، مگر اس امت محمدیہ میں یہ دروازہ مدام قیامت تک کھلا رہے گا۔ کیونکہ وحی الٰہی صرف انبیاء ورسولوں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے، بلکہ ان کے دوسرے کامل تابعدار بھی اس نعمت سے بہرہ ور ہوسکتے ہیں، خواہ وہ عورتیں ہوں یا مرد۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کی ماں اور حضرت عیسیٰ کی ماں دونوں عورتیں تھیں اور وہ نبیہ نہیں تھیں۔ تاہم خدا تعالیٰ کے یقینی مکالمات اور مخاطبات ان کو نصیب تھے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ وَ اَوْحَیْنَـا اِلٰـی اُمِّ مُـوْسَـیٰ اَنْ اَرْضِعِیْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْهِ فَـاَلْـقِیْـهِ فِـی الْیَـمِّ وَ لَا تَـخَافِیْ وَ لَا تَحْزَنِیْ اِنَّا رَادُّوْهُ اِلَیْکَ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۔ ترجمہ۔ اور ہم نے وحی کی موسیٰ کی ماں کو کہ اس کو دودھ پلا اور اگر چہ تجھ کو ڈر ہو اس کا، تو بیشک ڈال دے اس کو ندی میں اور ڈر نہیں اور نہ غم کھا۔ ہم اس کو پھر تیری طرف لوٹائیں گے اور اس کو رسولوں میں داخل کریں گے۔ اور مریم علیہا السلام کے بارے میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اذ قالت الملئکة یا مریم ان اللہ یبشـرک بـکلمة منه اسمه المسیح عیسیٰ ابن مریم وجهیا فی الدنیا و الآخرة و مـن الـمقربین ۔ ترجمہ۔ جب کہا فرشتوں نے اے مریم خدا تعالیٰ تجھے بشارت دیتا ہے، ایک اپنے حکم کی، جس کا نام مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا، مرتبے والا اور آخرت میں خدا تعالیٰ کے مقربوں میں سے ہوگا۔

اب اگر اس امت کا ایک شخص اس قدر طہارت نفس میں کامل ہو کہ ابراہیم علیہ السلام کا دل پیدا کرلے اور اتنا خدا تعالیٰ کا فرمانبردار ہو، جو تمام نفسانی چولہ پھینک دے اور اتنا خدا تعالیٰ کی محبت میں محو ہو کہ اپنے وجود سے فنا ہو جائے، تب بھی وہ باوجود اس قدر تبدیلی کے موسی علیہ السلام کی ماں کی طرح بھی کیا وحی نہیں پاسکتا۔ کیا کوئی عقلمند انسان خدا کی طرف ایسا بخل منسوب کرسکتا ہے۔ نہیں نہیں۔ بلکہ وہ مدام اپنے ایسے پیاروں کو اپنے مکالمہ ومخاطبہ سے شرف بخشتا ہے۔

یہ بات بالکل سچ ہے۔ ہزار ہا اہل اللہ نے تجربہ کیا ہے کہ جب انسان تقویٰ وطہارت پورے

طور پر اختیار کرتا ہے اور اس سے متصف ہو جاتا ہے، تو اس پر علوم الٰہی بذریعہ الہام نازل ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت محی الدین ابن عربی المعروف شیخ اکبر رحمۃ ان علیہ لکھتے ہیں۔

اِذَا اَعْطَاکَ بِالْاِلْهَامِ عِلْماً　　تَحَقَّقْهُ فَاَنْتَ بِهٖ سَعِیْدٌ

کَمِثْلِ النَّحْلِ مُخْتَلِفُ الْمَعَانِیْ　　قَوِیٌّ فِیْ مَبَانِیْهِ سَدِیْدٌ

ترجمہ۔ جب تجھے خدا تعالیٰ الہام کے ذریعہ علم عطا کرے، تو اس علم کا محقق بن۔ اس کے ساتھ تم سعادت مند ہو جاؤ گے۔ مختلف الاقسام والا ولون شہد کی طرح الہام الٰہی سے علوم کے مختلف معانی تجھ پر کھلیں گے۔

بموجب ارشاد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام وحی کا نزول آپ کی امت میں قیامت تک جاری رہے گا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحیح مسلم شریف میں مسیح بن مریم علیہ السلام امام آخر زمان کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ صاحب وحی ہوگا۔ اس پر وحی الٰہی نازل ہوا کرے گی۔ وہ حدیث ذیل میں معہ ترجمہ لکھی جاتی ہے۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یاتی عیسیٰ قوماً قد عصمھم اللہ من الدجال فیمسح عن وجوھھم و ھو یحدثھم بدرجاتھم فی الجنۃ فبینما ھو کذالک اذا اوحی اللہ الٰی عیسی انی قد خرجت عبادا الی الایدان لاحد بقتالھم فحرز عبادی الی الطور. ترجمہ۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ مسیح موعود ایک قوم کے پاس آئے گا، جن کو خدا نے دجال سے محفوظ رکھا ہوگا۔ پس مسیح موعود ان کو دلاسا تسلی دے گا۔ اور ان کو ان کے درجات جنت بتائیگا۔ پس وہ اسی میں ہوگا کہ خدا تعالیٰ اس کو وحی کرے گا کہ میں نے کچھ اپنے بندے تیار کئے ہیں، جن کا مقابلہ کوئی شخص جنگ میں نہیں کرسکتا۔ پس تو میرے بندوں کو طور پر جمع کر۔

حقیقت ختم نبوت

(۱) یہ بات واجب تسلیم ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کے قافلہ سالار اور سب رسولوں کے سردار اور سب میں افضل اور سب کے خاتم ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عالم میں جو کچھ ہے، انبیاء کے کمالات ہوں یا اولیاء کے، سب خدا تعالیٰ کے عطا کئے ہوئے ہیں۔ مگر بنی آدم میں کمالات مختلفہ موجود ہیں۔ کسی میں حسن ہے، تو کسی میں فضل وکمال ہے۔ کسی میں زور وقدرت ہے، تو کسی میں عقل وفراست ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ کے اور بندوں کی اس وقت ایسی مثال ہے، جیسے کسی استاد جامع کمالات کے پاس مختلف فنون کے طالب ہیں۔ اور ہر شخص جدا علم سے فیضاب ہو کر اپنے

اپنے کمالات دکھلائیں۔ مگر ظاہر ہے کہ شاگردوں کے آثار سے یہ بات خود نمایاں ہو جائیگی کہ یہ شخص کس فن میں استاد مذکور کا شاگرد ہے۔ اگر فیض منقول اس شاگرد سے جاری ہے، تو معلوم ہو جائیگا کہ فن منقول میں استاد مذکور کا شاگرد ہے۔ اور اگر فیض معقول جاری ہے، تو معلوم ہوگا کہ فن معقول میں استاد مذکور سے مستفیذ ہوا ہے۔ بیماروں کا علاج کرنا ہے، تو استفادہ طب کا پتہ لگے گا۔ اور شاعروں میں غزل خوانی کرتا ہے، تو تحصیل کمال شاعری کا سوراخ نکلے گا۔ الحاصل شاگردوں کے احوال خود بتلا دیں گے کہ استاد کے کون سے کمال نے اس میں ظہور کیا ہے۔ جب بنی آدم خصوصاً انبیاء میں مختلف قسم کے حالات و کمالات موجود ہوں اور پھر سب کے سب خدا ہی کے عطا کردہ اور اس کے فیض سے ہوں، تو بدلالت آثار کاروبار انبیاء معلوم ہو جائے گا کہ یہ نبی خدا تعالیٰ کی کون سی صفت سے مستفید ہے۔ اور دوسرا نبی کون سی خدا کی صفت سے مستفیض ہے۔ یعنی گو ایک ساتھ باقی سب صفتیں بھی قلیل و کثیر آئیں، مگر اصل منبع فیض کوئی ایک ہی صفت ہوگی۔ بدلات معجزات انبیاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک صفت سے مستفیذ ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوسری صفت سے مستفیذ ہیں۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ ؑ میں بدلالت احیاء موتیٰ و شفائے امراض مضمون جان بخش کا پتہ لگتا ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام میں بدلالت اعجوبہ عصائے موسوی کہ کبھی عصا تھا اور کبھی اژدہا تھا، صفت تبدیل و تقلیب کا سراغ نکلتا ہے۔ مگر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بدلالت اعجاز قرآنی و کمالات علمی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ صفت علم سے مستفیذ ہیں اور درگاہ علمی میں باریاب ہیں۔ علم وہ صفت ہے کہ تمام صفات اپنی کارگذاری میں اس کی محتاج ہیں۔ جبکہ علم اپنے کام میں کسی دوسری صفت کا محتاج نہیں ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ارادہ قدرت وغیرہ علم اور ادراک کے بغیر کسی کام کے نہیں۔ اور پھر کھاتے ہیں، تو اول یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ روٹی ہے پتھر نہیں۔ اور پانی پینے کا ارادہ کرتے ہیں یا پیتے ہیں، تو یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ پانی ہے، شراب نہیں۔ یہ علم نہیں تو اور کیا ہے۔ مگر روٹی کو روٹی سمجھنا اور پانی کو پانی سمجھنا ارادہ قدرت پر موقوف نہیں۔ القصہ علم کو اپنی معلومات کے تعلق میں کسی صفت کی ضرورت نہیں۔ جب کہ باقی تمام صفات کو اپنے تعلقات میں علم کی حاجت ہے۔ غرض جو صفات غیر سے متعلق ہوتی ہیں، ان میں سب سے اول علم ہے۔ علم سے پہلے کوئی دوسری صفت نہیں ہے۔ بلکہ علم ہی پر مراتب صفات متعلقہ بالغیر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے وہ نبی جو صفت علم سے مستفیض ہو اور بارگاہ علمی تک باریاب ہو، تمام انبیاء سے رتبہ میں اول اور سب کا سردار اور مخدوم و مکرم ہوگا۔ اور سب اس کے تابع اور محتاج ہوں گے۔ اس پر مراتب کمالات ختم ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ نبی خاتم الانبیاء بھی ہوگا۔ کسی دوسرے نبی نے دعویٰ خاتمیت نہیں کیا سوائے حضرت محمد رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ چناں چہ قرآن اور حدیث میں یہ مضمون بتصریح موجود ہے۔ اگر آپ سے پہلے کوئی دعویٰ خاتمیت کا کرتا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کرتے۔ مگر دعویٰ تو در کنار انہوں نے فرمایا کہ میرے بعد جہاں کا سردار آنیوالا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے نہ صرف اپنی خاتمیت کا انکار کیا، بلکہ خاتم کے آنے کی بشارت دی۔

(۲) مراکز کو فتح کرنا آخری کمال ہے، جس کو عام لوگ دیکھ سکتے ہیں۔ مجوس نے مکہ کو فتح نہ کیا اور نہ یہود اور نصاریٰ نے۔ لیکن اسلام نے مکہ، یروشلم۔ آتشکدے کو فتح کر کے دکھا دیا کہ وہ کامل فاتح ہے۔ روحانی طور پر دعاوی کا مجموعہ اور ان کے دلائل مطلوب ہیں۔ اور قرآن کریم ان سب کا جامع ہے۔ پھر قوم کو قوت استنباط واجتہاد سے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

(۳) ختم نبوت کا یہ مطلب بھی ہے کہ نبوت کے تمام کمالات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع ہو گئے ہیں۔ بدیں لحاظ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیّین ہیں۔ پس جیسے کہ تمام کمالات متفرقہ جو انبیاء علیہم السلام میں تھے، وہ خدا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں جمع کر دیئے۔ اور تمام خوبیاں اور کمالات، جو متفرق کتابوں میں تھے، وہ قرآن شریف میں جمع کر دیئے۔ ایسا ہی جس قدر کمالات تمام امتوں میں تھے، وہ اس امت میں جمع کر دیئے۔ کیونکہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے وہ نبی دیا، جو خاتم المومنین اور خاتم العارفین اور خاتم النبیّین ہے۔ اور اسی طرح وہ کتاب اس پر نازل فرمائی، جو جامع الکتب اور خاتم الکتب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جو خاتم النبیّین ہیں اور آپ پر نبوت ختم ہوگئی، تو یہ نبوت اس طرح پر ختم نہیں ہوئی، جیسے کوئی گلا گھونٹ کر ختم کر دے۔ ایسا ختم قابل فخر نہیں ہوتا۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہونے سے یہ مراد ہے کہ طبعی طور پر آپ پر کمالات نبوت ختم ہو گئے، یعنی وہ تمام کمالات متفرقہ، جو آدم سے لے کر مسیح ابن مریم تک نبیوں کو دیئے گئے تھے کسی کو کوئی اور کسی کو کوئی، وہ سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع کر دیئے گئے۔ اور اس طرح پر آپ طبعاً خاتم النبیّین ٹھہرے۔ اور ایسا ہی وہ جمیع تعلیمات، وصایا اور معارف، جو مختلف کتابوں میں چلے آتے ہیں، وہ قرآن شریف پر آ کر ختم ہو گئے۔ بدیں وجہ قرآن شریف بھی خاتم الکتب ٹھہرا۔

(۴) ہم ختم نبوت کی ایک اور مثال اس طرح پر دے سکتے ہیں کہ جیسے چاند ہلال سے شروع ہوتا ہے اور چودہویں تاریخ پر آ کر اس کا کمال ہو جاتا ہے، جبکہ اسے بدر کہا جاتا ہے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آ کر کمالات نبوت ختم ہو گئے۔

(۵) فرض کرو کہ ایک صندوقچہ تھا اور اس میں گلاب کا ایک نہایت خوشبودار پھول رکھا تھا۔ بہت لوگ کہتے تھے کہ اس میں گلاب کا پھول ہے۔ اس کی خوشبو اور نشانیوں سے سمجھاتے تھے۔ بہت لوگ مانتے تھے۔ مگر بہت نہ مانتے تھے۔ ایک شخص آیا اور اس نے صندوقچہ کھول کر سب کو وہ پھول دکھا دیا۔ سب بول اٹھے کہ اب تو حد ہوگئی، یعنی یہ بات ختم ہوگئی۔ اب اس کے کیا معنی ہیں۔ کیا یہ معنی ہیں کہ کوئی دوسرا شخص اس صندوقچہ کو نہیں کھولے گا اور وہ پھول کسی کو نہیں دکھائے گا۔ یہ مطلب سمجھنا تو بعید از عقل ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس امر کا ثابت کرنا کہ اس صندوقچہ میں پھول ہے ختم ہوگیا یا انتہا کو پہنچ گیا۔ اب اس سے زیادہ کوئی نہیں کرسکتا۔ اب تو حد ہوگئی۔ پس یہی معنے ختم رسالت کے ہیں۔

(۶) روحانی ترقی وتہذیب کے باب میں جو کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے ہیں، وہ اس کی حد یا انتہا ہے۔ اور اس لئے وہ خاتم ہیں۔ اب اگر ہزاروں لوگ ایسے پیدا ہوں، جن میں ملکہ نبوت ہو، مگر وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے دراصل ملکہ نبوت کا ختم اور فیضان الٰہی کا خاتمہ نہیں فرمایا، بلکہ اولیاء امتی کی بنیاد بنی اسرائیل کے لفظ سے اس ملکہ نبوت کا تا قیامت جاری رہنا پایا جاتا ہے۔ مگر نبوت کا خاتمہ ہوگیا ہے، جیسے کہ اُس پھول کے دکھائے جانے سے پھول کے اثبات کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ جملہ صوفیائے کرام ومشائخ عظام اس بات میں متفق الکلمہ ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ستین مجالس میں فرماتے ہیں۔ صُوْرَۃُ النُّبوَۃِ اِرْتَفَعَتْ وَ مَعْنَاھَا بَاقٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ۔ ترجمہ۔ یعنی نبوت کی صورت تو اٹھ گئی۔ (البتہ) اس کے معنے وملکہ قیامت تک باقی ہیں۔

(۷) قافلہ انبیاء ایک قافلہ سفارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو پیغامبر اور رسول کہتے ہیں۔ اور وجہ اس کہنے کی یہی ہے کہ وہ پیغام خداوندی پہنچاتے ہیں اور احکام خداوندی لاتے ہیں۔ مگر جب قافلہ انبیاء کو قافلہ سفارت کہا، تو لاجرم ان میں کوئی سالارِ قافلہ ہوگا۔ اول تو ایسے قافلوں میں ایک سالارِ قافلہ کا ہونا ظاہر ہی ہے، دوسرے سفارت اور نبوت ایک وصف ہے۔ اور اوصاف کی کل دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جو موصوف کے حق میں خانہ زاد ہو، عطائے غیر نہ ہو۔ دوسرے وہ جو موصوف کے حق میں عطائے غیر ہو۔ مگر ظاہر ہے کہ عطا غیر کے لئے اول اس غیر کی ضرورت ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ غیر اس صفت کا موصوف ہی ہوگا، ورنہ تحقق اوصاف بے تحقق موصوف لازم آئیگا۔ لیکن جب اس کو موصوف مانا اور اس کا وصف اس کے حق میں عطائے غیر نہیں، تو یہ بھی خواہ نخواہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ وہ غیر مصدر وصف ہے اور وہ وصف اس سے صادر۔ چنانچہ مشاہدہ کیفیت نور زمین سے جیسے یہ روشن ہے کہ اس کا نور عطائے آفتاب ہے، مشاہدہ کیفیت آفتاب سے یہ ظاہر ہے کہ اس کا نور اسی کا خانہ زاد ہے اور اس

سے صادر ہوا ہے۔ ورنہ بالبداہت کسی اور ہی کا فیض کہنا پڑیگا۔ مگر یہ تقسیم ہے تو پھر درصورت نقد و وصف و احدیت تو ممکن نہیں کہ سب میں عطاء غیر ہو۔ کیونکہ اس صورت میں عطائے غیر کا تحقق بے تحقق غیر لازم آئیگا۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ سب میں یا چند افراد میں وہ وصف خانہ زاد ہو، ورنہ باوجود تعدد موصوفات وحدت موصوف لازم آئیگی، کیونکہ تعدد حقیقی یہ ہے کہ کسی بات میں اشتراک اور وحدت نہ ہو۔ اس صورت میں وصف واحد سب سے صادر ہو، تو کس درجہ میں وحدت ہوگی۔ اور وہی درجہ موصوف بالوصف ہوگا۔ اس لئے درصورت تعدد موصوفات یہ ممکن نہیں کہ وصف واحد سب کے حق میں خانہ زاد ہو۔ لیکن جب دونوں احتمال باطل ہیں، تو پھر یہی ہوگا کہ ایک موصوف مصدر وصف ہو اور باقی موصوفات اس کے دست نگر یعنی ان کا وصف اس کی عطا ہو۔ اور اس وجہ سے وہ سب میں افضل بھی ہو، اور سب کا سردار بھی ہو، اور سب کا خاتم بھی ہو۔ کیونکہ جب اس کو مصدر وصف مانا، تو وصف مذکور اس کا اول اور بدرجہ اتم ہو گا۔ چنانچہ مشاہدہ حال آفتاب و زمین وغیرہ فیض یافتگان آفتاب سے ظاہر ہے۔ اور جب وصف کسی موصوف میں اول اور اتم ہوگا، تو لاجرم اس وصف میں وہ موصوف افضل ہوگا۔ اور چونکہ اور موصوفات میں وہ موصوف مؤثر ہے، کیونکہ اوروں کا وصف اسی کا فیض اور اثر ہے، تو لاجرم اس کو سردار بھی کہنا پڑیگا۔ کیونکہ سردار اسی کو کہتے ہیں، جو اپنے ماتحتوں پر حکم کرے۔ اور سردار ٹھہرے، تو وہ وصف از قسم احکام ہے، یا احکام کے لئے شرط ہے، جیسے علم احکام پر۔ تو پھر اسی کا حکم سب کے احکام سے آخر اور سب کے احکام کا ناسخ ہوگا۔ مگر چونکہ نبوت اور سفارت از قسم اوصاف ہیں۔ اور پھر وصف بھی کیسا منجملہ احکام، کیونکہ خدا کی طرف سے سفارت اور رسالت ہوئی۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں یا احکام ہوتے ہیں یا ثواب و عذاب کے پیام۔ تو لاجرم دین خاتم الانبیاء ناسخ ادیان باقیہ اور خود خاتم الانبیاء سرور انبیاء اور افضل الانبیاء ہوگا۔

(۸) ہر چیز ایک مصرف کے لئے ہوتی ہے، جب تک اس مصرف میں صرف نہ ہو، اس کا ہونا بیکار ہے۔ روٹی پکائیں اور نہ کھائیں، اور پانی لائیں اور نوش جان نہ کریں۔ کس کام کی روٹی اور کس کام کا پانی۔ دین خاتم النبییّن کو دیکھا، تو تمام عالم کے لئے دیکھا۔ وجہ اس کی یہ ہوئی کہ نبی آدم میں حضرت خاتم اس صورت میں بمنزلہ بادشاہ اعظم ہوئے جیسا کہ اس کا حکم تمام اقالیم میں جاری ہوتا ہے۔ ایسا ہی حکم خاتم تمام عالم میں جاری ہونا چاہئے۔ ورنہ اس دین کو لیکر آنا بیکار ہے۔ الغرض حضرت خاتم جیسے بمقابلہ معبود و عبد کامل ہیں، ایسے ہی بمقابلہ دیگر بنی آدم حاکم کامل ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں۔ سب سے افضل ہوئے تو سب پر حاکم بھی ہوں گے۔ اور اس لئے یہ ضرور ہے کہ ان کا حکم سب حکموں کے بعد صادر ہو۔

کیونکہ ترتیب مرافعات سے ظاہر ہے کہ حکم حاکم اعلیٰ سب کے بعد ہوتا ہے۔ پس بدیں وجہ آنحضرتؐ خاتم النبییّن ہیں کہ آپ کی شریعت سب شرائع کے بعد آئی۔

(۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبییّن ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آپ علم خداوندی سے بلا واسطہ مستفیذ ہیں۔ اور علم ہر صفت حاکمہ کا اختتام ہے۔ اور کیوں نہ ہو، ارادہ وقدرت کسی چیز کے ساتھ تب تک متعلق نہیں ہو سکتے، جب تک علم اس سے متعلق نہ ہو چکے۔ اور علم کے لئے دوسرے کسی تعلق کی ضرورت نہیں۔ علم سے اوپر کوئی صفت نہیں۔ جس کو اپنے تعلق کے لئے سوائے موصوف کوئی اور مفعول درکار ہو اور اس کے نیچے جس قدر صفات مثل محبت ومشیت ارادہ قدرت ہیں، وہ بسا اوقات کسی مفعول سے متعلق نہیں ہونے پاتے اور علم اس سے متعلق ہوتا ہے۔ سو جو شخص بذات خود علم خداوندی سے مستفیذ ہو اور اس کے سوا باقی سب علم میں اس کے سامنے ایسے ہوں، جیسا آفتاب کے سامنے قمر و کواکب و ذرات۔ جیسے یہ سب نور میں آفتاب سے مستفیذ ہیں، گو منورات سب کے جدا جدا ہوں۔ ایسے ہی دوسرے سب علم میں اس سے مستفیذ ہوں، گو معلومات میں اس سے علاقہ نہ ہو۔ وہ شخص خاتم النبییّن ہو گا۔ اور سوا اس کے دوسرے انبیاء اس کے تابع اور رتبہ میں اس سے کم۔ کیونکہ جیسے حاکم کا کام اجرا احکام ہوتا ہے، بنی آدم کا کام تعلیم احکام خداوند ملک علام اور ظاہر ہے۔ تعلیم بے علم متصور نہیں۔ سو جیسے حاکم بالا دست مرتبہ حکومت میں اول ہوتا ہے، گو اسکے حکم کی نوبت وقت مرافعہ آخر میں آئے۔ ایسے ہی مبداء علوم اور مصدر کمالات علمیہ ابتداء میں سب سے اول ہوگا۔ گو وقت تعلیم اسکے علوم کی نوبت بعد میں آئے۔

(۱۰) خداتعالیٰ تک پہنچنے کے لئے تمام دروازے بند ہیں، سوائے ایک دروازہ کے، جو قرآن مجید نے کھولا ہے۔ اور تمام نبوتیں اور تمام کتابیں جو پہلے گزر چکی ہیں، ان کی الگ طور پر پیروی کی حاجت نہیں رہی، کیونکہ نبوت محمدیہ ان سب پر مشتمل اور حاوی ہے۔ اور بجز اس کے سب راہیں بند ہیں۔ تمام سچائیاں، جو خدا تک پہنچاتی ہیں، اس کے اندر ہیں۔ نہ اس کے بعد کوئی نئی سچائی آئے گی اور نہ اس سے پہلے کوئی سچائی تھی، جو اس میں موجود نہیں۔ اس لئے اس نبوت پر تمام بنوتوں کا خاتمہ ہے اور ہونا چاہئے تھا، کیونکہ جس چیز کے لئے ایک آغاز ہو، اس کے لیے ایک انجام بھی بالضرور ہوتا ہے۔ لیکن یہ امت محمدیہؐ اپنے ذاتی فیض رسانی سے قاصر نہیں۔ بلکہ سب نبوتوں سے زیادہ اس میں فیض ہے۔ اس نبوت کی پیروی خداتعالیٰ تک بہت سہل طریق سے پہنچاتی ہے۔ اور اس کی پیروی سے خداتعالیٰ کی محبت اور اس کے مکالمہ ومخاطبہ کا اس سے بڑھ کر انعام مل سکتا ہے، جو پہلے ملتا تھا۔ کیونکہ اس میں نبوت تامہ کاملہ محمدیہ کی ہتک نہیں، بلکہ اس نبوت کی چمک اس فیضان سے زیادہ تر ظاہر ہوتی ہے اور ممکن نہ تھا کہ وہ

قوم جس کے لئے فرمایا گیا کہ کُنْتُمْ خَیْرُ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔اور جن کو یہ دعا سکھائی گئی۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔ان کے تمام افراد مخاطبہ و مکالمہ الٰہی کے مرتبہ عالیہ سے محروم رہتے اور کوئی ایک فرد بھی اس مرتبہ کو نہ پاتا۔اس صورت میں صرف یہی خرابی نہ تھی کہ امت محمدیہ ناقص اور ناتمام رہتی اور سب کے سب اندھوں کی طرح رہتے، بلکہ یہ نقص بھی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت فیضان پر داغ لگتا تھا۔اور آپ کی قوت قدسیہ ناقص ٹھہرتی تھی۔اور ساتھ اس کے وہ دعا جس کا پانچ وقت نماز میں پڑھنا تعلیم کیا گیا تھا،اس کا سکھلانا بھی عبث پڑتا تھا۔مگر اس کے ساتھ دوسری خرابی یہ بھی تھی کہ اگر یہ کمال کسی فرد امت کو براہ راست بغیر پیروی نور نبوت محمدیہ کے مل سکتا ہے،تو ختم نبوت کے معنی باطل ہوتے تھے۔پس ان دونوں خرابیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے خدا تعالیٰ نے مکالمہ و مخاطبہ کاملہ تامہ مطہرہ مقدسہ کا شرف ایسے بعض افراد کو عطا کیا، جو فنا فی الرسول کی حالت میں اتم درجہ تک پہنچ گئے اور کوئی حجاب درمیان میں نہ رہا۔اور امتی ہونے کا مفہوم اور پیروی کے معنی اتم اور اکمل درجہ پر ان میں پائے گئے۔ایسے طور پر کہ ان کا وجود اپنا وجود نہ رہا، بلکہ انکے محویت کے آئینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود منعکس ہو گیا۔اور دوسری طرف اتم اور اکمل طور پر مکالمہ الٰہیہ نبیوں کی طرح ان کو نصیب ہوا۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيِّين ۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جسمانی طور سے آپ کی اولاد نرینہ کی نفی بھی کی ہے اور ساتھ ہی روحانی طور پر اثبات بھی کیا ہے کہ روحانی طور سے آپ باپ بھی ہیں۔اور روحانی مخاطبہ اور فیض کا سلسلہ آپ کے بعد جاری رہے گا اور وہ آپ میں سے ہو کر جاری ہوگا، نہ کہ الگ طور سے۔اگر مخاطبہ الٰہی کا دروازہ آنحضرتؐ کے بعد ہر طرح سے بند سمجھا جائے،تو نعوذ باللہ اس سے انقطاع فیض لازم آتا ہے۔اور اس میں نحوست اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتک شان ہوتی ہے۔

(۱۱)ختم نبوت کے یہی معنے ہیں کہ نبوت کی ساری خوبیاں اور کمالات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئے اور آئندہ کے لئے کمالات نبوت کا باب بند ہو گیا کہ کوئی نبی مستقل طور پر نہ آئیگا۔ بلکہ جس قدر کسی کو کمالات حاصل ہوں گے، وہ آنحضرت صلی وللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر حاصل نہیں ہو سکیں گے۔ کیونکہ آنحضرتؐ جامع و خاتم ہیں۔ پس جس قدر کسی کو فیضان الٰہی حاصل ہو گا، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات نبوت کے اندر ہی ہو گا۔اور بدیں لحاظ وہ ختم نبوت کا نقیض نہ ٹھہرے گا۔لہٰذا کوئی شخص جب تک آپ کی امت میں داخل نہ ہو اور آپ کے فیضان سے مستفیض نہ ہو،

وہ خدا سے مکالمہ کا شرف نہیں پا سکتا۔ اگر کوئی شخص بغیر فیضان آنحضرتؐ مستقل نبوت کا دعویدار ہوگا، تو وہ اسلام سے خارج ہے۔

ختم شد برنفس پاکش ہر کمال لا جرم شد ختم ہر پیغمبرے
شد عیاں ازوے علی الوجہ الاتم جوہر انساں کہ بود آں مضمرے
آفتاب ہر زمین و ہر زماں رہبرے ہر اسود و ہر احمرے

سوال۔ بموجب تحریر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی و دیگر اولیائے کرام جب کہ امت محمدیہؐ میں الہام و مکالمہ الٰہی کا دروازہ مفتوح ہے، تو آنحضرتؐ پر نبوت ختم ہونے سے کیا مراد ہے؟

جواب۔ (ا) اس مضمون پر ہم قبل ازیں بڑی بسط سے خامہ فرسائی کر چکے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ نبوت کے تمام کمالات و خوبیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگئیں۔ جو کمالات منفردہ تمام انبیاء میں تھے، وہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع ہوگئے ہیں۔ بدیں وجہ آنحضرت خاتم النبیّن ہیں۔

(۲) دوسرا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نئی شریعت نازل نہیں ہوگی۔ نزول شرائع کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ بدیں معنے بھی نبوت تشریعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوچکی ہے۔ وہ یہ کہ قرآن کریم، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے، اس میں وہ تمام قواعد و ضوابط موجود ہیں، جن کی متقاضی زندگی کی ضروریات مختلفہ ہیں۔ قرآن کریم صرف چند اخلاقی جملوں کا مجموعہ نہیں، نہ یہ چند رسموں کی کتاب ہے۔ اگر یہ ایک طرف ہم کو خدا تعالیٰ کی صفات کاملہ کا پتہ دیتی ہے، تو دوسری طرف ان عظیم الشان صداقتوں پر روشنی ڈالتی ہے، جن میں ملائکہ، الہام، نبوت، قیامت، بہشت، دوزخ وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ ایسا ہی یہ ان اصولوں کی راہنمائی کرتی ہے، جو ہمیں پولیٹیکل، سوشل، اقتصادی اور معاشرت کے امور میں مدد دے سکیں۔ تاکہ تمام نسل انسانی ان قوانین پر چل کر کمالِ حقیقی کو حاصل کرے۔ قرآن کریم کے احکام نماز، روزہ اور قربانیوں تک ہی محدود نہیں، بلکہ اس میں زندگی کا ایک مکمل ضابطہ ہے۔ ایک بادشاہ وقت کے لئے اگر اس میں قانون ہے، جو اس نے امور مملکداری میں برتنا ہے، تو ایسے ہی اس میں اطاعت فرمانروا کی ہدایات بھی ہیں، خواہ وہ اپنی قوم سے ہو یا غیر قوم سے۔ اسی طرح مقنن، ایک مدبر سلطنت، ایک جج، ایک فوجی افسر، ایک سوداگر، ایک اہل حرفہ، ایک بیٹا، ایک باپ، ایک بھائی، ایک خاوند، ایک عورت، ایک ہمسایہ، ایک دوست، ایک دولتمند، ایک مفلس، الغرض ہر ایک انسان، ہر حیثیت اور ہر حالت میں ایسے اصول ہدایت اس کتاب میں دیکھے گا کہ جن پر چل کر وہ سوسائٹی کے لئے مفید بن سکے۔ اس قدیمی مذہب یعنی اسلام نے، جسے پیغمبروں کی جماعت نے وقتاً

فو قتاً تعلیم کیا، اپنی مکمل صورت خدا کی اس کتاب میں پائی، جس کے بعد الہام شریعت بند ہو گیا۔ جیسے قرآن کریم نے فرمایا۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ۔یعنی آج ہم نے تمہارے لئے شریعت کو کامل کر دیا۔ بدیں وجہ تشریعی نبوت کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر خاتمہ ہو گیا، کیونکہ شریعت مکمل ہو گئی۔ لیکن فیضان نبوت یعنی غیر تشریعی نبوت کا خاتمہ نہیں ہوا۔ بلکہ اس کا دامن قیامت تک اس امت میں جاری ہے۔ چنانچہ حضرت امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "الیواقیت والجواہر" جلد دوم صفحہ۲۲ سطر۲ مطبوعہ مصر میں لکھتے ہیں۔ **فان مطلق النبوة لم يرتفع و انما ارتفع نبوة التشريع كما يويده حديث من حفظ القرآن فقد ادرجت النبوة فی جنبيه** ۔ ترجمہ۔ یعنی مطلق نبوت کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ بلکہ نبوت تشریعی بند ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث شریف میں ہے کہ جو قرآن حفظ کرے۔ اسکے دونوں پہلوؤں کے درمیان نبوت درج ہوتی ہے۔ اور پھر وہ لکھتے ہیں **لا نبی بعدی و لا رسول المراد به لا مشرع بعدی**۔ یعنی **لا نبی بعدی** سے یہ مطلب ہے کہ کوئی تشریعی نبی نہیں آئیگا۔

حضرت محی الدین ابن عربی المعروف شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "فتوحات مکیہ" جلد دوم باب ۷۳ صفحہ ۳ مطبوعہ مصر میں لکھتے ہیں۔

فان النبوة التی انقطعت بوجود رسول الله صلی الله عليه وسلم انما هی نبوة التشريع لا مقامها فلا شرع يكون ناسخا لشرعه صلی الله عليه وسلم و لا يزيد فی حكمه شرعاً آخر و هٰذا معنی قولهٖ صلی الله عليه وسلم ان الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدی و لا نبی ای لا نبی بعدی يكون علی شرع يخالف شرعی بل اذا كان يكون تحت حكم شريعتی و لا رسول ای لا رسول بعدی الیٰ احد من خلق الله يشرع يدعوهم اليه فهذا هو الذی انقطع و سد بابه لا مقام النبوة فانه لا خلاف ان عيسیٰ عليه السلام نبی و رسول و انه' لا خلاف انه ينزل فی آخر الزمان حكما مقسطاً عدلاً بشر عنا لا بشرع آخر ۔یعنی وہ نبوت، جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے منقطع ہو چکی ہے، وہ نبوت تشریع ہے۔ آنحضرتؐ کے بعد ایسی نبوت کا مقام نہیں ہوسکتا۔ پس کوئی ایسی شرع نہ ہو سکے گی، جو آنحضرتؐ کی شرع شریف میں کمی بیشی کرے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کلام فیض النیام کا مطلب یہی ہے جو فرمایا کہ رسالت اور نبوت منقطع ہو چکی۔ پس میرے بعد کوئی رسول و نبی نہ ہوگا، جو ایسی شرع کا تابع ہو، جو اس شریعت کے برخلاف ہو۔ بلکہ جب کوئی نبی میرے بعد ہوگا، تو وہ میری ہی شریعت کے تحت میں ہوگا۔ اور فرمایا کہ میرے بعد مخلوق کی طرف

کوئی ایسا رسول نہ آئیگا، جو میری شریعت کے سوا کسی اور شریعت کی طرف لوگوں کو دعوت کرے۔ پس یہی وہ نبوت ہے، جو منقطع ہوگئی اور جس کا دروازہ مسدود ہو چکا اور آئندہ اس کا قیام نہ ہوگا۔ کیونکہ اس بات میں کچھ اختلاف نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی و رسول ہیں اور ان کا نزول آخر زمانہ میں برحق ہے۔ اور وہ اس ہماری شریعت پر ہی حاکم و عادل ہوں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو، جو خاتم الانبیاء فرمایا گیا ہے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ کے بعد دروازہ مکالمات ومخاطبات الٰہیہ کا بند ہے۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ براہ راست خداتعالیٰ سے فیض وحی پانا بند ہے۔ اور یہ نعمت بغیر اتباع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی کو ملنا محال اور ممتنع ہے۔ اور یہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فخر ہے کہ ان کی اتباع میں یہ برکت ہے کہ جب ایک شخص پورے طور پر آپ کی پیروی کرنیوالا ہو، تو وہ خداتعالیٰ کے مکالمات اور مخاطبات سے مشرف ہو جائے۔ ایسا نبی کیا عزت اور کیا مرتبت اور کیا تاثیر اور کیا قوت قدسیہ اپنی ذات میں رکھتا ہے، جس کی پیروی کرنے والے صرف اندھے اور نابینا ہوں۔ اور خداتعالیٰ اپنے مکالمات و مخاطبات سے اس کی آنکھیں نہ کھولے۔ یہ کس قدر لغو اور باطل عقیدہ ہے کہ ایسا خیال کیا جائے کہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وحی الٰہی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہے۔ اور آئندہ کو قیامت تک اس کی کوئی بھی امید نہیں۔

اولیائے کرام کے ساتھ مکالمہ الٰہی کا وسیلہ وواسطہ

کتاب "فتح الربانی" کی ۵۳مجلس میں لکھا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے سوال کیا کہ انبیاء کی طرف خداتعالیٰ کا رسول جبرئیل فرشتہ آتا ہے اور اولیاء کی طرف اس کا کون رسول آتا ہے۔ جواب میں فرمایا کہ ان کا بھی بلاواسطہ وہی رسول ہے۔ دیکھو "تحفہ سبحانی "۲۶۸مطبوعہ جھجر اور "فتح ربانی" مطبوعہ مصر مجلس ۵۳۔ واضح ہو کہ جبرئیلی نور کا چھیالیسواں حصہ تمام جہاں میں نور آفتاب کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ پس جو مقام نور آفتاب کے سامنے ہو، وہاں روشنی کامل طور پر ضرور پڑتی ہے۔ اور جہاں حجاب ہو، وہاں کم پہنچتی ہے۔ یہی حال مکالمہ الٰہی کا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اِنَّ رُؤْيَا الْـمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَ اَرْبَعِيْنَ جُزْءً مِنَ النَّبُوَّةِ ۔ترجمہ۔یعنی مومن کا خواب نبوت کے چھیالیسویں حصہ میں سے ایک حصہ ہے۔ اب اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو وجود نبوت کلیہ کا واسطہ ہے، وہی وجود نبوت جزویہ کا واسطہ بھی ہے، سو وہ جبرئیل ہے۔ کیونکہ نبوتوں کا مؤکل جبرئیل اور اس کے اعوان ہیں اور ارزاق کا مؤکل میکائیل اور اس کے اعوان ہیں۔ اور مارنے اور ہلاک کرنے کا مؤکل ملک الموت اور اس کے اعوان ہیں۔ اور زندہ کرنے کا مؤکل اسرافیل اور اس

کے اعوان ہیں۔ ہر کسے را بہر کارے ساختند

رب العرش یعنی خدا تعالیٰ کا صاحب تخت ہونیکی حقیقت

قرآن مجید میں جو رب العرش آیا ہے، یعنی خدا تعالیٰ صاحب تخت ہے، اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ جسمانی ہے اور عرش کا محتاج ہے۔ بلکہ عرش سے مراد وہ مقدس بلندی کی جگہ ہے، جو اس جہان اور اس آنے والے جہان سے برابر نسبت رکھتی ہے۔ اور خدا تعالیٰ کو عرش پر کہنا درحقیقت ان معنوں میں ہے کہ وہ مالک الکونین ہے۔ اور جیسا کہ ایک شخص اونچی جگہ پر بیٹھ کر یا کسی نہایت ہی اونچے محل پر چڑھ کر ہمیں اپنی نظر میں رکھتا ہے۔ ایسا ہی استعارہ کے طور پر خدا تعالیٰ کو بلند سے بلند تخت پر تسلیم کیا گیا ہے، جس کی نظر سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں، نہ اِس عالم کی اور نہ اُس عالم کی۔ ہاں اس لفظ کے مفہوم کو عام فہموں کے لئے اوپر کی طرف بیان کیا جاتا ہے، کیونکہ جب خدا تعالیٰ حقیقت میں سب سے اوپر ہے اور ہر ایک چیز اس کے پیروں میں گری ہوئی ہے، تو اوپر کی طرف کو اس کی ذات سے نسبت ہے۔ مگر اوپر کی طرف وہی ہے، جس کے نیچے دونوں عالم واقع ہیں۔ اور وہ ایک انتہائی نقطہ کی طرح ہے، جس کے نیچے دو عظیم الشان عالموں کی دو شاخیں نکلتی ہیں۔ اور ہر ایک شاخ ہزار ہا عالم پر مشتمل ہے۔ جن کا علم بجز اس ذات کے کسی کو نہیں، جو اس نقطہ انتہائی پر مستوی ہے، جس کا نام عرش ہے۔ اس لئے ظاہری طور پر بھی وہ اعلیٰ سے اعلیٰ بلندی جو اوپر کی سمت میں اس انتہائی نقطہ میں متصور ہو، جو دونوں عالموں کے اوپر ہے۔ وہی عرش کے نام سے عند الشرع موسوم ہے۔ اور یہ بلندی باعتبار جامعیت باری تعالیٰ کے ہے تا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ مبداء ہے ہر ایک فیض کا، اور مرجع ہے ہر ایک چیز کا، اور مسجود ہے ہر ایک مخلوق کا، اور سب سے اونچا ہے اپنی ذات میں اور کمالات میں۔ ورنہ قرآن شریف فرماتا ہے کہ وہ ہر ایک جگہ پر ہے، جیسا کہ فرمایا۔ اَیْنَمَا تَوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ ۔ یعنی تم جدھر منہ پھیرو، ادھر ہی خدا کا منہ ہے۔ اور فرماتا ہے۔ هُوَ مَعَكُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ ۔ یعنی وہ تمہارے ساتھ ہے، جہاں بھی تم ہو۔ اور فرماتا ہے۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۔ یعنی ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

خدا تعالیٰ کا عرش پر قرار پکڑنے کا راز

خدا تعالیٰ نے عاجز انسانوں کو اپنی کامل معرفت کا علم دینے کیلئے اپنی صفات کو قرآن شریف میں دو رنگوں میں ظاہر فرمایا ہے۔ اول اس طور پر، جس سے اسکی صفات استعارہ کے طریق پر مخلوق کی صفات کی ہمشکل ہیں۔ جیسا کہ وہ کریم اور رحیم ہے، محسن ہے اور غضب بھی رکھتا ہے۔ اور اس میں محبت

بھی ہے اور اسکے ہاتھ بھی ہیں اور اسکی آنکھیں بھی ہیں اور اسکی ساقیں بھی ہیں اور اسکے کان بھی ہیں۔

چونکہ خدا نے انسان کو پیدا کر کے اپنی ان تشبیہی صفات کو اس پر ظاہر کیا، جن میں وہ انسان کے ساتھ بظاہر شرکت رکھتا ہے، جیسے خالق ہونا، کیونکہ انسان بھی اپنی حد تک بعض چیزوں کا خالق یعنی موجد ہے۔ ایسا ہی انسان کو کریم بھی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی حد تک قوت رحم بھی اپنے اندر رکھتا ہے اور قوت غضب بھی اس میں ہے۔ اور ایسا ہی آنکھ کان وغیرہ سب انسان میں موجود ہیں۔ پس ان تشبیہی صفات سے کسی کے دل میں شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ گویا انسان ان صفات میں خدا سے مشابہ ہے اور خدا انسان سے۔ اس لئے خدا نے ان صفات کے مقابل پر قرآن شریف میں اپنی تنزیہی صفات کا بھی ذکر کر دیا، یعنی ایسی صفات کا، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی ذات اور صفات میں کچھ بھی شراکت انسان کے ساتھ نہیں اور نہ انسان کو اس کے ساتھ کچھ مشارکت ہے۔ نہ اس کا خلق یعنی پیدا کرنا انسان کے خلق کی طرح ہے اور نہ اس کا رحم انسان کے رحم کی طرح ہے اور نہ اس کا غضب انسان کے غضب کی طرح ہے اور نہ اس کی محبت انسان کی محبت کی طرح ہے اور نہ وہ انسان کی طرح کسی مکان کا محتاج ہے۔ اور یہ ذکر خدا کا اپنی صفات میں انسان سے بالکل علیحدہ ہونا قرآن شریف کی کئی آیات میں تصریح کے ساتھ کیا گیا ہے، جیسا کہ اس آیت میں۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْئٌ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْر۔ یعنی کوئی چیز اپنی ذات اور صفات میں خدا کی شریک نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ پس آیت کریمہ ذیل میں جو خدا تعالیٰ کا عرش پر قرار پکڑنا مراد نکلتا ہے، اس سے مراد انسانوں جیسا قرار پکڑنا نہیں ہے۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ۔ یعنی تمہارا پروردگار وہ خدا ہے، جس نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر اس نے عرش پر قرار پکڑا۔ یعنی اس نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے پیدا کر کے اور تشبیہی صفات کا ظہور فرما کر پھر تنزیہی صفات کے ثابت کرنے کے لئے مقام تنزہ اور تجرد کی طرف رخ کیا، جو وراء الورا مقام اور مخلوق کے قرب و جوار سے دور تر ہے۔ وہی بلند تر مقام ہے، جس کو عرش کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ پہلے تو تمام مخلوق حیز عدم میں تھی اور خدا تعالیٰ وراء الورا مقام میں اپنی تجلیات ظاہر کر رہا تھا، جس کا نام عرش ہے۔ یعنی وہ مقام جو ہر ایک مقام سے بلند تر اور برتر ہے۔ اور اس کا ظہور اور پرتو تھا اور اس کی ذات کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر اس نے زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے پیدا کیا۔ اور جب مخلوق ظاہر ہوئی تو پھر اس نے اپنے تئیں مخفی کر لیا اور چاہا کہ وہ ان مصنوعات کے ذریعہ شناخت کیا جائے۔

الغرض خدا تعالیٰ سب سے برتر اور تمام مخلوقات سے وراء الورا مقام پر ہے، جس کو شریعت کی اصطلاح میں عرش کہتے ہیں۔ اور عرش کوئی مخلوق چیز نہیں ہے، صرف وراء الورا مرتبہ کا نام ہے، نہ یہ کہ کوئی ایسا تخت ہے، جس پر خدا تعالیٰ کو انسان کی طرح بیٹھا ہوا تصور کیا جائے۔ بلکہ جو مخلوق سے بہت دور اور تنزہ اور تقدس کا مقام ہے، اس کو عرش کہتے ہیں، جیسا کہ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ خالقیت اور مخلوقیت کا تعلق قائم کر کے پھر عرش پر قائم ہو گیا یعنی تمام تعلقات کے بعد الگ کا الگ رہا اور مخلوق کے ساتھ مخلوط نہیں۔

قرآن شریف میں لفظ عرش کا جہاں جہاں استعمال ہوا ہے، اس سے مراد خدا کی عظمت اور جبروت اور بلندی ہے۔ پس درحقیقت استویٰ علی العرش کے یہ معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے جب دنیا کو پیدا کر دیا اور اس کی صفات ظہور میں آ گئیں، تو خدا تعالیٰ ان معنوں سے اپنے عرش پر پوری وضع استقامت سے بیٹھ گیا کہ کوئی صفت صفات لازمہ الوہیت سے باہر نہیں رہی اور تمام صفات کی پوری پوری تجلی ہو گئی، جیسا کہ جب اپنے تخت پر بادشاہ بیٹھتا ہے، تو تخت نشینی کے وقت اس کی ساری شوکت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک طرف شاہی ضرورتوں کیلئے طرح طرح کے سامان تیار ہونیکا حکم ہوتا ہے اور وہ فی الفور ہو جاتے ہیں اور وہی حقیقت ربوبیت عامہ ہیں۔ دوسری طرف خسروانہ فیض سے بغیر کسی عمل کے حاضرین کو جود و سخا سے مالا مال کیا جاتا ہے۔ تیسری طرف جو لوگ خدمت کر رہے ہیں، ان کو مناسب چیزوں سے اپنی خدمات بجالانے کے لئے مدد دی جاتی ہے۔ چوتھی طرف جزا و سزا کا دروازہ کھولا جاتا ہے۔ کسی کی گردن ماری جاتی ہے اور کوئی آزاد کیا جاتا ہے۔ یہ چار صفتیں تخت نشینی کیلئے ہمیشہ لازم حال ہوتی ہیں۔ پس خدا تعالیٰ کا ان ہر چہار صفتوں کو دنیا میں نافذ کرنا گویا تخت پر بیٹھنا ہے، جس کا نام عرش ہے۔

دنیا میں خدا تعالیٰ کے عرش کو چار اور قیامت میں آٹھ فرشتوں کے اٹھانے کا بھید

بعض نادان آریہ اعتراض کرتے ہیں کہ خدا عرش پر بیٹھا ہوا ہے اور چار فرشتوں نے اس کے تخت کو اٹھایا ہوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا محدود ہے اور قائم بالذات نہیں۔ اور جب محدود ہے، تو اس کا علم بھی محدود ہوگا۔

اَلْعَرْشُ اللہِ بِالرَّحْمٰنِ مَحْمُوْلٌ وَ حَامِلُوْہُ و ھٰذَالْقَوْلُ مَعْقُوْلٌ

وَ اَیّ حَوْلٍ لِمَخْلُوْقٍ وَ مَقْدِرَۃٌ اَنْ یَّحْمَلُوْہُ وَ جَآءَ بِہٖ عَقْلٌ وَ تَنْزِیْلٌ

ترجمہ۔ عرش اور اس کے حاملین کا خدا تعالیٰ ہی حامل ہے۔ خدا کی مخلوق کو کیا طاقت اور قدرت ہے کہ خدا کو اٹھا سکے۔ اسی پر عقل اور قرآن کی گواہی آئی ہے۔ صاحب "فتوحات مکیہ" ابن عربی رحمۃ

اللہ علیہ لکھتے ہیں۔ان العرش فی لسان العرب یطلق و یراد به الملک یقال ثل عرش الملک اذا دخل فی ملکه خلل و یطلق و یراد به السریر فاذا کان العرش عبارة عن الملک فتکون حملته هم القائمون به و اذا کان العرش السریر فتکون حملته ما یقوم علیه من القوائم و من یحمله علی کواهلهم۔یعنی عرش عربی زبان میں بادشاہی اور ملک کو کہتے ہیں۔مثلاً کہتے ہیں کہ بادشاہ کے ملک خلل پذیر ہوگیا۔ یہ اس وقت کہتے ہیں کہ جب کہ اس کی بادشاہی میں خلل واقع ہوجائے۔اور کبھی عرش سے مراد تخت ہوتا ہے۔جب عرش سے مراد بادشاہی ہو،تو اس کے حاملین سے مراد مدبرین امور سلطنت ہوتے ہیں۔اور جب عرش سے مراد تخت ہو،تو اس کے حاملین سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں، جواس کو اپنے کندھوں پر اٹھاتے ہیں۔

عرش کوئی جسمانی اور مخلوق چیز نہیں ہے، جس پر خدا بیٹھا ہے۔تمام قرآن شریف کو اول سے لے کر آخر تک پڑھو، اس میں ہرگز نہیں پاؤ گے کہ عرش بھی کوئی چیز ہے اور مخلوق ہے۔خدا نے بار بار قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ ہر ایک چیز جو کوئی وجود رکھتی ہے، اس کا میں ہی پیدا کرنیوالا ہوں۔میں ہی زمین و آسمان اور روحوں اور ان کی تمام قوتوں کا خالق ہوں۔میں اپنی ذات میں آپ قائم ہوں۔اور ہر ایک چیز میرے ساتھ قائم ہے۔ ہر ایک ذرہ اور ہر ایک چیز، جو موجود ہے، وہ میری ہی پیدا کردہ ہے۔ مگر کہیں نہیں فرمایا کہ عرش بھی کوئی جسمانی چیز ہے، جس کا میں پیدا کرنیوالا ہوں۔اس اعتراض کی بنیاد تو محض اس بات پر ہے کہ عرش کوئی علیحدہ چیز ہے، جس پر خدا بیٹھا ہے۔اور جب یہ امر ثابت نہ ہوسکا، تو کچھ اعتراض نہ رہا۔

قرآن شریف میں یہ کہیں بھی نہیں لکھا کہ خدا کو کوئی فرشتہ اٹھا رہا ہے، بلکہ جا بجا لکھا ہے کہ خدا ہر ایک چیز کو اٹھا رہا ہے۔ہاں بعض جگہ یہ استعارہ مذکور ہے کہ خدا کے عرش کو، جو دراصل کوئی مجسم چیز نہیں ہے، فرشتے اٹھا رہے ہیں، دانشمند اس جگہ سے سمجھ سکتا ہے کہ جب کہ عرش کوئی مجسم چیز نہیں اور مخلوق نہیں، تو فرشتے کس چیز کو اٹھا رہے ہیں۔ضرور یہ کوئی استعارہ ہوگا۔

وَ رَبُّ الْعَرْشِ فَوْقَ الْعَرْشِ لَاکِنْ بِلَاوَصْفِ التَّمَکُّنِ وَ اتِّصَالِ
وَ مَا التَّشْبِیْہِ لِلرَّحْمٰنِ وَجْهًا فَصُنْ عَنْ ذَاکَ اَصْنَافَ الْاَهَالِ

ترجمہ۔اور عرش کا مالک عرش کے اوپر تو ہے، مگر بدوں وصف استقرار اور اتصال کے ہے۔اور خدا کو کسی چیز سے تشبیہ دینا درست نہیں۔پس ان عقائد سے علمائے اسلام کے گروہوں کو بچا کر رکھو۔
خدا تعالیٰ کی چار صفتیں ہیں، جن سے ربوبیت کی پوری شوکت نظر آتی ہے۔اور کامل طور پر چہرہ

اس ذات ازلی ابدی کا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ کے ان چہار صفتوں کو سورہ فاتحہ میں بیان کر کے اپنی ذات کو معبود قرار دینے کے لئے ان لفظوں سے لوگوں کو اقرار کرنیکی ہدایت دی ہے۔ کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۔یعنی اے وہ خدا، جو ان چار صفتوں سے موصوف ہے، ہم خاص تیری ہی پرستش کرتے ہیں۔ کیونکہ تیری ربوبیت تمام عالموں پر محیط ہے اور تیری رحمانیت بھی تمام عالموں پر محیط ہے اور تیری رحیمیت بھی تمام عالموں پر محیط ہے۔ اور تیری صفت مالکانہ جزاوسزا کی بھی تمام عالموں پر محیط ہے اور تیرے اس حسن اور احسان میں بھی کوئی شریک نہیں۔ اس لئے ہم تیری عبادت میں بھی کسی کو شریک نہیں کرتے۔

اب واضح ہو کہ خدا تعالیٰ نے اس سورۃ میں ان چار صفتوں کو اپنی الوہیت کا مظہر اتم قرار دیا ہے۔ اور اس لئے صرف اس قدر ذکر سے یہ نتیجہ مرتب کیا ہے کہ ایسا خدا کہ یہ چار صفتیں اپنے اندر رکھتا ہے، وہی لائق پرستش ہے۔ اور درحقیقت یہ صفتیں بہر وجہ کامل ہیں۔ اور ایک دائرہ کے طور پر اپنی الوہیت کے تمام لوازم اور شرائط پر محیط ہیں۔ کیونکہ ان صفتوں میں خدا کی ابتدائی صفات کا بھی ذکر ہے۔ اور درمیانی زمانہ کی رحمانیت اور رحیمیت کا بھی ذکر ہے۔ اور پھر آخری زمانہ کی صفت مجازات کا بھی ذکر ہے۔ اور اصولی طور پر کوئی فعل اللہ تعالیٰ کا ان چار صفتوں سے باہر نہیں ہے۔ پس یہ چار صفتیں خدا تعالیٰ کی پوری صورت دکھلاتی ہیں۔

حقیقتِ استویٰ علی العرش

ہم لکھ چکے ہیں کہ درحقیقت استویٰ علی العرش کے یہی معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی یہ صفات جب دنیا کو پیدا کر کے ظہور میں آ گئیں، تو خدا تعالیٰ ان معنوں میں اپنے عرش پر پوری وضع استقامت سے بیٹھ گیا کہ کوئی صفت صفات لازمہ الوہیت سے باہر نہیں رہی اور تمام صفات کی پوری طور پر تجلّی ہو گئی، جیسا کہ جب بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھتا ہے، تو تخت نشینی کے وقت اسکی ساری شوکت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک طرف شاہی ضرورتوں کیلئے طرح طرح کے سامان تیار ہونیکا حکم ہوتا ہے اور وہ فی الفور ہو جاتے ہیں اور وہی حقیقت ربوبیت عامہ ہیں۔ دوسری طرف خسروانہ فیض سے بغیر کسی عمل کے حاضرین کو جود وسخا سے مالا مال کیا جاتا ہے۔ تیسری طرف جو لوگ خدمت کر رہے ہیں، ان کو مناسب چیزوں سے اپنی خدمات کے انجام کے لئے مدد دی جاتی ہے۔ چوتھی طرف جزاوسزا کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ کسی کی گردن ماری جاتی ہے اور کوئی آزاد کیا جاتا ہے۔ یہ چار صفتیں تخت نشینی کے ہمیشہ لازم حال ہوتی ہیں۔ پس خدا تعالیٰ کا ان ہر چہار صفتوں کو دنیا میں نافذ کرنا گویا تخت پر بیٹھنا ہے۔

عرش کی نسبت مخلوق اور غیر مخلوق کا جھگڑا عبث ہے۔ احادیث سے اس کا جسم کہیں ثابت نہیں ہوتا۔ ایک قسم کے علو کے مقام کا اظہار عرش کے لفظ سے کیا گیا ہے۔ اگر اسے جسم کہو گے، تو پھر خدا تعالیٰ کو بھی مجسم کہنا پڑے گا۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ یاد رکھنا چاہئے کہ اس کو علو جسمانی نہیں کہ جس کا تعلق جہات سے ہو، بلکہ یہ روحانی علو ہے۔ عرش کی نسبت مخلوق اور غیر مخلوق کی بحث بھی ایک بدعت ہے، جو کہ پیچھے ایجاد کی گئی۔ صحابہؓ نے اس کو مطلق نہیں چھیڑا۔ لیکن اب جب کہ اسلام کے مخالفوں نے خود اس بات کو چھیڑ دیا ہے، تو بالضرور اس پر لکھنا پڑے گا۔

واضح رہے کہ عرش کے اصل معنے اس وقت سمجھ میں آ سکتے ہیں، جبکہ خدا تعالیٰ کی دوسری صفات پر بھی ساتھ کے ساتھ نظر ہو۔ یہ ایک استعارہ ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اعلیٰ درجہ کی بلندی کو بیان کیا ہے۔ یعنی ایک ایسا مقام کہ جو ہر ایک جسم اور ہر ایک نقص سے پاک ہے۔ اور اس کے مقابلہ پر یہ دنیا اور تمام عالم ہے کہ جس کی انسان کو پوری پوری خبر بھی نہیں ہے۔ ایسے مقام کو قدیم کہا جا سکتا ہے۔ لوگ اس بارے میں حیران ہیں اور غلطی سے اسے ایک مادی شے خیال کرتے ہیں۔ اور قدامت کے لحاظ سے جو اعتراض "ثم" کا آتا ہے، تو یہ بات ہے کہ قدامت میں "ثم" آ جاتا ہے، جب قلم ہاتھ میں ہوتا ہے، تو جیسے قلم حرکت کرتا ہے، ویسے ہی ہاتھ حرکت کرتا ہے۔ مگر ہاتھ کو تقدم حاصل ہے۔

آریہ لوگ خدا کی قدامت کے متعلق اہل اسلام پر اعتراض کرتے ہیں کہ ان کا خدا چھ سات ہزار برس سے چلا آتا ہے۔ یہ آریوں کی غلط فہمی ہے۔ اس مخلوق کو دیکھ کر خدا کی عمر کا اندازہ کرنا نادانی ہے۔ ہمیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ آدم سے پہلے کیا تھا اور کس قسم کی مخلوق تھی۔ اس وقت کی بات وہی جانے۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَانٍ ۔ وہ اور اس کی صفات قدیم سے ہیں، مگر اس پر یہ لازم نہیں ہے کہ ہر ایک صفت کا علم ہمیں دیدے۔ اور نہ اس کے کام اس دنیا میں سما سکتے ہیں۔ خدا کے کلام پر دقیق نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ازلی اور ابدی ہے اور مخلوقات کی ترتیب اس کے ازلی ہونے کی مخالف نہیں ہے۔ اور استعارات کو ظاہر پر حمل کر کے مشہودات پر لانا بھی ایک نادانی ہے۔ اس کی صفت ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَار وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَار ۔ ہم عرش و استوا اور اس کی حقیقت اور کنہ کو خدا کے حوالے کرتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے ہیں۔

جب دنیا نہ تھی، تب بھی عرش تھا، جیسے لکھا ہے۔ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَاءِ (اسکا عرش پانی پر تھا) اس کے متعلق خوب سمجھ لینا چاہئے کہ یہ ایک مجہول الکنہ امر ہے اور خدا کی تجلی کی طرف اشارہ ہے، جو خلق السمٰوٰت والارض چاہتی تھی۔ اس لئے اول آسمان اور زمین کو پیدا کرنے کے بعد وہ

استوا علی العرش ہوا یعنی عرش پر متمکن ہوا۔توریت میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے، کہ خدا ماندہ ہو کر تھک گیا۔اس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک انسان کسی کام میں مصروف ہوتا ہے، تو اس کے چہرے اور خدوخال وغیرہ دیگر اعضاء کا پورا پورا پتہ نہیں لگتا۔مگر جب وہ فارغ ہو کر ایک تخت یا چارپائی پر آرام کی حالت میں ہو، تو اس کے ہر ایک عضو کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔اسی طرح استعارہ کے طور پر خدا تعالیٰ کی صفات کے ظہور کو ثم استویٰ علی العرش سے بیان کیا گیا کہ آسمان اور زمین کو پیدا کرنے کے بعد صفات الٰہیہ کا ظہور ہوا۔اس کی صفات ازلی ابدی ہیں، مگر جب مخلوق ہو، تو خالق کو شناخت کرے اور محتاج ہو، تو رزاق کو پہچانے۔اسی طرح اس کے علیم اور قدر مطلق ہونے کا پتہ چلتا ہے۔اور ثم استویٰ علی العرش میں خدا تعالیٰ کی اس تجلی کی طرف اشارہ ہے، جو خلق السموات والارض کے بعد ہوئی۔

اسی طرح اس تجلی کے بعد ایک اور تجلی ہوگی، جب کہ ہر شے فنا ہوگی۔پھر ایک تیسری تجلی ہوگی، جو احیائے اموات ہے۔غرضیکہ یہ ایک لطیف استعارہ ہے، جس کے اندر داخل ہونا روا نہیں ہے۔صرف ایک تجلی سے اسے تعبیر کر سکتے ہیں۔قرآن شریف سے پتہ لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے عرش کو اپنی صفات میں داخل کیا ہے، جیسے فرمایا ذو العرش المجید۔گویا خدا تعالیٰ کے کمال علو کو دوسرے معنوں میں عرش سے بیان کیا ہے۔اور وہ کوئی مادی شے نہیں ہے۔وگرنہ زمین اور آسمان وغیرہ کی طرح عرش کی پیدائش کا بھی ذکر ہوتا۔اس لئے شبہ گزرتا ہے کہ ہے تو شے، مگر غیر مخلوق ہے۔اور یہاں سے دھوکہ کھا کر انسان آریوں کی طرح، جو خدا کے وجود کی طرح اور اشیاء کو غیر مخلوق مانتے ہیں، ویسے ہی یہ عرش کو ایک شے غیر مخلوق جز از خدا ماننے لگتا ہے۔یہ گمراہی ہے۔اصل میں یہ شے خدا کے وجود سے باہر نہیں ہے۔جن لوگوں نے اسے ایک مخلوق شے قرار دیا ہے، وہ بھی اسے اتم اور اکمل نہیں مانتے۔

دنیا میں خدا کے عرش کو چار فرشتوں کے اٹھانے کی حقیقت

اب رہی یہ بات کہ اس کے کیا معنی ہیں کہ اس تخت کو چار فرشتے اٹھا رہے ہیں اور قیامت میں آٹھ آٹھائیں گے۔اس کا جواب یہ ہے کہ ان چار صفتوں پر چار فرشتے موکل ہیں، جو دنیا پر خدا تعالیٰ کی یہ صفات ظاہر کرتے ہیں۔اور ان کے تحت چار ستارے ہیں، جو چار رب النوع کہلاتے ہیں، جن کو وید میں دیوتا کے نام سے پکارا گیا ہے۔بس وہ ان چار صفتوں کی حقیقت کو دنیا میں پھیلاتے ہیں، گویا اس روحانی تخت کو اٹھا رہے ہیں۔یہ چاروں صفات خدا تعالیٰ کے عرش کو اٹھا رہی ہیں، یعنی خادموں کی طرح ان صفات الٰہی کو اپنے آئینوں میں ظاہر کر رہی ہیں۔اور عرش سے مراد لوازم صفات تخت نشینی ہیں۔

(۱) الغرض یہ چار دیوتے (اکاش۔سورج۔چاند۔دھرتی) خدا کے عرش کو، جو صفت ربوبیت

اور رحمانیت اور رحیمیت اور مالک یوم الدین ہے، اٹھارہے ہیں۔اس جگہ فرشتوں سے مراد یہ چار دیوتے ہیں، جو خدا تعالیٰ کی چار صفتوں کو اٹھارہے ہیں۔یہ وہی صفتیں ہیں، جن کو دوسرے لفظوں میں عرش کہا گیا ہے۔

(۲) قرآنی اصطلاح کی رو سے ان کا نام فرشتے بھی ہے۔ان دیوتوں پر دوسری طاقتیں مسلط ہیں، جو ملائک کے نام سے موسوم ہیں، جو ان دیوتاؤں کی طاقتوں کو قائم رکھتے ہیں، جن میں سے کسی کو زبان شرع میں جبریل کہتے ہیں اور کسی کو میکائیل اور کسی کو عزرائیل اور کسی کو اسرافیل۔فرشتہ کا لفظ قرآن شریف میں عام ہے۔ہر ایک چیز، جو خدا کی آواز سنتی ہے، وہ اس کا فرشتہ ہے۔پس دنیا کا ذرہ ذرہ خدا کا فرشتہ ہے، کیونکہ وہ اس کی آواز سنتا ہے اور اس کی فرمانبرداری کرتا ہے۔اگر ذرہ ذرہ اس کی آواز نہیں سنتا، تو خدا تعالیٰ نے زمین وآسمان کو کس طرح پیدا کیا۔اگر یہ چیزیں شنوانہ ہوتیں، تو تجربہ ومشاہدہ اس کے برعکس ہوتا۔حضرت نوح وموسیٰ وابراہیم علیہم السلام کے دوستوں اور دشمنوں میں ان اشیاء نے کس طرح تمیز کر کے ایک کو پکڑا اور دوسرے کو چھوڑ دیا۔

عرش کو جنہوں نے مادی مانا ہے، وہ گمراہی پر ہیں، کیونکہ وہ خدا کو ایک مجسم شے کا محتاج مانتے ہیں کہ ایک ڈولے کی طرح فرشتوں نے اسے اٹھایا ہوا ہے۔**و لا یؤدہ حفظهما** اس کی صفت ہے۔ چار ملائک کا عرش کو اٹھانا بھی ایک استعارہ ہے۔رب، رحمٰن، رحیم اور مالک یوم الدین یہ چار صفات الٰہی کے مظہر ہیں اور اصل میں ملائکہ ہیں۔اور ایسی صفات جب زیادہ جوش سے کام میں ہوں گی، تو ان کو آٹھ ملائکہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔جو شخص اسے بیان نہ کر سکے، وہ یہ کہے کہ یہ ایک مجہول الکنہ حقیقت ہے۔ ہمارا اس پر ایمان ہے اور حقیقت کو خدا کے سپرد کرے۔اطاعت کا طریق یہی ہے۔خدا کی تجلیات ثلاثہ کی طرف اشارہ ہے۔**کان عرشه علی الماء** ۔یہ بھی ایک تجلی تھی۔اور الماء کے معنے پانی بھی نہیں کر سکتے۔خدا کو معلوم ہے کہ اس کے نزدیک الماء کے کیا معنی ہیں۔اس کی کنہ خدا کو معلوم ہے۔جنت کی نعماء پر بھی ایسا ہی ایمان ہے۔وہاں یہ تو نہ ہوگا کہ بہت سی گائیں اور بھینسیں ہوں گی اور دودھ کو دوہ کر حوض میں ڈالا جائے گا۔خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ اشیاء ہیں کہ جو نہ آنکھوں نے دیکھیں اور نہ کانوں نے سنیں اور نہ زبان نے چکھیں، نہ دل میں ان کے فہم کا مادہ ہے، حالانکہ ان کو دودھ اور شہد وغیرہ لکھا گیا ہے، جو سب آنکھوں سے نظر آتے ہیں اور ہم ان کو پیتے ہیں۔اسی طرح کئی باتیں ہیں جن کو ہم خود دیکھتے ہیں، مگر الفاظ نہیں ملتے کہ ان کو بیان کر سکیں۔اور نہ ہی ہم ان کو بیان کرنے پر قادر ہیں۔یہ ایسی باتیں ہیں کہ اگر ان کو مادی دنیا پر قیاس کریں، تو صدہا اعتراض پیدا ہوتے ہیں۔**من کان فی هذہ اعمیٰ فهو**

فی الآخرۃ اعمیٰ ۔(جواس دنیامیں اندھاہے،وہ آخرت میں بھی اندھاہوگا) دیدار کاوعدہ یہاں پربھی ہے۔مگراسے جسمانیت پرحمل نہیں کرسکتے۔

دیدارِالٰہی

خدا کے دیکھنے والی آنکھیں اوراس کے دریافت کرنے والے حواس اس جہان میں ملتے ہیں، جس کواس جہان میں نہیں ملے، وہ اس کواگلے جہان میں بھی نہیں ملیں گے۔راست باز ہیں، جوقیامت کے دن خدا کودیکھیں گے(۱) وہ اس جگہ سے دیکھنے والے حواس لے جائیں گے۔اسی کی طرف اللہ جل

....

حاشیہ۔(۱) قال اللہ تعالیٰ۔وَجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَاضِرَۃ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃ۔یعنی قیامت کے دن بہت سے منہ تروتازہ ہوں گےاوروہ اپنے پروردگارکودیکھنے والے ہوں گے۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انکم سترون ربکم مثل ھذا القمر لا تضامون فی رویتہ فان استعطعتم ان تغلبوا علی صلوۃ قبل طلوع الشمس و صلوۃ قبل غروبھا فافعلوا ۔ترجمہ۔نبی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ تم قیامت میں اپنے پروردگارکواس چاندکے دیکھنے کی طرح دیکھوگے۔تمہیں اپنے پروردگارکے دیکھنے میں کوئی ازدحام ومزاحمت نہ ہوگی ۔پس جہاں تک تم سے ہوسکے،سورج چڑھنے سے پہلے کی نمازوں اورسورج ڈوبنے سے پہلے کی نمازوں میں غفلت وسستی نہ کرو۔مغلوب نہ ہوجاؤاورہوشیاررہ کران نمازوں کوحسب فرمودہ خداوندتعالیٰ اداکرو۔عن جابر بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بینا اھل الجنۃ فی انفسھم اذ سطح لھم نور فرفعوا رؤسھم فاذ الرب قد اشرف علیھم من فوقھم فقال السلام علیکم یا اھل الجنۃ. قال و ذالک قول اللہ سلام قولا من رب الرحیم قال فینظر الیھم و ینظرون الیہ فلا یلتفتون الی شئی من الیھم ما داموا ینظرون الیہ حتی یحتجب عنھم نورہ و برکتہ علیھم فی دیارھم. ترجمہ۔جابربن عبداللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہشتی لوگ اپنے خیال میں ہوں گے کہ ان کے لئے یکا یک ایک نور چمکے گا۔پس وہ اپنے سراٹھائیں گے کہ ناگہاں اللہ تعالیٰ ان پراپنا جلوہ فرمائے گااوران کوفرمائیگا کہ اے اہل بہشت السلام علیکم۔پھرنبی علیہ السلام نے فرمایا کہ یہی فرمانا اللہ تعالیٰ کا کہ خدائے مہربان کی طرف سے سلام ہے۔پھرنبی علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف دیکھے گااوروہ خداتعالیٰ کی طرف دیکھیں گے۔پس وہ بہشت کی کسی دوسری چیز کی طرف التفات نہ کریں گے، جب تک وہ خداتعالیٰ کودیکھتے رہیں گے۔یہاں تک کہ بالآخروہ ان سے حجاب ہوجائے گااورخداتعالیٰ کانوراوراس کی برکت ان پر ان کے گھروں میں رہے گی۔(مسندامام اعظم رحمۃ اللہ علیہ)

شانہٗ اشارہ فرماتا ہے۔مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الآخِرَۃِ اَعْمٰی ۔یعنی جوشخص اس جہاں میں اندھاہے،وہ دوسرے جہان میں بھی اندھاہی ہوگا، بلکہ اندھوں سے بدتر۔

خدا کوجیسا کہ خداہے بغیرکسی غلطی کے پہچاننااوراسی عالم میں سچے اورصحیح طورپراس کی ذات اور

صفات کی معرفت حاصل کرنا یہی تمام روشنی کا مبدا ہے۔لوگوں کو جب آخروی وعدے حاصل جو جائیں گے،تو ان کو تجلی حاصل ہوگی۔جس کا قیام عالم مثال کے وسط میں ہے۔تمام لوگ اس وقت خداتعالیٰ کو برای العین دیکھیں گے۔اکثر فرق اسلامیہ کا اس مسئلہ پر اتفاق ہے۔اور یہی حق ہے۔

يَرَاهُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِغَيْرِ كَيْفٍ   وَ اِدْرَاکِ وَ ضَرْبٍ مِنْ مِثَالٍ

فَيَنْسُوْنَ النَّعِيْمَ اِذَا رَاَوْهُ   فَيَا خُسْرَانَ اَهْلَ الاِعْتِزَالِ

ترجمہ۔اہل ایمان خداتعالیٰ کو قیامت میں بغیر کیف اور بغیر احاطہ وادراک اور بغیر مثال کے دیکھیں گے۔تو جب اس کا دیدار کریں گے،تو سب نعمتوں کو بھول جائیں گے۔ہائے افسوس معتزلی لوگوں کے نقصان پر جو دیدار الٰہی کے منکر ہیں۔

حقیقت ملائک و وجہ تسمیہ ملائکہ

لفظ مَلَک لغت عرب میں الوک سے نکلا ہے،جس کے معنی رسالت و پیغام کے ہیں۔ملک واحد بمعنی فرشتہ اور جمع ملائک و ملائکہ ہے۔چونکہ فرشتے خداتعالیٰ کے فیوض و انعامات انسانوں تک پہنچانے کے لئے درمیان میں وسایط و ذرائع ہیں اور رسالت کا کام دے رہے ہیں،اسلئے ان کو ملائکہ کہتے ہیں۔

خداتعالیٰ کا قانون قدرت ثابت کر رہا ہے کہ جس قدر ہمارے نفوس وقویٰ و اجسام کو فیض اس ذات مبداء الفیوض سے پہنچتا ہے،وہ بعض چیزوں کے توسط سے پہنچتا ہے۔مثلاً اگرچہ ہماری آنکھوں کو وہی روشنی بخشتا ہے،مگر وہ روشنی آفتاب کے توسط سے ہم تک پہنچتی ہے۔اور ایسا ہی رات کی ظلمت،جو ہمارے نفوس کو آرام پہنچاتی ہے اور ہم نفس کے حقوق اس میں ادا کر لیتے ہیں،وہ بھی درحقیقت اسی کی طرف سے ہوتی ہے،کیونکہ ہر ایک پیدا شدہ کی علت العلل وہی ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ایک بندھا ہوا قانون قدیم سے ہمارے افاضہ کے لئے چلا آتا ہے کہ ہم کسی دوسرے کے توسط سے ہر ایک فیض خداتعالیٰ کا پاتے ہیں۔ہاں اس فیض کو قبول کرنے کے لئے اپنے اندر قویٰ بھی رکھتے ہیں،جیسے ہماری آنکھ روشنی قبول کرنے کی استعداد رکھتی ہے۔اور ہمارے کان بھی ان اصوات کو قبول کرنے کے لئے،جو ہوا پہنچاتی ہے،ایک قسم کی حِس اپنے اعصاب میں موجود رکھتے ہیں۔لیکن یہ بھی نہیں کہ ہمارے قویٰ ایسے مستقل اور کام طور پر اپنی بناوٹ رکھتے ہیں کہ ان کو خارجی معینات اور معاونات کی کچھ بھی ضرورت اور حاجت نہیں۔ہم کبھی نہیں دیکھتے کہ ہماری کوئی جسمانی قوت صرف اپنے ملکہ موجودہ سے کام چلا سکے اور خارجی مدد و معاون کی محتاج نہ ہو،مثلاً اگرچہ ہماری آنکھیں کیسی ہی تیز بین کیوں نہ ہوں،مگر پھر بھی ہم آفتاب کی روشنی کے محتاج ہیں اور ہمارے کان کیسے ہی شنوا ہوں،مگر پھر بھی ہم اس ہوا کے حاجت مند

ہیں، جو آواز کو اپنے اندر لپیٹ کر ہمارے کانوں تک پہنچا دیتی ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف ہمارے قویٰ ہماری انسانیت کی کل کو چلانے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ہمیں خارجی مددوں اور معاونوں کی حاجت ہے۔قانون قدرت ہمیں بتلا رہا ہے کہ وہ خارجی مدد و معاون اگر بلحاظ علت العلل ہونے کے خدا تعالیٰ ہی ہے، مگر اس کا انتظام ایسا ہرگز نہیں ہے کہ وہ بلا توسط ہمارے قویٰ اور اجسام پر اثر ڈالتا ہے۔ بلکہ جہاں تک ہم نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں اور جس قدر ہم اپنے فکر اور ذہن اور سوچ سے کام لیتے ہیں، صریح اور صاف طور پر ہمیں نظر آتا ہے کہ ہر ایک فیضان کے لئے ہم میں اور ہمارے خداوند کریم میں علل متوسط ہے، جن کے توسط سے ہر ایک قوت اپنی حاجت کے موافق فیضان پاتی ہے۔

بعض نادان کہتے ہیں کہ خدا کو کسی چٹھی رسان کی کیا ضرورت ہے، یعنی وہ فرشتوں کا محتاج نہیں ہے۔ یہ بات درست ہے کہ خدا کو کسی چیز کی حاجت نہیں اور نہ وہ کسی کا محتاج ہے۔مگر اسکی عادت میں یہ امر داخل ہے کہ وہ وسائط سے کام لیتا ہے۔اور یہ چیز اس کے عام قانون قدرت میں داخل ہے۔دیکھو وہ ہوا کے ذریعہ کانوں تک آواز کو پہنچاتا ہے۔پس جسمانی سلسلہ سے یہ روحانی کام اس کے عین مطابق ہے، جو روحانی کانوں کو اپنی آواز فرشتوں کے ذریعہ سے، جو ہوا کے قائم مقام ہیں، پہنچائے اور ضرور ہے کہ جسمانی اور روحانی سلسلے دونوں باہم مطابق ہوں اور یہی دلیل قرآن شریف نے پیش کی ہے۔

خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔**ان کل نفس لمّا علیھا حافظ**۔یعنی ہر ایک نفس پر ایک فرشتہ نگہبان ہے۔ یہ آیت صاف دلالت کر رہی ہے کہ جیسا کہ انسان کے ظاہری وجود کے لئے فرشتہ مقرر ہے، جو اس سے جدا نہیں ہوتا، ویسا ہی اس کے باطن کی حفاظت کے لئے بھی مقرر ہے، جو باطن کو شیطان سے روکتا ہے اور گمراہی کی ظلمت سے بچاتا ہے۔

ابن جریر نے اس آیت کی تائید میں یہ حدیث لکھی ہے۔ **ان معکم من لا یفارقکم الا عند الخلاء و عند الجماع فاستحیوھم و اکرموھم**۔ترجمہ۔یعنی تمہارے ساتھ وہ فرشتے ہیں کہ بجز جماع اور پاخانہ کی حاجت کے تم سے جدا نہیں ہوتے۔سو تم ان سے شرم کرو اور ان کی تعظیم کرو۔اور اسی جگہ عکرمہ سے یہ حدیث لکھی ہے کہ ملائک ہر ایک شر سے بچانے کے لئے انسان کے ساتھ رہتے ہیں۔اور پھر مجاہد سے نقل کیا ہے کہ کوئی انسان نہیں، جس کی حفاظت کے لئے دائمی طور پر ایک فرشتہ مقرر نہ ہو۔قرآن شریف پر بنظر تعمق غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان بلکہ جمیع کائنات الارض کی تربیت ظاہری و باطنی کے لئے بعض وسائط کا ہونا ضروری ہے۔اور بعض بعض اشارات قرآنیہ سے نہایت صفائی سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نفوس طیبہ، جو ملائک کے نام سے موسوم ہیں، ان کے تعلقات

طبقات سماویہ سے الگ الگ ہیں۔بعض اپنی تاثیرات خاصہ سے ہوا کے چلانے والے اور بعض مینہ کے برسانے والے اور بعض اور تاثیرات کو زمین پر اتارنے والے ہیں۔

آج تک کسی نے اس امر میں اختلاف نہیں کیا کہ جس قدر آسمانوں میں سیارت اور کواکب پائے جاتے ہیں۔ وہ کائنات الارض کی تکمیل و تربیت کیلئے ہمیشہ کام میں مشغول ہیں۔غرض یہ نہایت بچی ہوئی اور ثبوت کے چرخ پر چڑھی ہوئی صداقت ہے کہ تمام نباتات اور جمادات اور حیوانات پر آسمانی کواکب کا دن رات اثر پڑ رہا ہے۔اور جاہل سے جاہل دہقان بھی اس قدر تو یقین رکھتا ہو گا کہ چاند کی روشنی پھلوں کے موڑا کرنے کیلئے اور سورج کی دھوپ ان کو پکانے اور شیریں کرنے کیلئے اور بعض ہوائیں بکثرت پھل آنے کیلئے بلاشبہ مؤثر ہیں۔اب جبکہ ظاہری سلسلہ کائنات کا ان چیزوں کی تاثیرات مختلفہ سے تربیت پا رہا ہے،تو اس میں کیا شک ہوسکتا ہے کہ باطنی سلسلہ پر بھی باذنہ تعالیٰ وہ نفوس نورانیہ اثر کر رہے ہیں،جن کا اجرام نورانیہ سے ایسا شدید تعلق ہے کہ جیسے جسم کو جان سے ہوتا ہے۔

خدا تعالیٰ اور انسانوں کے درمیان وسائط ملائکہ کی وجہ

ســـوال ۔خدا تعالیٰ کو فرشتوں سے کام لینے کی کیا حاجت ہے۔کیا اس کی بادشاہی بھی انسانی سلطنتوں کی طرح عملہ کی محتاج ہے اور اس کو بھی فوجوں کی حاجت ہے؟

جـــواب ۔خدا تعالیٰ کو کسی چیز کی حاجت نہیں۔نہ فرشتوں کی،نہ آفتاب کی،نہ ماہتاب کی،نہ ستاروں کی۔لیکن اسی طرح اس نے چاہا کہ تا اس کی قوتیں اسباب کے توسط سے ظاہر ہوں اور تا اس طرز سے انسانوں میں حکمت اور علم پھیلے۔اگر اسباب کا توسط درمیان میں نہ ہوتا،تو نہ دنیا میں علم ہیئت ہوتا،نہ علم نجوم،نہ علم طبعی،نہ علم طبابت،نہ علم نباتات۔یہ اسباب ہی ہیں،جن سے علم پیدا ہوئے۔تم سوچ کر دیکھو کہ اگر فرشتوں سے خدمت لینے پر کچھ اعتراض ہے،تو وہی اعتراض سورج،چاند اور کواکب اور نباتات اور جمادات اور دوسرے عناصر سے خدمت لینے پر بھی پیدا ہوتا ہے۔جو شخص معرفت کا کچھ حصہ رکھتا ہے،وہ جانتا ہے کہ ہر ایک ذرہ خدا تعالیٰ کے ارادہ کے موافق کام کر رہا ہے اور ایک قطرہ پانی کا،جو ہمارے اندر جاتا ہے،وہ بھی بغیر اذن الٰہی کوئی تاثیر موافق یا مخالف ہمارے بدن پر نہیں ڈال سکتا۔پس تمام ذرات اور سیارات وغیرہ درحقیقت ایک قسم کے فرشتے ہیں،جو دن رات خدمت میں مشغول ہیں۔کوئی انسان کے جسم کی خدمت میں مشغول ہے اور کوئی روح کی خدمت میں۔اور جس حکیم مطلق نے انسان کی جسمانی تربیت کے لئے بہت سے اسباب کا توسط پسند کیا اور اپنی طرف سے بہت سے جسمانی مؤثرات پیدا کئے،تا کہ انسان کے جسم پر انواع اقسام کے طریقوں سے تاثیر ڈالیں،اسی وحدہٗ لاشریک

نے ،جس کے کاموں میں وحدت اور تناسب ہے، یہ بھی پسند کیا کہ انسان کی روحانی تربیت بھی اسی نظام اور طریق سے ہو کہ جو جسم کی تربیت میں اختیار کیا گیا ،تا وہ دونوں نظام ظاہری و باطنی اور روحانی اور جسمانی اپنے تناسب اور یک رنگی کی وجہ سے صانع واحد مدبر بالا رادہ پر دلالت کریں۔ پس یہی وجہ ہے کہ انسان کی روحانی تربیت بلکہ جسمانی تربیت کے لئے بھی فرشتے وسائط مقرر کئے گئے ۔مگر یہ تمام وسائط خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں مجبور اور ایک کل کی طرح ہیں۔ جس کو اس کا پاک ہاتھ چلا رہا ہے۔ اپنی طرف سے نہ کوئی ارادہ رکھتے ہیں، نہ کوئی تصرف ۔جس طرح ہوا خدا تعالیٰ کے حکم سے ہمارے اندر چلی جاتی ہے اور اس کے حکم سے باہر آتی ہے اور اسی کے حکم سے تاثیر کرتی ہے ۔یہی صورت اور بتمامہ یہ حال فرشتوں کا ہے۔ **یفعلون ما یؤمرون** ۔(ترجمہ۔ بجالاتے ہیں وہ خدمت، جس کا ان کو حکم ہوتا ہے)

فرشتوں کا وجود ماننے کے لئے نہایت سہل اور قریب راہ یہ ہے کہ ہم اپنی عقل کی توجہ اس طرف مبذول کریں کہ یہ بات طے شدہ اور فیصل شدہ ہے کہ ہمارے اجسام کی ظاہری تربیت اور تکمیل کے لئے اور نیز اس کام کے لئے کہ تا ہمارے ظاہری حواس کے افعال مطلوبہ کما ینبغی صادر ہو سکیں، خدا تعالیٰ نے یہ قانون قدرت رکھا ہے کہ عناصر اور شمس و قمر اور تمام ستاروں کو اس خدمت میں لگا دیا ہے کہ وہ ہمارے اجسام اور قویٰ کو مدد پہنچا کر ان سے بوجہ احسن ان کے تمام کام صادر کرا دیں ۔اور ہم ان صداقتوں کے ماننے سے کسی طرف نہیں بھاگ سکتے کہ مثلاً ہماری ذاتی آنکھ اپنی ذاتی روشنی سے کسی کام کو بھی انجام نہیں دے سکتی، جب تک آفتاب کی روشنی اس کے ساتھ شامل نہ ہو۔ اور ہمارے کان محض اپنی قوت شنوائی سے کچھ بھی نہیں سن سکتے ، جب تک کہ ہوا متکیف بصوت ان کی مدد و معاون نہ ہو۔ پس کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ کے قانون نے ہمارے قویٰ کی تکمیل اسباب خارجیہ میں رکھی ہے۔ اگر غور سے دیکھو تو نہ صرف ایک دو باتوں میں بلکہ ہم اپنے تمام حواس، تمام قویٰ، تمام طاقتوں کی تکمیل کے لئے خارجی امدادات کے محتاج ہیں۔ پھر جب کہ یہ قانون اور انتظام خدائے واحد لاشریک کا ،جس کے کاموں میں وحدت اور تناسب ہے، ہمارے خارجی قویٰ اور حواس اور اغراض جسمانی کی نسبت نہایت شدت اور استحکام اور کمال التزام سے پایا جاتا ہے، تو پھر کیا یہ بات ضروری اور لازمی نہیں کہ ہماری روحانی تکمیل اور روحانی اغراض کے لئے بھی یہی انتظام ہوتا۔ تا دونوں انتظام ایک ہی طرز پر واقعہ ہو کر صانع واحد پر دلالت کریں۔ اور خود ظاہر ہے کہ جس حکیم مطلق نے ظاہری انتظام کی یہ بنا ڈالی ہے اور اسی کو پسند کیا ہے کہ اجرام سماوی اور عناصر وغیرہ اسباب خارجیہ کے اثر سے ہمارے ظاہر اجسام اور قویٰ اور حواس کی تکمیل ہو، اس حکیم قادر نے ہماری روحانیت کے لئے بھی یہی انتظام پسند کیا ہوگا۔ کیونکہ وہ واحد

لاشریک ہے اور اس کی حکمتوں اور کاموں میں وحدت اور تناسب ہے اور دلائل انیّہ بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔ سو وہ اشیائے خارجیہ جو ہماری روحانیت پر اثر ڈال کر شمس اور قمر اور عناصر کی طرح، جو اغراض جسمانی کے لئے ممد ہیں، ہماری اغراض روحانی کو پورا کرتی ہیں۔ انہیں کا نام ہم ملائک رکھتے ہیں۔ پس اس تقریر سے وجود ملائک بوجہ احسن ثابت ہوتا ہے۔ اور گو ہم پر ان کی کنہ کھل نہ سکے، اور کھلنا کچھ ضرور بھی نہیں، لیکن اجمالی طور پر قانون قدرت کے موافق اور اتحاد پر نظر کر کے ان کا وجود ماننا پڑتا ہے، کیونکہ جس حالت میں ہم نے بطیّب خاطر ظاہری قانون کو مان لیا ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اس طرز اور طریق پر باطنی قانون کو تسلیم نہ کریں۔ بیشک ہمیں باطنی قانون بھی اسی طرح قبول کرنا پڑیگا کہ جس طرح ہم نے ظاہری قانون کو مان لیا۔

(۳) یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ فرشتہ کا لفظ قرآن شریف میں عام ہے۔ ہر ایک چیز، جو اس کی آواز سنتی اور مطیع ہے، وہ بھی فرشتہ ہے۔ پس دنیا کا ذرہ ذرہ خدا کا فرشتہ ہے، کیونکہ وہ اس کی آواز سنتے اور اس کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ اور اگر ذرہ ذرہ اس کی آواز نہیں سنتا، تو خدا تعالیٰ نے زمین و آسمان کو کس طرح پیدا کیا۔ اگر یہ چیزیں شنوا نہ ہوتیں اور خدا کی آواز نہ سنتیں، تو تجربہ و مشاہدہ اس کے برعکس ہوتا۔ نوح و موسیٰ و ابراہیم علیہم الصلوٰۃ والسلام کے دوستوں و دشمنوں میں ان اشیاء نے کس طرح تمیز کر کے ایک گروہ کو پکڑ لیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا۔

موجِ دریا چوں بامرحق شتافت	اہل موسیٰ را ز قبطی وا شناخت
آتش ابراہیم را دنداں نہ زد	چوں گزیدہ حق بود چونش گزد
نوح و موسیٰ را نہ دریا یار شد	نے بر اعدا شاں بکیں قہار شد
آتش ابراہیم را قلعہء بود	تا بر آور و از دل نمرود دود
باد بدعا دیاں گر زد تبر	لیکن بر ہود و بر قومش ظفر
جادہ باشد بجز اسرائیلیاں	غرقہ گہ باشد ز فرعون عوان

(۴) تاثر کے وجوہ سے مؤثر کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ یہ قاعدہ بالکل صحیح ہے کہ متاثرات کی طرف دیکھ کر، جو خدا تعالیٰ کی قدرت کے نمونے ہیں، اس مؤثر حقیقی کی ضرورت تسلیم کی گئی ہے۔ ہاں عارف اپنے انتہائی مقام پر پہنچ کر روحانی آنکھوں سے خدا تعالیٰ کو دیکھتے اور اس کی باتوں کو سنتے ہیں۔ مگر محجوب کے لئے بجز اس کے اور استدلال کا طریق کیا ہے کہ متاثرات کو دیکھ کر اس مؤثر حقیقی کے وجود پر ایمان لائے۔ اور اسی طریق سے ملائکہ اور شیاطین کا وجود ثابت ہوتا ہے اور نہ صرف ثابت ہوتا ہے

بلکہ وہ نہایت صفائی سے نظر آ جاتے ہیں۔افسوس ان لوگوں کی حالت پر ہے، جو فلسفہ باطلہ کی ظلمت سے متاثر ہوکر ملائک اور شیاطین کے وجود سے انکار کر بیٹھتے ہیں۔

(۵) تندرست آنکھ بدوں خارجی روشنی کے دیکھ نہیں سکتی اور تندرست کان بدوں خارجی ہوا کے سن نہیں سکتے اور نطفہ بدوں رحم کے پرورش نہیں پا سکتا۔ بہت دور کی اشیاء بدوں ٹیلی سکوپ کے اور باریک در باریک اشیاء بدون مائیکروسکوپ کے دکھائی نہیں دیتیں۔اور دور دراز ملکوں کے دوستوں کی آوازیں بجز فونوگراف کے سن نہیں سکتے اور ان کی شکلیں بدوں فوٹوگرافی کے نہیں دکھائی دیتیں۔ پس جس طرح سچے وسائط ہمارے مشاہدات میں اور ذات مکشوفات میں ہیں۔اسی طرح ذات روحانیات میں بھی وراءالورا ہے۔

(٦) بنی آدم میں سے ہر فرد بشر کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ ایک وقت اگر امر نیک کی طرف مائل ہے، تو دوسرے وقت میں بری بات کی خواہش رکھتا ہے۔ بلکہ غور سے دیکھئے، تو ہر وقت دونوں طرف میلان رہتا ہے۔ کیونکہ عین بدی کی رغبت کے وقت عقل مانع ہے اور عین نیکی کی رغبت کے وقت خواہش نفسانی موجود رہتی ہے۔تو جیسا اجسام بنی آدم میں بسب حرارت، برودت، یبوست، رطوبت چاروں کے پائے جانے سے ہم کو یہ معلوم ہوا کہ یہ آب وخاک، آتش، ہوا، چاروں سے مرکب ہیں۔ایسے ہی یوں معلوم ہوتا ہے کہ جانیں بھی ایسے ہی دو جزوں سے مرکب ہیں کہ ایک کو بالطبع نیکی کی طرف رغبت ہے اور دوسرے کو بالطبع بدی کی طرف میلان ہے۔مگر جیسے کمی بیشی کے باعث بنی آدم کے مزاج باعتبار حرارت و برودت وغیرہ کے مختلف ہیں، یعنی اگر آگ دوسرے اجزا پر غالب ہے، تو مزاج کو گرم کہتے ہیں، گو اس میں کچھ نہ کچھ سردی بھی پائی جاتی ہو۔اور پانی دوسرے اجزا پر غالب ہے، تو مزاج کو سرد کہتے ہیں، گو حرارت بھی اس میں فی الجملہ موجود ہے۔ایسے ہی باعتبار کمی بیشی اجزا کے بنی آدم میں نیک و بد کا تفاوت ہے۔ ورنہ نیکوں میں بدی کا مادہ اور بدوں میں نیکی کا مادہ فی الجملہ موجود ہے۔ بہرحال اس میں کلام نہیں کہ جان ہائے بنی آدم ایسے دو جزوں مختلف الطبیعت سے مرکب ہیں کہ ایک کو بالطبع نیکی کی جانب میلان ہے اور اسی کو اہل اسلام روح کہتے ہیں اور دوسرے کو بالطبع بدی کی طرف رغبت ہے اور اسی کو اہل اسلام نفس کہتے ہیں۔سو ان دونوں جزوں کی دو اصلیں بھی جدا جدا ہیں۔جس چیز کو نیکی کی طرف رغبت ہے، اس کی اصل طبقہ ملائکہ ہے، جن کو فرشتے اور دیوتا بھی لکھتے ہیں۔ کیونکہ اس جماعت کی نسبت سب کا یہی عقیدہ ہے کہ برائی سے ان کو سروکار نہیں۔اور جس چیز کو بالطبع بدی مرغوب ہو، اس کی اصل طبقہ شیاطین ہے۔ کیونکہ ان کے بارے میں بھی سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان کو

نیکی سے مطلب نہیں۔

(۷) بالفرض اگر ملائکہ اور شیاطین کی نسبت کسی کا یہ اعتقاد نہ بھی ہو، تب بھی اتنی بات تو ثابت ہوگئی کہ انسان میں دو مختلف الرغبت جز و موجود ہیں۔ اور ان کے لئے دو مختلف اصلوں کا ہونا لازمی چیز ہے۔ سو جس اصل کی یہ خاصیت ہو جیسے پانی بالطبع ٹھنڈا ہے، اگرچہ آگ کے سبب گرم ہو جائے تو ہو جائے، وہ بالطبع نیکی کی طرف مائل ہوگا۔ گو وہ بھی شیاطین کی تاثیر سے بدی کی طرف متوجہ ہوسکتا ہے۔ اس اصل کا نام ہم اپنی اصطلاح میں **طبقہ ملائکہ** تجویز کرتے ہیں۔ اور جو اصل اس کے برعکس ہو، اس کا نام ہم اپنی اصطلاح میں **طبقہ شیاطین** رکھتے ہیں۔ پھر جیسے ہر ایک کو بدن کے عناصر اربعہ میں سے اوقات مختلفہ میں اپنی اپنی اصل سے یا ان مرکبات سے، جن میں اس اصل کا عنصر زیادہ ہو، مدد پہنچتی ہے۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ جیسے آگ سے بدن میں گرمی کو ترقی ہوتی ہے، اسی طرح گرم دواؤں سے گرمی کو ترقی ہوتی ہے۔ ایسے ہی یوں سمجھ میں آتا ہے کہ ملائکہ اور شیاطین ہی کے سبب سے یہ بات ہو کہ ایک وقت میں نیکی کی جانب زیادہ رغبت ہوتی ہے اور دوسرے وقت میں بدی کی جانب زیادہ میلان ہوتا ہے۔ بہر حال ملائکہ اور شیاطین کا ہونا حق معلوم ہوتا ہے اور بنی آدم کے دلوں پر ان کے اثر کو ہونا بھی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اور باوجود ان تاثیرات کے پیدا ہونے کے ان کا نظر نہ آنا ایسا ہی سمجھنا چاہئے کہ جان کا اور ہوا کا بدن پر کسی قدر اثر ظاہر ہوتا ہے اور پھر دونوں کے دونوں معلوم نہیں ہوتے۔ ہاں آثار کے وسیلے سے معلوم ہوتے ہیں۔ سو بعینہ یہی قصہ یہاں پر بھی موجود ہے۔

(۸) آدمی کی رغبت اور توجہ ہر دم فقط نیکی یا بدی کی طرف نہیں رہتی۔ کبھی آدمی کا دل نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے اور کبھی بدی کی طرف۔ اس اختلاف و میلان سے صاف ظاہر ہے کہ ترکیب روحانی بیشک دو ایسے جزوں سے ہوئی ہے، جو باہم متضاد ہیں۔ ورنہ ایک شے سے ایسی دو مختلف کیفیتوں کا پیدا ہونا ایسے ہی محال ہے، جیسے ایک عنصر خاکی یا آبی سے مثلاً یبوست و رطوبت دونوں کا پیدا ہونا محال ہے۔ پھر جیسے وہاں ہر ایک کے لئے ایک جدا طبقہ ہے۔ ایسے ہی یہاں بھی ہوگا۔ اس لئے یہ بات ماننی پڑے گی کہ ایک گروہ تو مخلوقات میں ایسا ہوگا کہ اس کی خاصیت اصل بھلائی اور نیکی کی طرف رغبت ہو گی، یوں جیسے بوجہ برف پانی میں یبوست آجاتی ہے۔ اگرچہ ان میں بھی بوجہ خارجی اثرات کے برائی کی طرف رغبت ہوسکتی ہے۔ اور ایک گروہ مخلوقات میں ایسا ہوگا کہ اس کی خاصیت اصلیہ برائی کی طرف راغب ہو، یوں جیسے خاک میں بوجہ آب رطوبت آجاتی ہے۔ اگرچہ بوجہ خارجی اثرات کے بھلائی کی طرف رغبت ہو جائے، تو ہو جائے۔ پہلے گروہ کو ہم ملائک کہتے ہیں اور دوسرے کو شیاطین کا نام دیتے

ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے مزاج مرکبات عنصریہ میں امداد خارجی سے فرق آ جاتا ہے اور ایک کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے گرم غذاؤں اور دواؤں کے کھانے سے گرمی اور سرد غذاؤں اور سرد دواؤں کے کھانے سے سردی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور مزاج اصلی میں تغیر آ جاتا ہے۔ ایسے ہی یہاں بھی بوجہ امداد خارجی رغبت قلبی میں تغیر آ سکتا ہے بلا وجہ نہیں۔ بالجملہ ملائکہ اور شیاطین کا وجود یقینی ہے۔

پیدائش شیطان کی وجہ

وجہ تسمیہّ شیطان

لفظ شیطان لغت عرب میں (۱) شطن (۲) شطون اور (۳) شیط سے مشتق ہے، جن کے معنے بترتیب مذکور قصداً مخالفت کرنا، دور ہونا، ہلاک ہونا ہیں۔ جو انسان قصداً شیطانی و بدخواہشات کا پیرو رہتا ہے۔ وہ رحمت الٰہی سے دور ہو کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ اسلئے ایسی چیز، جو انسان کو رحمت الٰہی سے دور کرنے کا باعث ہو، اس کو شیطان کہتے ہیں، ۔صراح میں لکھا ہے۔ شیطان بمعنی دیو۔ **وَ کُلُّ عَاتٍ مُتَمرِدٍ مِنَ الْجِنّ وَالْاِنْسِ وَ الدَّوَابِ فَھُوَ شَیْطَانٌ** ۔یعنی جن وانسانوں اور چار پائیوں میں سے جو سرکش و گردن کش ہو، اس کو شیطان کہتے ہیں۔ شیطان واحد اور شیاطین اس کی جمع ہے۔

حقیقت شیطان

خدا تعالیٰ کا ازلی قانون قدرت یوں چلا آتا ہے کہ اس نے جیسا کہ دن کے مقابلہ پر رات اور نور کے مقابلہ میں تاریکی پیدا کر رکھی ہے، ایسا ہی اس نے انسان کے لئے نورانی مخلوق کے مقابلہ میں ظلمانی مخلوق بھی بنائی ہے۔ اور ضدین سے اس کو ایک کی خوبی اور دوسرے کی برائی و شناعت دکھا دی ہے۔ یعنی جیسا کہ خدا نے انسان کے لئے دائمی طور پر ایک نعم القرین داعی الی الخیر کی فرمانبرداری و اطاعت کی بہتری و خوبی و داعی الی الشر کی برائی و قباحت کا علم دیدیا کہ داعی الی الشر کا نافرمان ہو اور داعی الی الخیر کا مطیع ہو کر قابل انعام و اکرام ہو۔

انسان کے لئے خدا تعالیٰ نے ابتلا کے طور پر دو روحانی داعی مقرر کر رکھے ہیں۔ ایک داعی خیر کا نام **روح القدس** ہے اور دوسرے داعی الی الشر کا نام **ابلیس اور شیطان** ہے۔ یہ دونوں داعی صرف خیر یا شر کی طرف بلاتے رہتے ہیں، مگر کسی بات پر جبر نہیں کرتے، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں اس امر کی طرف اشارہ ہے۔ **فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَ تَقْوَاھَا** ۔یعنی خدا بدی کا بھی الہام کرتا ہے اور نیکی کا بھی۔ بدی کے الہام کا ذریعہ شیطان ہے، جو شرارتوں کے خیالات دلوں میں ڈالتا ہے۔ اور نیکی کے

الہام کا ذریعہ روح القدس ہے، جو پاک خیالات دل میں ڈالتا ہے۔ اور چونکہ خدا تعالیٰ علت العلل ہے، اس لئے دونوں الہام خدا تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر لئے، کیونکہ اسی کی طرف سے یہ سارا انتظام ہے۔ ورنہ شیطان کیا حقیقت رکھتا ہے، جو کسی دل میں وسوسہ ڈالے اور روح القدس کیا چیز ہے، جو کسی کو تقویٰ کی راہوں پر چلنے کی ہدایت کرے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس امر میں مندرجہ ذیل حدیث لکھی ہے۔ **حدثنا اسود بن عامر حدثنا سفیان حدثنی منصور عن سالم بن انی ابی الجعد عن ابیه عن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ما منکم من احد الا و قد وکل به قرینه من الجن و قرینه من الملٰئکة قالوا و ایاک یا رسول اللہ قال و ایای و لاکن اللہ اعاننی علیه فلا یامرونی الا بالخیر (انفرد باخراجه مسلم)** ۔ترجمہ۔عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی تم میں سے ایسا نہیں کہ جس کے ساتھ ایک قرین جن کی نوع میں سے اور ایک قرین فرشتوں میں سے مؤکل نہ ہو۔ صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ بھی۔ فرمایا کہ ہاں میں بھی۔ پر خدا نے میرے جن کو میرے تابع کر دیا ہے۔ سو وہ بجز خیر و نیکی کے اور کچھ بھی مجھے نہیں کہتا۔ (اس حدیث کے اخراج میں مسلم منفرد ہے)۔ اس حدیث سے صاف اور کھلے طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جیسے ایک داعی شر انسان کے لئے مقرر ہے، جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ ایسا ہی ایک داعی خیر بھی ہر ایک بشر کے لئے مؤکل ہے۔ جو کبھی اس سے جدا نہیں ہوتا اور ہمیشہ اس کا قرین اور رفیق ہے۔ اگر خدا تعالیٰ فقط ایک داعی الی الشر ہی انسان کے لئے مقرر کرتا اور داعی الی الخیر مقرر نہ کرتا، تو خدا تعالیٰ کے عدل اور رحم پر دھبہ لگتا کہ اس نے شر انگیزی اور وسوسہ اندازی کی غرض سے ایسے ضعیف اور کمزور انسان کو فتنہ میں ڈالنے کے لئے کہ جو پہلے ہی نفس امّارہ ساتھ رکھتا ہے، شیطان کو ہمیشہ کا قرین اور رفیق اس کا ٹھہرا دیا، جو اس کے خون میں بھی سرایت کر جاتا ہے اور دل میں داخل ہو کر ظلمت کی نجاست اس میں چھوڑ دیتا ہے۔ مگر نیکی کی طرف بلانیوالا کوئی ایسا رفیق مقرر نہ کیا، تا وہ بھی دل میں داخل ہوتا اور خون میں سرایت کرتا اور تا میزان کے دونوں پلے برابر رہتے۔ مگر اب جبکہ قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہو گیا کہ جیسے بدی کی دعوت کے لئے خدا تعالیٰ نے ہمیشہ کا قرین شیطان کو مقرر کر رکھا ہے، ایسا ہی دوسری طرف نیکی کی دعوت کرنے لئے روح القدس کو اس رحیم و کریم نے دائمی قرین انسان کا مقرر کر دیا ہے۔ اور نہ صرف اس قدر بلکہ بقا و لقا کی حالت میں شیطان کا اثر کالعدم ہو جاتا ہے۔ گویا وہ اسلام قبول کر لیتا ہے اور روح القدس کا نور انتہائی درجہ پر چمک اٹھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا ہے کہ میرا شیطان مسلمان ہوگیا ہے۔اس پاک اوراعلیٰ درجہ کی تعلیم پرکون اعتراض کرسکتا ہے، بجزاس نادان اوراندھے کے کہ جوحیوانات کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔

سوال ۔کیا خدانے شیطان کو پیدا کر کے اپنی مملکت میں خودایک ڈاکوقزاق چھوڑ رکھا ہے؟

جواب ۔عنوان الصدرسوال کودل میں لانا ایسا ہی ہے جیسے گویاپانی، ہواوغیرہ کےنقصانات کا خیال کر کے کوئی شخص باوجود دلالت رطوبت وگرمی وغیرہ یہ کہے کہ اگر جسم انسانی میں آگ ہو،تو یوں کہو کہ خدا نے ایسا کیا، جیسے کوئی شخص چھپر بنائے اور پھر خود ہی اس میں آگ لگا دے۔ نہ یہ قرین عقل ہے، نہ وہ قرین قیاس ہے۔الحاصل باوجود دلالت آثار وجودعناصر میں بوجہ مذکور تامّل کرنا عاقل کا کام نہیں۔ایسے ہی باوجود دلالت آثار مشارٌالیہ وجودشیاطین میں بوجہ مذکور متامّل ہونا اہل عقل سے دور ہے۔جیسے ترکیب انسانی عناصر متضادہ سے بدلالت فطرت سلیمہ اس لئے ہے کہ اس ترکیب سے ایک عمدہ نتیجہ پیدا ہوا،جس کومزاج مرکب کہتے ہیں اورجسکے وسیلہ سے ہزاروں آثارعجیبہ نمایاں ہوئے، جو حیوانات میں مشہود ہوتے ہیں۔ایسے ہی ترکیب عالم میں بھلی بری دونوں قسم کی چیزیں ہوتی ہیں۔مکان عمدہ وہی ہے،جس میں پاخانہ بھی ہو۔یہی نہیں کہ سوائے پاخانہ اورسب چیزیں ہوا کریں اور پاخانہ نہ ہو، حالانکہ پاخانہ کا برا ہونا ایسا نہیں کہ کوئی نہ جانتا ہو۔آدمی خوبصورت وہی ہے،جس میں آنکھ، ناک، رخسار کے ساتھ ابرومژگان وزلف وخط وخال بھی ہو، حالانکہ خط وخال وابرو ومژگان کی بدشکلی ان کے رنگ سے ظاہر ہے۔اگر پاخانہ نہ ہو،تو مکان ناقص ہے۔اورخط وخال وابرو، زلف وژگان نہ ہو،تو آدمی کا جمال ناتمام ہے۔ جب ایسی ذرا ذرا سی چیزوں میں اس اجتماع کی ضرورت ہے،تو ایسے بڑے کارخانہ کےحسن وجمال کیلئے جسکو عالم وجہان کہتے ہیں، کیونکراس اجتماع کی ضرورت نہ ہوگی۔اورنہیں تو یہ برائیاں عالم میں کہاں سے آئیں اور یہ تکلیفیں کیونکر ظاہر ہوئیں۔ الغرض عالم میں برا، بھلا، آرام،تکلیف سب ہونے چاہئیں اور بدلالت آثار پہلے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ واقعی موجود ہیں۔

سوال ۔بعض کوتاہ اندیش یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ خداتعالیٰ نے دانستہ انسان کے پیچھے شیطان کولگا رکھا ہے۔گویا آپ ہی خلق اللہ کوگمراہ کرنا منظور ہے۔

جواب ۔واضح ہوکہ قرآن کریم یہ تعلیم نہیں دیتا کہ شیطان گمراہ کرنے کے لئے جبر کرسکتا ہے اورنہ اس نے یہ تعلیم دی ہے کہ صرف بدی کی طرف بلانے کے لئے شیطان کومقرر کررکھا ہے۔ بلکہ یہ تعلیم ہے کہ آزمائش اورامتحان کی غرض سے ملّہء ملک اور ملّہء ابلیس برابرطور پرانسان کو دیئے گئے ہیں۔یعنی ایک داعی خیراورایک داعی شر ہے کہ انسان اس ابتلاء میں پڑ کرمستحق ثواب یا عقاب کا ٹھہر

سکے۔ کیونکہ اگر اس کے لئے ایک طور کے اسباب پیدا کئے جاتے ،مثلاً اگر اس کے بیرونی اور اندرونی اسباب جذبات فقط نیکی کی طرف ہی اس کو کھینچتے یا اس کی فطرت ہی ایسی واقع ہوتی کہ وہ بجز نیکی کے کاموں کے اور کچھ کر ہی نہ سکتا،تو کیا کوئی وجہ تھی کہ نیک کاموں کے کرنے سے اس کو مرتبہ قرب کامل سکے۔ کیونکہ اس کے لئے تمام اسباب و جذبات نیک کام کرنے کے ہی موجود ہیں ۔ یا یہ کہ بدی کی خواہش تو ابتدا سے ہی اسکی فطرت سے مسلوب ہے،تو پھر بدی سے بچنے کا اس کو ثواب کس استحقاق سے مل سکتا ہے۔اب اس تحقیق سے ظاہر ہوا کہ مخالفانہ جذبات جو انسان میں پیدا ہو کر انسان کو بدی کی طرف کھینچتے ہیں، درحقیقت وہی انسان کے ثواب کا بھی موجب ہیں، کیونکہ خدا تعالیٰ سے ڈر کر ان مخالفانہ جذبات کو چھوڑ دیتا ہے،تو عنداللہ بلاشبہ تعریف کے قابل ٹھہر جاتا ہے اور اپنے رب کو راضی کر لیتا ہے۔

سوال۔خدائے عالم الغیب کو انسان کے امتحان اور آزمائش کی کیا ضرورت ہے؟

جواب۔ بلاشبہ خدا تعالیٰ کو آزمائش و امتحان کی کوئی ضرورت نہیں ۔لیکن چونکہ اصل مقصد امتحان سے اظہار حقائق مخفیہ ہوتا ہے۔اس لئے یہ لفظ خدا تعالیٰ کی کتابوں میں پایا جاتا ہے۔وہ امتحان میں اس لئے نہیں ڈالتا کہ اس کو معلوم نہیں، بلکہ اس لئے کہ تا شخص زیرِ امتحان پر اس کی حقیقت ظاہر کرے کہ اس میں یہ فساد یا صلاحیت ہے اور نیز دوسروں پر اس کا جوہر کھل دے۔

سوال۔جس حالت میں شیطان کو خدا تعالیٰ کی ہستی اور وحدانیت پر یقین ہے،تو پھر وہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی کیوں کرتا ہے؟

جواب ۔شیطان کی نافرمانی انسان کی نافرمانی کی طرح نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس عادت پر انسان کی آزمائش کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔اور یہ ایک راز ہے،جس کی تفصیل انسان کو نہیں دی گئی۔اور انسان کی خاصیت اکثر اور اغلب طور پر یہی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی نسبت علم کامل حاصل کرنے سے ہدایت پالیتا ہے،جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔**انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء** ۔ہاں جو لوگ شیطانی سرشت رکھتے ہیں،وہ اس قاعدہ سے باہر ہیں۔

سوال ۔آریہ اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ شیطان بہکا کر انسان سے برے کام کراتا ہے۔لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ شیطان کو کس نے بہکایا تھا؟ کیا دراصل انسان خود برے کام نہیں کرتا؟

جواب ۔(ا)اس وجہ سے کہ شیطان کو بہکانے والا کوئی نہیں ملتا،اس لئے شیطان کے وجود اور اس کے بہکانے کے بارے میں شبہ کرنا ایسا ہے، جیسے چونکہ آگ کو گرم کرنیوالا کوئی نہیں اور آفتاب کو

روشن کرنیوالا کوئی نہیں، اس لئے آب گرم کے گرم کرنے اور آفتاب کے زمین کو روشن کرنے کو شبہ کی نظر سے دیکھا جائے۔ پھر تو آگ کے وجود سے اور آفتاب سے بھی انکار کرنا لازم ٹھہرا۔ اور آب گرم کی تپش سے گرم ہونے کو اور زمین وغیرہ کے آفتاب سے روشن ہونے کو بھی غلط کہنا چاہئے۔ بلکہ بایں نظر کہ خدا کو پیدا کرنے والا کوئی نہیں، اس لئے خدا کے وجود کا انکار بھی ضروری ہے اور عالم کے مخلوق خدا ہونے کو غلط کہنا لازم ٹھہرتا ہے۔ یہاں بھی یہی کہنا چاہئے کہ جیسے انسان اپنے آپ برے کام کرتا ہے، اس لئے مخلوقات بھی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے، خالق کوئی نہیں۔

(۲) اوصاف کے پھیلاؤ کی یہ صورت ہے کہ ایک موصوف بالذات اور مصدر وصف ہوتا ہے، جس کے حق میں وہ وصف خانہ زاد ہوتا ہے اور ماسوا اس کے باقی سب اس سے مستفید ہوتے ہیں، وصف وجود کے پھیلاؤ کی یہ صورت ہوئی کہ خدا موجود بالذات اور مصدر وجود ہے۔ اس کے حق میں وجود خانہ زاد ہے اور ماسوا اس کے سب اس سے مستفید ہیں۔

حرارت کے پھیلاؤ کی یہ صورت ہوئی کہ آتش گرم بالذات اور مصدر حرارت ہے اور آب گرم وغیرہ اس کی حرارت سے مستفید ہے۔ نور کے پھیلاؤ کی یہ صورت ہے کہ آفتاب بالذات روشن اور مصدر نور ہے۔ اس کے سوا سب اس سے مستفید ہیں۔ اور یہ جو آفتاب میں حرارت اور آتش میں نور ہے، تو اسکی وجہ یہ ہے مادہ واحد دونوں میں مشترک ہے۔ صرف صفائی مادہ اور عدم صفائی کا فرق ہے۔ سو یہ ایسی بات ہے، جیسے شمع کافوری یا شمع مومی یا گھاس کی روشنی اور سرسوں ترہ وغیرہ کی مشعلیں مادہ آتشیں ہونے میں تو شریک ہیں، مگر صفائی اور غیر صفائی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگرچہ باوجود فرق مذکور کے موصوف بالحرارت اور موصوف بالنور دونوں ہیں۔ غرض موصوف بالذات ایک ہوتا ہے۔ البتہ اس کے وصف کا پھیلاؤ یوں ہوتا ہے کہ قابلات کثیرہ اس سے مستفیذ اور اس کے وصف کی معروض ہو جاتی ہیں۔ یہی صورت حال وصف ضلال کی ہے۔ اس کے پھیلاؤ کی بھی یہی صورت ہے کہ ایک موصوف بالذات ہو اور ماسوا اس کے دوسرے سب اس سے یہ وصف لے کر زمرہ ضالین میں داخل ہوں۔ سو اس موصوف بالذات کو تو ہم شیطان کہتے ہیں اور باقی گمراہوں کو اس کے وصف کا معروض اور اس سے لینے والے اور اس کی وجہ سے گمراہ سمجھتے ہیں۔

البتہ شاید کسی عقل کے ادھورے کو اس صورت میں یہ شبہ ہو کہ شیطان کی برائی اگر خدا کی طرف سے ہے، تو پھر خدا کی برائی یا شیطان کی خدائی ماننی پڑے گی۔ یعنی جب اسکا وصف ذاتی، جو ضلال تھا، خدا کی طرف سے نہ ہو، تو اسکا یہ مطلب ہے کہ وہ خدا کی مخلوق نہیں۔ پھر تو ذات شیطانی بھی خدا کی مخلوق

نہیں ہوسکتی، کیونکہ وصف ذاتی اور ذات میں کسی طرح جدائی ممکن نہیں۔لیکن اگر ذات شیطانی خدا کی مخلوق ہے،لیکن وصف ضلال مخلوق خدا نہیں،تو پھر ضلال اوپر سے عارض ہوا ہوگا۔اس صورت میں اول تو وصف مذکور کا ذاتی ہونا غلط ہوگیا۔دوسرے وقت خلق اور اول آفرینش میں یہ وصف اس میں نہ ہوگا۔

دراصل صدور اور چیز ہے اور پیدا کرنا اور چیز۔آفتاب کسی روشندان کے مقابل ہو،تو نور آفتاب اس روشندان سے گزر کر زمین پر جا کر پڑتا ہے اور روشندان کی شکل کے مطابق زمین پر ایک نورانی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔نور مذکور کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ آفتاب سے صادر ہوکر آیا ہے،مگر زمین پر پیدا ہوجانے والی شکل کے بارے میں نہیں کہہ سکتے کہ یہ شکل آفتاب میں سے اسی طرح نکلی ہے۔البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شکل آفتاب کی شعاؤں کے سبب پیدا ہوگئی ہے۔سو خلق یعنی پیدا کرنا ایک چیز ہے اور صدور دوسری۔پیدا کرنے والے میں اس کا عدم چاہئے،جس کو پیدا کرنا ہے۔اور صدور کے لئے لازم ہے کہ مصدر میں موجود ہو۔پھر صدور کی نوبت آئے۔سو بھلائیاں خدا سے صادر ہوئیں اور برائیاں اس نے پیدا کی ہیں۔اسی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ بری صورتیں۔بری سیرتیں۔بری آوازیں، پاخانہ، پیشاب خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔اس لئے شیطان کے بارے میں یہی کہیں گے کہ اس کی پیدائش کا سبب برائی ہی تھی۔

سوال۔شیطان کی پیدائش کس چیز سے ہے؟

جواب۔خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔**والجان خلقناه من قبل من نار السموم**۔یعنی ہم نے جان کو لوؤں کی آگ سے بنایا ہے۔یہ سچی فلاسفی الٰہی کلام کی ہے۔تمام وہ لوگ جن کے اعمال اچھے نہیں یا ان کے اچھے اعمال کم ہیں، وہ دوزخ کی گود میں رہیں گے۔وہی ان کی ماں ہے۔دیکھو قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔**و اما من خفت موازينه فامه هاويه و ما ادراک ماهي نار حاميه**۔یعنی جس کے عملوں کے تول ہلکے ہوئے،تو اس کی ماں،یعنی اس کا ٹھکانہ گڑھا ہوگا۔اور تم نہیں جانتے کہ وہ گڑھا کیا ہے۔وہ دھکتی ہوئی آگ ہے۔بھلا جس کی ماں دوزخ کی گرم آگ ہوئی، وہ لوؤں کی آگ سے نہ بنے ہوں،تو پھر کس سے بنے ہوں گے۔بائبل میں لکھا ہے۔سارے شریر شیطان یا شیطان کے فرزند ہیں (یوحنا ۸ باب ۴۴ آیت۔متی ۱۳ باب ۳۹ آیت۔متی ۱۶ باب ۲۳ آیت) جس طرح شریر شیطان کا فرزند ہے،اسی طرح دوزخ کی آگ شریر کی ماں ہے اور وہ لوؤں کی آگ سے بنا ہوا ہے۔جب عام شریروں کی ماں ہاویہ دوزخ ٹھہری،تو ان اشرار کا شرارتی باپ دشمنِ آدم لوؤں سے کیونکر نہ بنا ہوگا۔ضرور ہمارا دشمن نار السموم سے بنایا گیا۔

حقیقت وجود جنات

جن مخفی درمخفی ایک مخلوق خدا کا نام ہے اور یہ لفظ اکثر ارواح خبیثہ پر بھی بولا جاتا ہے۔اس زمانہ میں جب کہ ارواح کا انکار ہونے لگا ہے،تو پہلے تو اللہ تعالیٰ نے مائیکروسکوپ کی ایجاد کی راہ نکالی۔پھر آخراب ان اشیاء کی تحقیق پر توجہ دی جانے لگی ہے اور ہزاروں باریک اجسام ارواح خبیثہ کے نظر آنے لگے ہیں۔اس علم کا نام بیکٹر یالوجی اور بیالوجی ہے،جس کے ذریعہ ارواح کے اجسام لطیفہ دکھائے جاتے ہیں۔

لغت کی کتاب "قاموس العرب" میں لکھا ہے۔**جن الناس بالكسر و جنانهم بالفتح معظمهم**۔یعنی انسانوں میں جن بڑے آدمی کو کہتے ہیں۔اور جن ایک مخلوق بھی ہے،جس میں نیک و بد ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نور اور ظلمت دونوں کا خالق ہے۔نوری مخلوق کے مظاہر ہیں ملائکہ اور انبیاء و رسل، اولیاء اللہ اور دوسرے صلحاء اور راستباز۔یہ سب نوری مخلوق اور نور کے مظاہر ہیں۔اسی طرح ظلمت کی بھی ایک مخلوق ہوتی ہے اور اس کے مظاہر بھی ہوتے ہیں۔ظلمت کے فرزندوں میں سب سے بڑا وجود ابلیس کا ہے۔پھر اس کے مظاہر ہیں شریر اور بدچلن لوگ اور ہر قسم کی اذیت دینے والے۔ان مظاہر کو خواہ وہ نور کے ہوں یا ظلمت کے علیٰ مراتب دیکھتے بھی ہیں۔ملائکہ بھی بعض کو نظر آتے ہیں۔ہاں یہ ضروری نہیں ہے کہ سب کے سب ان کو دیکھ لیں۔

غرض جن بھی ایک مخلوق ہے۔حدیث میں سانپ، کالا کتا، مکھی، بھوری چیونٹی اور وبائی اجرام وغیرہ پر بھی جن کا لفظ بولا گیا ہے، کیونکہ یہ کیڑے تاریکی میں پرورش پاتے ہیں۔طاعون کے کیڑے کے متعلق لکھا ہے کہ وہ تاریکی میں پرورش پاتا ہے، اس لئے وہ ظلمت کی مخلوق ہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب شام ہو جائے تو اپنے دورازوں کو بند کرلو اور بچوں کو باہر نہ جانے دو۔کیونکہ تاریکی میں کیڑے نقصان پہنچاتے ہیں، دروازے بند ہوں، تو وہ ٹکر کھا کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔

جن اور جس قدر الفاظ اس مادہ سے بنتے ہیں، ان سب کے معنی پوشیدہ، مستور، عین الاعین، چھپے ہوئے، غیر مرئی کے ہیں، مثلاً جن، جُنہ، جنت، جنین۔جنون وغیرہ میں پوشیدگی کے معنے پائے جاتے ہیں۔جن وہ مخلوق ہے، جو آنکھوں سے دکھائی نہ دے۔جُنہ ڈھال کو کہتے ہیں، جس کے ذریعہ انسان اپنے آپ کو چھپاتا ہے۔جنت وہ زمین ہے، جس کو درختوں نے چھپا لیا ہو۔جنین وہ بچہ ہے، جو ماں کے شکم میں ہو۔جنون عقل پر پردہ پڑنا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ قرآن کریم میں اس مخلوق الٰہی غیر مرئی کے علاوہ اہل عرب کی ایک قوم "بنی جن" کا ذکر بھی ہے۔ چنانچہ عرب کا ایک شاعر نابغہ ذبیانی کہتا ہے۔

لقد قلت للنعمان یوم لقیته   یرید بنی جن ببرقة صادر

تجنب بنی جن فان لقائهم   کریه و ان لم تلق الّابصابر

ترجمہ۔(۱) البتہ میں نے نعمان کو کہا جس دن میں اس سے ملا کہ کیا وہ بنی جن سے لڑنے کو تیار تھا مقام صادر کے رتیلے کنکر یلے میدان میں۔(۲) علیحدہ رہ بنی جن سے، کیونکہ ان کا مقابلہ کرنا برا ہے، خواہ تم صابر آدمیوں سے ملو۔

اور ابونواس کہتا ہے۔

و کان منا الضحاک تعبده الجامل   والجن فی محاربها

ترجمہ۔ یعنی ضحاک ہم میں سے تھا، جسکی عبادت اونٹ والے، یعنی رؤسا، اور جن، یعنی بدوی لوگ محرابوں میں کرتے تھے۔

الغرض قرآن کریم وتواریخ صحیحہ سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانہ میں جن کا لفظ انسانوں پر بھی بولا جاتا تھا۔ سورہ سباء میں خداتعالیٰ فرماتا ہے۔ **و من الجن من یعمل بین یدیه باذن ربّه** ۔ یعنی جنوں میں ایک شخص حضرت سلیمان کے حضور اپنے آقا کے حکم سے کام کرتا تھا۔ اس کے متعلق تاریخ اور توریت میں لکھا ہے کہ بادشاہ صور نے ایک کاریگر کو جو صور کا رہنے والا تھا، حضرت سلیمان کے ہاں کام کرنے کو بھیجا تھا۔۔ اس کی نسبت سلاطین باب ۷ میں لکھا ہے۔ **و ارسل ملک سلیمان و اخذ حیرام من صور و هو ابن امراة ارملة من سبط نفتالی . ابوه رجل صوری نحاس و کان ممتلئاً حکمة و فهماً و معرفةً یعمل کل عمل فی النحاس و اتی الملک سلیمان و عمل کل عمله.** ترجمہ۔ یعنی سلیمان بادشاہ نے صور سے حیرام کو بلا بھیجا، جو نفتالی فرقے کی ایک بیوہ عورت کا بیٹا تھا اور اس کا باپ صور کا آدمی ٹھٹھیرا تھا۔ اور وہ دانش اور عقلمندی سے پُر تھا۔ وہ سلیمان بادشاہ کے پاس آیا اور وہ اس کے سب کام کرتا تھا۔

ہمارے ملک میں جب بعض عورتوں کو اختناق الرحم کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے، تو سادہ لوح اس کو جن کی پکڑ کہتے ہیں۔ اور اس کیلئے بہت کچھ تعویذ وتاگے کراتے پھرتے ہیں۔ مگر دراصل یہ ایک دماغی کیڑا ہوتا ہے، جسکے باعث یہ بیماری لاحق ہوتی ہے۔ اور واقعی ایسے کیڑوں کو لغت عرب میں "جن" ہی کہتے ہیں۔ اگر اس کا علاج حاذق اطباء وڈاکٹروں سے کرایا جائے، تو بہت جلدی فائدہ ہوتا ہے۔

خدا تعالیٰ پر قوی ایمان اور اسکی معرفت تامہ حاصل ہونے سے
ہرگز گناہ نہ سرزد ہونے کی فلاسفی

جب اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایسا ایمان پیدا ہو جائے کہ وہ یقین کے درجہ تک پہنچ جائے اور انسان محسوس کرے کہ اس نے گویا خدا کو دیکھ لیا ہے اور اس کی صفات سے واقفیت حاصل ہو جائے، تو گناہ سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور طبیعت جو پہلے گناہ کی طرف جھکتی تھی، اب ادھر سے ہٹتی اور نفرت کرتی ہے۔ یہی توبہ ہے۔

اور یہ بات کہ اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان کے بعد طبیعت گناہ سے متنفر ہو جاتی ہے، یہ بات آسانی اور صفائی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ دیکھو سنکھیا یا اور قسم کے زہر اور بعض زہریلے جانور، جن سے انسان ڈرتا ہے، صرف اس لئے کہ تجربہ نے بتا دیا ہے کہ اس درجہ پر یہ زہر ہلاک کر دیتے ہیں۔ بہتوں کو زہر سے ہلاک ہوتے دیکھا ہے، اس لئے طبیعت اس طرف نہیں جاتی، بلکہ ڈرتی ہے۔

جب کہ یہ بات ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ قسم قسم کے گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر راستہ میں ایک پیسہ پڑا ہوا ملے، تو جھک کے اس کو اٹھا لیں گے، حالانکہ تھوڑے سے اعلان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ پیسہ کس کا ہے۔ اکثر سنا اور دیکھا جاتا ہے کہ چندآنے کے لئے معصوم بچوں کی جانیں لی جاتی ہیں۔ عدالتوں میں جا کر دیکھو کہ کس قدر خوفناک اور تاریک نظارہ نظر آتا ہے۔ تھوڑی تھوڑی بات پر جھوٹ بولا جاتا ہے۔ فسق و فجور کا ایک دریا بہ رہا ہے۔ یہ صرف اس لئے ہے کہ خدا پر ایمان نہیں ہے۔ سانپوں اور زہروں سے ڈرتے ہیں، اس لئے کہ انہیں مہلک جانتے ہیں اور ان کے خطرناک ہونے کا یقین ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان ہو، تو میں نہیں سمجھتا کہ کیوں گناہ سے نفرت نہ پیدا ہو۔

انسان کے لئے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ بدی سے بچے اور دوسری یہ کہ نیکی کی طرف دوڑے۔ اور نیکی کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک ترک شر اور دوسرا افاضہ خیر۔ ترک شر سے انسان کامل نہیں بن سکتا، جب تک اس کے ساتھ افاضہ خیر شامل نہ ہو، یعنی دوسروں کو نفع پہنچانا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کس قدر تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔

اور یہ مدارج تب جا کر حاصل ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی صفات پر ایمان پیدا ہو جائے اور انسان ان کو جان لے۔ جب تک یہ بات نہ ہو، انسان بدیوں سے بچ نہیں سکتا۔ دوسروں کو نفع پہنچانا تو بڑی بات ہے۔ لوگ بادشاہوں کے رعب اور تعزیرات سے بھی تو ایک حد تک ڈرتے ہیں۔ اور بہت

سے لوگ ہیں جو اس وجہ سے قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ پھر کیوں ان میں احکم الحاکمین کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے سلسلے میں دلیری پیدا ہو جاتی ہے۔ کیا اس کی کوئی اور وجہ ہے بجز اس کے کہ اس پر ایمان نہیں ہے۔ یہی اصل باعث ہے۔

الغرض بدیوں سے بچنے کا مرحلہ تب طے ہوتا ہے، جب خدا پر ایمان ہو۔ پھر دوسرا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ ان راہوں کو تلاش کرے، جو خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں نے اختیار کئے۔ اور جن پر چل کر وہ خدا تعالیٰ کے فیض سے فیضیاب ہوئے۔ ان راہوں کا پتہ یوں لگتا ہے کہ انسان معلوم کرے کہ خدتعالیٰ نے انکے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ پہلا مرحلہ بدیوں سے بچنے کا تو خدا تعالیٰ کی جلالی صفات کی تجلی سے حاصل ہوتا ہے کہ وہ بدکاروں کا دشمن ہے۔ اور دوسرا مرتبہ خدا تعالیٰ کی جمالی تجلی سے ملتا ہے۔ اور آخر یہی ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوت اور طاقت نہ ملے، جسکو اسلامی اصطلاح کے موافق روح القدس کہتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوتا ہے۔ یہ ایک قوت ہوتی ہے، جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے۔ اسکے نزول کے ساتھ ہی دل میں ایک سکینت آتی ہے اور طبیعت میں نیکی کے ساتھ محبت اور پیار پیدا ہوتا ہے۔

جس نیکی کو دوسرے لوگ بڑی مشقت اور بوجھ سمجھ کر کرتے ہیں، یہ ایک لذت اور سرور کے ساتھ اس کی طرف دوڑتا ہے، جیسے لذیز چیز بچہ بھی شوق سے کھاتا ہے، اسی طرح جب خدا تعالیٰ سے تعلق پیدا ہو جاتا ہے، تو اس کی پاک روح اس پر اترتی ہے۔ پھر نیکیاں ایک لذیذ اور خوشبودار شربت کی طرح ہوتی ہیں۔ وہ خوبصورتی، جو نیکیوں کے اندر موجود ہے، وہ اس کو نظر آنے لگتی ہے اور وہ بے اختیار ان کی طرف دوڑتا ہے۔ بدی کے تصور سے بھی اس کی روح کانپ جاتی ہے۔ یہ امور اس قسم کے ہیں کہ ان کو الفاظ کے پیرایہ میں پورے طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ قلب کی حالتیں ہوتی ہیں، جن کا ٹھیک پتہ صرف محسوس کرنے سے چلتا ہے۔ انسان کو اس وقت تازہ بتازہ انوار ملتے ہیں۔

انسان صرف اس بات پر ہی ناز نہ کرے اور اپنی ترقی کی انتہاء اسی کو نہ سمجھ لے کہ کبھی کبھی اس کے اندر رقت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ رقت عارضی ہوتی ہے۔ انسان اکثر دفعہ ناول پڑھتا ہے اور اس کے دردناک حصے پر پہنچ کر بے اختیار رو پڑتا ہے، حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ یہ ایک جھوٹی اور فرضی کہانی ہے۔ پس اگر محض رو پڑنا یا رقت کا پیدا ہو جانا ہی حقیقی سرور اور لذت کی جڑھ ہوتی، تو آج یورپ سے بڑھ کر کوئی بھی روحانی لذت حاصل کرنے والا نہ ہوتا۔، کیونکہ ہزارہا ناول شائع ہوتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں انسان ان کو پڑھ کر روتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں ایک بات موجود ہے کہ ہنسی کے مقام پر ہنستا ہے اور

رونے کے مقام پر رو پڑتا ہے۔ان باتوں سے مناسب موقعہ پر ایک لذت بھی اٹھاتا ہے۔مگر یہ لذت کوئی روحانی فیصلہ نہیں کرسکتی۔کوئی کسی عورت پر عاشق ہوجاتا ہے اور اپنے عشق ہی میں اس کے ہجر میں شعر بنا بنا کر روتا ہے۔انسان کے اندر ایک طاقت ہے،خواہ اس کو محل پر استعمال کرے یا بے محل۔پس اس طاقت پر ہی بھروسہ کر کے نہ بیٹھ رہے۔اللہ تعالیٰ نے یہ طاقت اس لئے رکھی ہے کہ سچے سائل محروم نہ ہوں۔اور جب یہ برمحل استعمال ہو،تو آنے والے روحانی مدارج کا پیش خیمہ بنے اور تقویٰ کا کام دے۔غرض یہ امور کہ کبھی رو پڑنا اور کبھی دنیا کی دوسری چیزوں اور تعلقات سے انقطاع کرنا یہ عارضی ہوتا ہے۔ان پر اعتبار کر کے بے دست و پا نہ بنے۔وہ امور،جن پر سچی معرفت کی بنا ہے،یہ ہیں کہ وہ خدا کی راہ میں اگر بار بار آزمایا جائے اور مصائب اور مشکلات کے دریا میں ڈالا جائے،تب بھی ہرگز نہ گھبرائے۔اور قدم آگے ہی بڑھائے۔اس کے بعد اس کی معرفت کا انکشاف ہوتا ہے۔اور یہی سچی نعمت حقیقی راحت ہوتی ہے۔اس وقت دل میں ایک رقت پیدا ہوتی ہے۔مگر یہ رقت عارضی نہیں ہوتی، بلکہ سرور اور لذت سے بھری ہوتی ہے۔روح پانی کے ایک مصفّا چشمے کی طرح خدا کی طرف بہتی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ سمندر سے پہلے ایک سیراب آتا ہے،وہ بھی سمندر ہی نظر آتا ہے۔جو کوئی سیراب کو دھوکہ سمجھ کر آگے چلنے سے رک جاتا ہے اور مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے،وہ ناکام اور نامراد رہتا ہے۔لیکن جو ہمت نہیں ہارتا اور قدم آگے بڑھاتا ہے،وہ منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔خدا تعالیٰ نے مختلف کیفیتیں انسانی روح کے اندر رکھی ہوئی ہیں۔ان میں سے رقت کی بھی ایک کیفیت ہے۔کوئی فقط شعر خوانی یا خوش الحانی ہی سے متاثر ہوجاتا ہے۔کوئی آگے چلتا ہے اور ان پر قانع نہ ہو کر صبر کے ساتھ اصل مرحلہ تک پہنچتا ہے۔یہ یاد رکھو کہ سچائی کے طالب کے واسطے یہ شرط ہے کہ جہاں سے اس کو سچائی ملے لے لے۔یہ ایک نور ہے،جو اس کی رہبری کرتا ہے۔

یہ بھی خوب یاد رکھو کہ نرا بدی سے پرہیز کرنا ہی بڑی خوبی نہیں ہے،جب تک اس کے ساتھ نیکیاں نہ کی جائیں۔ بہت سے لوگ ایسے موجود ہوں گے،جنہوں نے کبھی زنا نہیں کیا،خون نہیں کا، چوری نہیں کی،ڈاکا نہیں مارا اور باوجود اس کے اللہ تعالیٰ کی راہ میں کوئی صدق اور وفا کا نمونہ انہوں نے نہیں دکھایا یا نوع انسان کی کوئی خدمت نہیں کی اور اس طرح پر کوئی نیکی نہیں کی۔پس جاہل ہوگا وہ شخص جو ان باتوں کو پیش کر کے اسے نیکو کاروں میں داخل کرے۔ایک بکری جو سیّات (برائیوں) سے مبرا ہوتی ہے،کیا وہ نیکوں کے زمرے میں داخل ہوسکتی ہے۔تقویٰ ادنی مرتبہ ہے۔اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کسی برتن کو اچھی طرح صاف کیا جائے،تا کہ اس میں اعلیٰ درجہ کا لطیف کھانا ڈالا جائے۔اب اگر کسی

برتن کوخوب صاف کر کے رکھ دیا جائے، لیکن اس میں کھانا نہ ڈالا جائے ،تو کیا اس سے پیٹ بھر سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ کیا وہ خالی برتن طعام سے سیر کر دے گا، ہرگز نہیں۔اسی طرح پر تقویٰ کو سمجھو۔تقویٰ کیا ہے۔ نفس امارہ کے برتن کو صاف کرنا۔

نفس کی تین اقسام ہیں۔نفس امّارہ،نفس لوامہ،نفس مطمئنہّ ۔ایک نفس زکیہّ بھی ہوتا ہے،مگر وہ بچپن کی حالت ہے، جب گناہ ہوتا ہی نہیں۔اس لئے اس نفس کو چھوڑ کر بلوغ کے بعد تین نفسوں پر ہی بحث کی جاتی ہے۔نفس امارہ کی وہ حالت ہے، جب انسان شیطان اور نفس کا بندہ ہوتا ہے اور نفسانی خواہشوں کا غلام اور اسیر ہو جاتا ہے۔جو حکم نفس کرتا ہے اس کی تعمیل کے واسطے اس طرح تیار ہو جاتا ہے، جیسے ایک غلام دست بستہ اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کے لئے مستعد ہوتا ہے۔اس وقت یہ نفس کا غلام ہو کر جو وہ کہے کرتا ہے۔وہ کہے خون کر،تو یہ کرتا ہے، زنا کہے، چوری کہے، جو کچھ بھی کہے،سب کے لئے تیار ہوتا ہے۔کوئی بدی کوئی برا کام ہو، جو نفس کہے یہ غلاموں کی طرح کر دیتا ہے۔یہ نفس امارّہ کی حالت ہے۔اور یہ وہ شخص ہے، جو نفس امارّہ کا تابع ہے۔اس کے بعد نفس لوامّہ ہے۔یہ ایسی حالت ہے کہ گناہ تو اس سے بھی سرزد ہوتے رہتے ہیں،مگر وہ نفس کو ملامت کرتا رہتا ہے۔اور اس تدبیر اور کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اسے گناہ سے نجات مل جائے۔جو لوگ نفس لوامّہ کے ماتحت یا اس حالت میں ہوتے ہیں، جو ایک جنگ کی حالت ہوتی ہے،یعنی شیطان اور نفس سے جنگ کرتے رہتے ہیں۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نفس غالب آ کر لغزش ہو جاتی ہے اور کبھی خود نفس پر غالب آ جاتے ہیں اور اس کو دبا لیتے ہیں۔یہ لوگ نفس امارہ والوں سے ترقی کر جاتے ہیں۔نفس امارہ والے انسان اور دوسرے بہایم میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔جیسے کتا یا بلی، جب کوئی برتن ننگا دیکھتے ہیں،تو فوراً جا پڑتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ اس چیز پر ان کا حق ہے یا نہیں۔اسی طرح ہر نفس امارہ کے غلام انسان کو جب کسی بدی کا موقعہ ملتا ہے تو فوراً اسے کر بیٹھتا ہے اور تیار رہتا ہے۔اگر راستہ میں دو چار روپے پڑے ہوں،تو فی الفوران کے اٹھانے کے لئے تیار ہو جائے گا اور نہیں سوچے گا کہ اس کو ان کے لینے کا حق ہے یا نہیں۔مگر لوامہ والے کی یہ حالت نہیں۔وہ حالت جنگ میں ہے، جس میں کبھی نفس غالب آتا ہے کبھی وہ غالب۔ابھی کامل فتح نہیں ہوئی۔مگر تیسری حالت، جو نفس مطمئنہ کی حالت ہے، یہ وہ حالت ہے جب ساری لڑائیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور کامل فتح ہو جاتی ہے۔اس لئے اس کا نام نفس مطمئنہ رکھا ہے، یعنی اطمینان یافتہ۔اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان سچا لاتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ واقعی خدا ہے۔نفس مطمئنہ کی انتہائی حد خدا تعالیٰ پر ایمان ہوتا ہے۔کیونکہ کامل اطمینان اور تسلی اس وقت ملتی ہے، جب اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان ہو۔

یقیناً سمجھو کہ ہر ایک پاکبازی اور نیکی کی جڑھ خدا پر ایمان لانا ہے۔ جس قدر انسان کا ایمان باللہ کمزور ہوتا ہے، اسی قدر اعمال صالحہ میں کمزوری اور سستی پائی جاتی ہے۔ لیکن جب ایمان قوی ہو اور اللہ تعالیٰ کو اس کی تمام صفات کاملہ کے ساتھ یقین کرلیا جائے، اسی قدر عجیب رنگ کی تبدیلی انسان کے اعمال میں پیدا ہو جاتی ہے۔ خدا پر ایمان رکھنے والا گناہ پر قادر نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ ایمان اس کے اعضا سے نفس امارہ کی قوتوں کو سلب کر دیتا ہے۔ دیکھو اگر کسی کی آنکھیں نکال دی جائیں، تو وہ آنکھوں سے بدی ءنظر کیونکہ کرسکتا ہے اور آنکھوں کا گناہ کیسے کرے گا۔ اور اگر ایسا ہی ہاتھ کاٹ دیئے جائیں یا شہوانی قویٰ کاٹ دیئے جائیں، پھر وہ گناہ جو ان اعضا سے متعلق ہیں کیسے کرسکتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح پر جب ایک انسان نفس مطمئنہ کی حالت میں ہوتا ہے، تو نفس مطمئنہ اسے اندھا کر دیتا ہے اور اس کی آنکھوں میں گناہ کی قوت نہیں رہتی۔ وہ دیکھتا ہے، مگر آنکھوں کے گناہ کی نظر سلب ہو جاتی ہے۔ وہ کان رکھتا ہے، مگر بہرہ ہوتا ہے۔ اور وہ باتیں، جو گناہ کی ہیں، وہ نہیں سن سکتا۔ اس طرح پر اسکی تمام نفسانی اور شہوانی قوتیں اور گناہوں کی خواہشات سلب کی جاتی ہیں۔ اس کی ان ساری طاقتوں پر، جن سے گناہ صادر ہو سکتا تھا، ایک موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور وہ بالکل ایک میت کی طرح ہو جاتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ ہی کی مرضی کے تابع ہوتا ہے۔ وہ اس کے سوا ایک قدم نہیں اٹھا سکتا۔ یہ وہ حالت ہوتی ہے، جب خدا تعالیٰ پر سچا ایمان ہو، اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کامل اطمینان اسے دیا جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے، جس کے متعلق حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "فتوح الغیب" میں لکھتے ہیں۔ **فحینئذٍ تکون وارث کل رسول و نبی و صدیق فتعطے کلما اعطوا من الانوار و الاسرار و البرکات والمخاطبات و الوحی والمکالمات و غیرھا من آیات رب العٰلمین۔**
ترجمہ۔ جب تو اس حالت کو پہنچے، تو اس وقت ہر رسول و نبی وصدیق کا وارث ہوگا۔ اور جو انوار و اسرار و برکات انکو دیئے گئے اور جو مخاطبہ اور وحی و مکالمہ کا شرف انکو خدا تعالیٰ نے عطا کیا وہی تجھ کو عطا کریگا۔

گناہوں سے بچنے کا صرف ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ ہے کہ اس بات پر کامل یقین انسان کو ہو جائے کہ خدا ہے اور وہ جزا سزا دیتا ہے۔ جب تک اس اصول پر یقین کامل نہ ہو، گناہ کی زندگی پر موت وارد نہیں ہوسکتی۔

دراصل خدا ہے اور ہونا چاہئے۔ یہ دو لفظ ہیں، جن میں بہت بڑے غور اور فکر کی ضرورت ہے۔ پہلی بات کہ خدا ہے، یہ بات علم الیقین اور حق الیقین کی تہ دل سے نکلتی ہے۔ اور دوسری بات قیاسی اور ظنی

ہے۔مثلاً ایک شخص، جو فلاسفر اور حکیم ہو، وہ صرف نظام شمسی اور دیگر اجرام اور مصنوعات پر نظر کر کے صرف اتنا ہی کہہ دے کہ اس ترتیب محکم اور ابلغ نظام کو دیکھ کر میں کہتا ہوں کہ ایک مدبر اور حکیم اور علیم صانع کی ضرورت ہے، تو اس سے انسان یقین کے ساتھ اس درجہ پر ہر گز نہیں پہنچ سکتا، جو ایک شخص اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہو کر نشان اپنے ساتھ رکھ کر کہتا ہے کہ واقعی ایک قدر مطلق خدا ہے۔ وہ معرفت اور بصیرت کی آنکھ سے اسے دیکھتا ہے۔ان دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ ایک حکیم یا فلاسفر، جو صرف قیاسی طور پر خدا کے وجود کا قائل ہے، سچی پاکیزگی اور خدا ترسی کے کمال کو حاصل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ ظاہر بات ہے کہ نری ضرورت کا علم کبھی بھی اپنے اندر وہ قوت اور طاقت نہیں رکھتا، جو ایسا رعب پیدا کر کے اسے گناہ کی طرف دوڑنے سے بچا لے اور اس تاریکی سے نجات دے، جو گناہ سے پیدا ہوتی ہے۔مگر جو براہ راست خدا کا جلال آسمان سے مشاہدہ کرتا ہے، وہ نیک کاموں اور وفاداری اور اخلاص کے لئے اس جلال کے ساتھ ہی ایک قوت اور روشنی پاتا ہے، جو اس کو بدیوں سے بچا لیتی اور تاریکی سے نجات دیتی ہے۔ اس کی بدی کی قوتیں اور نفسانی جذبات پر خدا کے مکالمات اور پُر رعب مکاشفات سے ایک موت وارد ہو جاتی ہے۔ اور وہ شیطانی زندگی سے نکل کر ملائکہ کی سی زندگی بسر کرنے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارادے اور اشارے پر چلنے لگتا ہے، جیسے ایک شخص آتش سوزندہ کے نیچے بدکاری نہیں کر سکتا۔اسی طرح جو شخص خدا کی جلالی تجلیات کے نیچے آتا ہے، اس کی شیطنت مر جاتی ہے اور اس کے سانپ کا سر کچلا جاتا ہے۔پس یہی وہ یقین اور موت ہوتی ہے، جس کو انبیاء علیہم السلام آ کر دنیا کو عطا کرتے ہیں، جس کے ذریعہ سے وہ گناہ سے نجات پا کر پاک زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔اور یہ بات کہ محض اس یقین ہی سے انسان پاک زندگی بسر کر سکتا ہے اور گناہ کی موت سے بچ سکتا ہے ایسی صاف ہے جس کے لئے ہم کو منطقی دلائل کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ خود انسان کی فطرت اور روزمرہ کا تجربہ اور مشاہدہ اس کے لئے زبردست گواہ ہیں کہ جب تک یہ یقین کامل نہ ہوگا کہ خدا ہے اور وہ گناہ سے نفرت کرتا ہے اور سزا دیتا ہے، کوئی اور حیلہ کسی صورت میں کارگر ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن اشیاء کی تاثیرات کی عمدگی کا ہم کو علم ہے ہم کیسے دوڑ دوڑ کر ان کی طرف جاتے ہیں۔اور جن چیزوں کو اپنے وجود کے لئے خطرناک زہریں سمجھتے ہیں ان سے کیسے بھاگتے ہیں۔مثال کے طور پر دیکھو اگر ہمیں یقین ہو کہ فلاں جھاڑی میں سانپ ہے، تو کوئی بھی ہم میں سے ہوگا جو اس میں اپنا ہاتھ ڈالے یا قدم رکھ دے، ہر گز نہیں۔ بلکہ اگر کسی بل میں سانپ کے ہونیکا معمولی وہم بھی ہو تو اس طرف سے گزرنے میں ہر وقت مضائقہ ہوگا۔طبیعت خود بخود اس طرف جانے

سے رُکے گی۔ ایسا ہی زہروں کی بابت جب ہمیں علم ہوتا ہے مثلاً اسٹرکنیا ہے کہ اس کے کھانے سے آدمی مر جاتا ہے، تو کیسے اس سے بچتے اور ڈرتے ہیں۔

ایک محلّہ میں طاعون ہو، تو اس سے بھاگتے ہیں اور وہاں قدم رکھنا آتشین تنور میں گرنا سمجھتے ہیں۔ اب وہ بات کیا ہے، جس نے دل میں یہ خوف و ہراس پیدا کیا ہے کہ کسی صورت میں بھی دل اس طرف کا ارادہ نہیں کرتا۔ وہ وہی یقین ہے جو اس کی مہلک اور مضر تاثیرات پر ہو چکا ہے۔ اس قسم کی بیشمار نظیریں ہم دے سکتے ہیں اور یہ ہماری زندگی میں روزمرہ پیش آتی ہیں۔

اب یہ بحثیں کہ گناہ سے بچنے کا یہ ذریعہ ہے یا فلاں حیلہ ہے، بالکل بے سود اور بے مطلب نہیں، کیونکہ جب تک الٰہی تجلیات کے رعب اور گناہ کے زہر اور اس کے خطرناک نتائج کا پورا علم نہ ہو، ایسا علم، جو یقین کامل تک پہنچ گیا ہو، گناہ سے نجات نہیں ہو سکتی۔

یہ ایک خیالی اور بالکل بے معنی بات ہے کہ کسی کا خون گناہ سے پاک کر سکتا ہے۔ خون یا خودکشی کو گناہ سے کیا تعلق؟ وہ گناہ کے زائل کرنیکا طریق نہیں۔ ہاں اس سے گناہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اور تجربہ نے شہادت دی ہے کہ اس مسئلہ کو مان کر کہاں سے کہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔

میں ہمیشہ یہی کہتا ہوں کہ گناہ سے بچنے کی سچی فلاسفی یہی ہے کہ گناہ کی ضرر دینے والی حقیقت کو پہچان لیں اور اس بات پر یقین کر لیں کہ ایک زبردست ہستی ہے، جو گناہ سے نفرت کرتی ہے اور گناہ کرنیوالے کو سزا دینے پر قادر ہے۔ دیکھو اگر کوئی شخص کھڑا ہو اور اس کا کچھ اسباب متفرق طور پر پڑا ہوا ہو، تو کوئی یہ جرات نہیں کرے گا کہ اس اسباب کا کوئی حصہ چرا لے، خواہ چوری کے کیسے ہی قوی محرک ہوں اور وہ کیسا ہی اس بدعادت میں مبتلا ہو۔ مگر اس وقت اس کی ساری قوتوں اور طاقتوں پر موت وارد ہو جائیگی اور اسے ہرگز جرات نہ ہو سکے گی۔ اور اس طرح پر وہ اس چوری سے ضرور بچ جائیگا۔ اس طرح پر ہر قسم کے خطاکاروں اور شریروں کا حال ہے کہ جب انہیں ایسی قوت کا پورا علم ہو جاتا ہے، جو ان کی اس شرارت پر سزا دینے پر قادر ہے، تو وہ جذبات ان کے دب جاتے ہیں۔ یہی سچا طریق گناہ سے بچنے کا ہے کہ انسان خدا تعالیٰ پر کامل یقین پیدا کرے اور اس کے سزا و جزا دینے کی قوت پر معرفت حاصل کرے۔ یہ نمونہ گناہ سے بچنے کے طریق کے متعلق خدا نے ہماری فطرت میں رکھا ہوا ہے۔

بدی ایک ایسا ملکہ ہے جو انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔ اور دل بے اختیار ہو ہو کر قابو سے نکل جاتا ہے۔ خواہ کوئی یہ کہے کہ شیطان حملہ کرتا ہے، خواہ کسی اور طرز پر اس کو بیان کیا جائے، یہ ماننا پڑے گا کہ آجکل بدی کا زور ہے اور شیطان اپنی حکومت اور سلطنت کو قائم کرنا چاہتا ہے۔ بدکاری اور

بے حیائی کے دریا کا بند ٹوٹ پڑا ہے اور وہ اطراف میں طوفانی رنگ میں جوش زن ہے۔ پس کس قدر ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ، جو ہر مصیبت اور مشکل کے وقت انسان کا دستگیر ہوتا ہے، اس وقت اسے ہر بلا سے نجات دے۔ چنانچہ اس نے اپنے فضل سے اس سلسلہ اسلام کو قائم کیا ہے تا کہ وہ اس سیلاب سے بچنے کے واسطے مختلف حیلے نکالے۔ اور جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے عیسائیوں نے جو کچھ پیش کیا ہے، وہ ایک ایسی بات ہے کہ جسکے بیان کرنے سے بھی شرم آتی ہے۔ پھر اسکا علاج وہی ہے، جو خدا نے انسان کی فطرت میں رکھا ہوا ہے، یعنی یہ کہ وہ مفید اور نفع رساں چیزوں کی طرف رغبت کرتا ہے اور مضر اور نقصان رساں چیزوں سے دور بھاگتا ہے اور نفرت کرتا ہے۔ دیکھو سونے اور چاندی کو اپنے لئے مفید سمجھتا ہے، تو اسکی طرف کیسی رغبت کرتا ہے اور کن کن محنتوں اور مشکلات سے بہم پہنچاتا ہے۔ اور پھر کن حفاظتوں سے اسے رکھتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص سونے چاندی کو تو پھینک دے اور اسکی بجائے مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے اٹھا کر اپنے صندوقوں میں بند کر کے انکی حفاظت کرنے لگے، تو کیا ڈاکٹر اسکی دیوانگی کا فتویٰ نہ دیں گے، ضرور دیں گے۔ اسی طرح پر جب ہمیں یہ محسوس ہو جائے کہ خدا ہے اور وہ بدی سے نفرت کرتا اور نیکی سے پیار کرتا ہے اور نیکیوں کو عزیز رکھتا ہے، تو ہم دیوانہ وار نیکیوں کی طرف دوڑیں گے اور گناہ کی زندگی سے دور بھاگیں گے۔ یہی ایک اصول ہے جو نیکی کی قوت کو طاقت بخشتا اور نیکی کے قویٰ کو تحریک دیتا ہے اور بدی کی قوتوں کو ہلاک کرتا ہے اور شیطان کی ذریت کو شکست دیتا ہے۔

جب واقعی طور پر اس آفتاب کی طرح، جو اس وقت دنیا پر چمکتا ہے، خدا پر ہمیں یقین حاصل ہو جائے اور ہم خدا کو گویا دیکھ لیں، تو یقیناً ہماری سفلی زندگی پر موت وارد ہو جاتی ہے اور اس کی بجائے ایک آسمانی زندگی پیدا ہو جاتی ہے، جیسے انبیاء علیہم السلام اور دوسری راستبازوں کی زندگیاں تھیں۔

خدا کی رحمت فرمانبرداروں اور راستبازوں پر ہوتی ہے، جو خدا کے حضور نیکی اور پاکیزگی کا تحفہ لے کر جاتے ہیں اور شرارتوں اور بدکاریوں سے اسلئے دور رہتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ سے بُعد اور حرماں کا موجب ہیں۔ ایسے لوگ ایک پاک چشمہ سے دھوئے جاتے ہیں، جسکا دھویا ہوا پھر کبھی میلا اور ناپاک نہیں ہوتا۔ اور انہیں وہ شربت پلایا جاتا ہے، جسکے پینے والا کبھی پیاسا نہیں ہوتا۔ انہیں وہ زندگی عطا ہوتی ہے، جس پر کبھی موت وارد نہیں ہوتی۔ انہیں وہ جنت دی جاتی ہے، جس سے کبھی نکلنا نہیں ہوتا، برخلاف اسکے وہ لوگ جو اس چشمہ سے سیراب نہیں ہوتے اور خدا کے ہاتھوں سے جنکا مسح نہیں ہوتا وہ خدا سے دور ہو جاتے ہیں اور شیطان کے قریب ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے خدا کی طرف آنا

چھوڑ دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ نہ ان میں تسلی کی کوئی راہ باقی ہے نہ انکے پاس دلائل ہیں اور نہ تاثیرات۔

سوال۔ باوجود ایمان ہونے کے انسان سے گناہ کیوں سرزد ہوتے ہیں؟

جواب۔ آپ کیوں کہتے ہیں کہ ایمان ہے۔ ایمان تو انسان کے نفسانی جذبات کو مردہ کر دیتا ہے اور گناہ کی قوتوں کو سلب کر دیتا ہے۔ آپ کو یہ سوال کرنا چاہئے کہ گناہ سے بچنے کا علاج کیا ہے؟ میں کبھی نہیں مان سکتا کہ ایمان ہو اور گناہ بھی ہو۔ ایمان روشنی ہے۔ اس کے سامنے گناہ کی ظلمت رہ نہیں سکتی۔ بھلا کبھی ہوسکتا ہے کہ دن چڑھا ہوا ہو اور رات کی تاریکی بھی بدستور موجود ہو۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ پس دراصل یہ سوال رہ جاتا ہے کہ گناہ سے کیونکر بچیں۔

علاج گناہ

یاد رکھو کہ جب مریض طبیب کے پاس جاتا ہے، تو طبیب اس کے مرض کو تشخیص کر کے ایک علاج بتا دیتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ بیمار کو متنبہ کر دے کہ علاج کرنا یا نہ کرنا مریض کے اپنے اختیار میں ہے۔ وہ اسے بتا دیتا ہے کہ داغ لگا نیکی جگہ ہے، تو داغ لگاؤ یا جونک لگاؤ وغیرہ یعنی جو علاج ہو، وہ بتا دیگا۔ اسی طرح ہم اصل علاج بتائے دیتے ہیں، کرنا یا نہ کرنا ہر شخص کے اپنے اختیار میں ہے۔ پس اصل بات یہ ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ ان آنکھوں سے نظر نہیں آتا اور نہ ان حواس سے ہم اس کو محسوس کر سکتے ہیں، کیونکہ اگر وہ ان محسوسات میں سے ہوتا، جن کے لئے یہ حواس ہیں، تو وہ بیشک نظر آ جاتا یا محسوس ہوسکتا۔ مگر ان حواس میں سے کوئی حِس اس کے لئے کارآمد نہیں۔ اس کی شناخت کے خاص وسائل اور دوسرے حواس ہیں۔ اگرچہ حکیموں، برہموؤں اور فلاسفروں نے بجائے خود ٹکریں ماری ہیں۔ لیکن وہ سب غلطیوں میں مبتلا ہیں اور وہ ایمان، جو انسان کی زندگی میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا کرتا ہے، وہ ان کو نصیب نہیں ہوا۔ جب خود ان کی یہ حالت ہے، تو وہ دوسروں کے لئے کیونکر ہادی اور راہنما ہو سکتے ہیں۔ جو خود مشکلات میں مبتلا ہوں اور جن کو خود سکینت اور اطمینان نصیب نہ ہو، وہ دوسروں کے لئے کیا اطمینان کا موجب ہوں گے۔ اس سلسلہ کی راہ کے چراغ دراصل انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ پس جو شخص چاہتا ہے کہ خود ایمان حاصل کرے، اس کا فرض ہے کہ اس راہ کو تلاش کرے اور اس پر چلے۔ بدوں اس کے ممکن نہیں کہ معرفت اور سچا گیان مل سکے، جو گناہ سے بچاتا ہے۔ ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس شے کا اتباع اس وقت حقیقی ایمان اور گیان پیدا کر دیتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب انسان سچائی پر قدم مارنے لگتا ہے، تو اس کو مشکلات اور ابتلا پیش آتے ہیں۔ برادری اور قوم کا ڈراسے دھمکاتا ہے۔ لیکن اگر وہ فی الحقیقیت سچائی سے پیار کرتا ہے اور اس کی قدر کرتا ہے، تو وہ ان ابتلاؤں میں سے نکل جاتا ہے۔

ورنہ اس کا نفاق ظاہر کر دیتا ہے۔مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی سچائی کو قبول کرنے میں کسی ننگ و عار کی پرواہ نہ کرے۔جب تک وہ ان قیود کا پابند نہیں، وہ مومن نہیں ہوسکتا۔

از عمل ثابت کن آں نورے کہ در ایمان تست دل چو وادی یوسفے را راہ کنعاں را گزین

خدا تعالیٰ پر ایمان دو قسم کا ہے۔ایک وہ ہے، جو صرف زبان تک محدود ہے اور اس کا اثر افعال اور اعمال پر کچھ نہیں۔دوسری قسم ایمان باللہ کی یہ ہے کہ عملی شہادتیں اس کے ساتھ ہوں۔پس جب تک یہ دوسری قسم کا ایمان پیدا نہ ہو، میں نہیں کہہ سکتا کہ ایک آدمی خدا کو مانتا ہے۔یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک شخص اللہ تعالیٰ کو مانتا بھی ہو اور پھر گناہ بھی کرتا ہو۔دنیا کا بہت بڑا حصہ پہلے قسم کے ماننے والوں کا ہے، جو اقرار کرتے ہیں کہ ہم خدا کو مانتے ہیں، مگر میں دیکھتا ہوں کہ اس اقرار کے ساتھ ہی وہ دنیا کی نجاستوں میں مبتلا اور گناہ کی کدورتوں سے آلودہ ہیں۔کوئی پرمیشر کہتا ہے، کوئی گاڈ کہتا ہے، کوئی اور نام رکھتا ہے۔مگر جب عملی پہلو سے ان کے ایمان اور اقرار کا امتحان لیا جائے، تو دیکھا جائے گا کہ وہ نرا دعویٰ ہے، جس کے ساتھ عملی شہادت کوئی نہیں۔

انسان کی فطرت میں یہ امر واقعہ ہے کہ وہ جس چیز پر ایمان لاتا ہے، اس کے نقصان سے بچنے اور اس کے منافع کو لینا چاہتا ہے۔دیکھو سنکھیا ایک زہر ہے اور انسان کو اگر اس بات کا علم ہے کہ اس کی ایک رتی بھی ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے، تو پھر وہ کبھی اس کو کھانے کی جرات نہیں کرتا۔اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اس کا کھانا ہلاک ہونا ہے۔پھر وہ کیوں خدا تعالیٰ کو مان کر وہ نتائج پیدا نہیں کرتا، جو ایمان باللہ سے منسلک ہیں۔اگر سنکھیا کے برابر بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان ہو، تو اس کے جذبات اور جوشوں پر موت وارد ہو جائے۔مگر نہیں، یہ کہنا پڑیگا کہ یہ نرا قول ہی قول ہے۔ایمان کو یقین کا رنگ نہیں دیا گیا۔یہ اپنے نفس کو دھوکا دینا ہے۔پس انسان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے اس ایمان کو درست کرے، جو وہ اللہ تعالیٰ پر رکھتا ہے۔یعنی اس کو اپنے اعمال سے ثابت کر دکھائے۔اس طرح کہ کوئی ایسا عمل اس سے سرزد نہ ہو، جو اللہ تعالیٰ کی شان اور اس کے احکام کے خلاف ہو۔یہ دھوکا جو انسان کو لگتا ہے کہ وہ خدا کو مانتا ہے باوجودیکہ عملی شہادت اس ایمان کے ساتھ نہیں ہوتی، درحقیقت یہ بھی ایک قسم کا مرض ہے، جو خطرناک ہے۔مرض دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک وہ، جس کا درد محسوس ہوتا ہے، جیسے دردسر یا درد گردہ وغیرہ۔دوسری قسم کے مرض کو مرض مستوی کہتے ہیں۔اس مرض کا درد محسوس نہیں ہوتا اور اس لئے مریض اس کے علاج سے تساہل اور غفلت کرتا ہے، جیسے برص کا داغ۔بظاہر اس کا کوئی درد یا دکھ محسوس نہیں ہوتا۔لیکن آخر کو یہ خطرناک نتائج پیدا کرتا ہے۔پس خدا پر ایسا ایمان، جو عملی شہادتیں ساتھ نہیں رکھتا، وہ ایک قسم کا

مرض مستوی ہے۔صرف رسم وعادت کے طور پر مانتا ہے کیونکہ باپ دادا سے سنا تھا کہ کوئی خدا ہے،اس لئے مانتا ہے۔اپنی ذات پر محسوس کرکے کب اس نے اقرار کیا۔یہ اقرار،جس دن اس رنگ میں پیدا ہوتا ہے،ساتھ ہی گناہوں کی میل کچیل کو جلا کر صاف کر دیتا ہے اور اس کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔جب تک آثار ظاہر نہ ہوں ماننا یا نہ ماننا برابر ہیں۔اس کی وجہ یہی ہے کہ یقین نہیں ہوتا۔اور یقین کے بغیر ثمرات ظاہر نہیں ہوسکتے۔دیکھو جن خطرات کا انسان کو یقین ہوتا ہے،ان کے نزدیک ہرگز نہیں جاتا۔ مثلاً یہ خطرہ ہو کہ گھر کا شہتیر ٹوٹا ہوا ہے،تو وہ کبھی اس کے نیچے جانے اور رہنے کی دلیری نہ کرے گا یا یہ معلوم ہو کہ فلاں مقام پر سانپ رہتا ہے اور وہ رات کو پھرا بھی کرتا ہے،تو کبھی یہ رات کو اٹھ کر وہاں نہ جائیگا۔کیونکہ اس کے نتائج کا قطعی اور یقینی علم رکھتا ہے۔پس اگر خدا کو مان کر سنکھیا جتنا بھی اثر اور یقین نہ ہو،تو سمجھ لو کہ کچھ بھی نہیں مانتا۔اصل بات یہ ہے کہ جب طبیب کے پاس کوئی بیمار جاتا ہے،تو اس وقت تک وہ اس کا علاج نہیں کرسکتا،جب تک وہ تشخیص نہ کرلے کہ مرض کا اصلی سبب کیا ہے۔ٹھیک یہی حال گناہ کا ہے۔کیونکہ گناہ ایک روحانی مرض ہے۔جب تک اس کی ماہیت معلوم نہیں ہوتی،اس وقت تک انسان گناہ سے نہیں بچ سکتا۔

سوال۔انسان گناہ کی طرف کیوں جھکتا ہے۔اور گناہ کا خیال پیدا ہی کیوں ہوتا ہے؟

جواب۔اس کا جواب یہ ہے کہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اس وقت تک انسان گناہ کرتا ہے، جب تک کہ وہ خدا سے بیخبر ہوتا ہے۔بھلا کوئی شخص،جو چوری کرتا ہے،وہ اس وقت کرتا ہے جب کہ گھر کا مالک جاگتا ہو اور روشنی بھی ہو یا اس وقت کرتا ہے،جب کہ مالک سویا ہوا ہو اور ایسا اندھیرا ہو کہ کچھ دکھائی نہ دیتا ہو۔صاف ظاہر ہے کہ وہ اس وقت چوری کرتا ہے جب وہ یقین کرتا ہے کہ مالک بے خبر ہے اور روشنی نہیں ہے۔اسی طرح پر ایک شخص جو گناہ کرتا ہے،وہ اس وقت کرتا ہے جب کہ خدا سے بے خبر ہو جاتا ہے اور اس کو اس پر کچھ یقین نہیں ہوتا،نہ کہ اس وقت جب اسے یقین ہو کہ خدا ہے اور وہ اس کے اعمال کو دیکھتا ہے اور اس کو سزا دے سکتا ہے۔اور یہ علم ہو کہ اگر میں کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف کرونگا،تو وہ اس کی سزا دیگا۔جب یہ علم اور یقین خدا کی نسبت ہو،تو پھر گناہ کی طرف میل اور توجہ نہیں ہو سکتی۔جب انسان یہ یقین رکھتا ہے کہ میں ہمیشہ اس کے ماتحت ہوں اور وہ میری بداعمالیوں کو دیکھتا ہے،تو پھر وہ جرات نہیں کرسکتا۔جیسے ایک بھیڑ کو بھیڑیئے کے سامنے باندھ ڈالا جائے،تو کسی دوسرے کھیت کی طرف جانا تو درکنار اس کے سامنے کتنا ہی گھاس کھانے کے لئے ڈالا جائے،وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا،کیونکہ جان کا خوف اس پر غلبہ کئے ہوئے ہے۔پس جب خوف ایک وحشی

جانور تک پر اتنا اثر کرسکتا ہے کہ وہ کھانا تک چھوڑ دیتا ہے، تو پھر انسان جب اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سامنے اس طرح سمجھے اور یقین کرے کہ وہ دیکھتا ہے اور گناہ پر سزا دیتا ہے، تو اس یقین کے بعد گناہ کی طرف متوجہ نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ صاعقہ کی طرح اس پر گرے گا اور تباہ کردے گا۔ پس یہ خوف، جو خدا تعالیٰ کو بزرگ و برتر اور قدرت والا ماننے سے پیدا ہوتا ہے، اس کو گناہ سے بچائے گا۔ اور یہ سچا ایمان پیدا کرے گا۔

گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک گناہ کبیرہ کہلاتے ہیں، جیسے چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا وغیرہ۔ دوسرے صغیرہ، جو بلحاظ بشریت کے انسان سے سرزد ہوجاتے ہیں، باوجود اس کے کہ انسان اپنے طور پر بڑا محتاط رہتا ہے۔ مگر بشریت کے تقاضے سے بعض امور اس سے سرزد ہوجاتے ہیں۔

گناہوں کے دور ہونے کے ذرائع دو ہیں۔ اول وہ ذریعہ ہے کہ بہت سے گناہ ایسے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے غلبہ خوف کے سبب دور ہوجاتے ہیں۔ یعنی استیلائے خوف الٰہی بھی ایک ایسی شے ہے، جو گناہوں کو دور کرتی اور ان سے بچاتی ہے۔ یہ ذریعہ ایسا ہے، جیسے پولیس کے خوف سے انسان قانون کی خلاف ورزی سے بچتا ہے۔ پھر دوسرا ذریعہ گناہوں سے بچنے کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر اطلاع پانے کے بعد ایک محبت بڑھتی ہے اور اس کے سبب گناہ دور ہوتے ہیں۔

ایک اور قسم کے لوگ ہیں، جو چاہتے ہیں کہ گناہ ان سے سرزد نہ ہو۔ مگر وہ کچھ ایسے غفلت میں پڑ جاتے اور بھول جاتے ہیں کہ گناہ ہو ہی جاتے ہیں۔ لیکن یہ امر انسان کی فطرت اور رگ و ریشہ میں رچا ہوا ہے کہ وہ شدت خوف کے سبب بچ سکتا ہے، جیسے شیر کے سامنے اگر بکری کو باندھ دیں، تو وہ گھاس نہیں کھاسکتی۔ یا بندہ حاکم کے سامنے نہایت عاجزی اور احتیاط سے کھڑا ہوتا ہے۔ یہ احتیاط اور عجز خوف کے سبب ہوتا ہے، جو حاکم کے رعب اور حکومت کا نتیجہ ہے۔ لیکن یہی نتیجہ محبت سے بھی پیدا ہوتا ہے، جب ایک شخص اپنے محسن کے سامنے جاتا ہے، تو وہ اس کے احسان کو یاد کرکے خود بخود نرم اور محتاط ہوجاتا ہے۔ اور حیا اسکی آنکھوں میں پیدا ہوتی ہے، بلکہ محسن کے ساتھ محبت بڑھتی ہے۔ اسی طرح پر انسان کو اگر خدا تعالیٰ کے ان احسانات کا علم ہو، جو اس نے کئے ہیں، تو وہ اسکی محبت ذاتی کی وجہ سے گناہوں سے بچے گا اور پھر کوئی تحریک اس کو گناہ کی طرف نہیں لے جاسکتی۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کوئی بادشاہ کسی ماں کو حکم دے کہ اگر تم اس بچے کو دکھ دوگی یا دودھ نہ دوگی، یہاں تک کہ بچہ مرجائے، تو تم کو کوئی سزا نہیں دی جائے گی، بلکہ ہم تمہیں انعام دیں گے، تو وہ ہرگز ہرگز اس حکم کی تعمیل نہ کرے گی اور نہ ایسا کرنا پسند کرے گی۔ یہ اس لئے ہے کہ اس کی فطرت میں بچے کے ساتھ ذاتی محبت کا ایک جوش ہے۔ پس

جب انسان خدا تعالیٰ کے ساتھ اس قسم کی محبت کرنے لگتا ہے، تو پھر اس سے جو نیکیاں صادر ہوتی ہیں یا وہ گناہوں سے بچتا ہے، تو وہ کسی طمع یا خوف سے ایسا نہیں کرتا، بلکہ اس محبت کے ذاتی تقاضے سے۔

محبت ذاتی کا یہ نشان ہے کہ اگر محبت ذاتی والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کے اعمال کی پاداش میں اس کو بجائے بہشت کے دوزخ ملے گا یا اسے معلوم ہو جائے کہ ان پر کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوگا اور بہشت اور دوزخ کوئی چیز نہیں ہیں، تب بھی اس کی محبت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ کیونکہ یہ خوف و رجا کے پہلوؤں کو دور کر کے فطرت کا رنگ پیدا کرتی ہے۔ محبت ذاتی کا یہ خاصہ ہے کہ جب انسان کے اندر نشو ونما پاتی ہے، تو ایک آگ پیدا کر دیتی ہے، جو اندر کی نجاستوں کو جلا کر صاف کر دیتی ہے۔ یہ آگ ان نجاستوں کو جلاتی ہے، جن کو بیم و رجا نہ جلا سکتے تھے۔ پس یہ مقام انسان کے لئے تکمیل کا مقام ہے اور اس جگہ تک اس کا پہنچنا ضروری ہے۔

خالق کی طرف سے تبلیغ احکام کیلئے انبیاء و رسل مخصوص ہونیکی حکمت

جب سلاطین دنیا اپنے احکام بذات خود ہر مکان و ہر دوکان پر جا کر نہیں سناتے، تو وہ خداوند احکم الحاکمین، جس کی شوکت اور حکومت کے سامنے سلاطین دنیا کو کچھ نسبت ہی نہیں، کیونکر ہر کسی سے کہتا پھریگا۔ بادشاہان دنیا اپنے مقربوں کے سامنے اپنے احکام صادر کرتے ہیں، جن کو وہ دوسروں تک پہنچا دیتے ہیں۔ اسی طرح خدا تعالیٰ بھی اپنے احکام اپنے مقربوں کے ذریعہ سے بندوں تک پہنچاتا ہے۔

تمام اقوام عالم میں انبیاء و رسولوں کے آنے کی وجہ

خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کو اسی آیت سے شروع کیا ہے جو سورہ فاتحہ میں ہے۔ **الحمد لله رب العٰلمین** ۔یعنی تمام کامل اور پاک صفات خدا تعالیٰ سے خاص ہیں، جو تمام عالموں کا رب ہے۔ عالم کے لفظ میں تمام مختلف قومیں اور مختلف زمانے اور مختلف ملک داخل ہیں۔ اور اس آیت سے جو قرآن شریف شروع کیا گیا، یہ درحقیقت ان قوموں کا رد ہے۔ جو خدا تعالیٰ کی عام ربوبیت اور فیض کو اپنی ہی قوم تک محدود رکھتے ہیں۔ اور دوسری قوموں کو ایسا خیال کرتے ہیں کہ گویا وہ خدا تعالیٰ کے بندے ہی نہیں اور گویا خدا نے ان کو پیدا کر کے ردی کی طرح پھینک دیا ہے یا ان کو بھول گیا ہے۔ اور یا نعوذ باللہ وہ اسکے پیدا کردہ ہی نہیں، جیسا کہ مثلاً یہودیوں اور عیسائیوں کا اب تک یہی خیال ہے کہ جس قدر خدا کے نبی اور رسول آئے ہیں، وہ صرف یہود کے خاندان سے آئے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ دوسری قوموں سے کچھ ایسا ناراض رہا ہے کہ انکو گمراہی اور غفلت میں دیکھ کر پھر بھی انکی کچھ پرواہ نہیں کرتا، جیسا کہ انجیل میں بھی

لکھا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں صرف اسرائیل کی بھیڑوں کے لئے آیا ہوں۔غرض یہودیوں اور عیسائیوں کا یہی مذہب ہے کہ تمام نبی اور رسول انہیں کے خاندان میں آتے رہے ہیں اور انہیں کے خاندان میں خدا کی کتابیں اترتی رہی ہیں۔اور پھر بموجب عقیدہ عیسائیوں کے وہ سلسلہ الہام اور وحی کا حضرت عیسیٰؑ پر ختم ہوگیا اور خدا کے کلام پر مہر لگ گئی۔

انہی خیالات کے پابند آریہ صاحبان بھی پائے جاتے ہیں، یعنی جیسے یہود اور عیسائی نبوت اور الہام کو اسرائیلی خاندان تک ہی محدود رکھتے ہیں اور دوسری تمام قوموں کو الہام پانے کے فخر سے جواب دے رہے ہیں، یہی عقیدہ نوع انسان کی بدقسمتی ہے آریہ صاحبان نے بھی اختیار کر رکھا ہے یعنی وہ بھی یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ خدا کی وحی اور الہام کا سلسلہ آریہ ورت کی چار دیواری سے کبھی باہر نہیں گیا۔ ہمیشہ اسی ملک سے چار رشی منتخب کئے جاتے ہیں اور ہمیشہ وید ہی بار بار نازل ہوتا ہے اور ہمیشہ وید سنسکرت ہی اس الہام کے لئے خاص کی گئی ہے۔

غرض یہ دونوں قومیں اللہ تعالیٰ کو رب العالمین نہیں سمجھتیں۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جس حالت میں اللہ تعالیٰ رب العالمین کہلاتا ہے، نہ صرف رب اسرائیلیاں یا صرف رب آریاں، وہ بھلا کیوں ایک خاص قوم سے ایسا دائمی تعلق پیدا کرتا ہے، جس میں صریح طور پر طرفداری پائی جاتی ہے۔ پس ان عقائد کے رد کیلئے خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کو اسی آیت سے شروع کیا کہ **الحمد لله رب العالمين**۔اور جا بجا قرآن شریف میں صاف صاف بتلا دیا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ کسی خاص قوم یا خاص ملک میں نبی آتے رہتے ہیں۔ بلکہ خدا نے کسی قوم اور کسی ملک کو فراموش نہیں کیا۔اور قرآن شریف میں طرح طرح کی مثالوں میں بتلایا گیا ہے کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ ہر ایک ملک کے باشندوں کے لئے ان کے مناسب حال ان کی جسمانی تربیت کرتا آیا ہے، ایسا ہی اس نے ہر ایک ملک اور ہر ایک قوم کو روحانی تربیت سے بھی فیض یاب کیا ہے، جیسا کہ وہ قرآن شریف میں ایک جگہ فرماتا ہے۔**و ان من امة الا خلا فيها نذير**۔یعنی کوئی ایسی قوم نہیں، جس میں کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا گیا۔

سو یہ بات بغیر کسی بحث کے قبول کرنے کے لائق ہے کہ وہ سچا اور کامل خدا، جس پر ایمان لانا ہر ایک بندے کا فرض ہے، وہ رب العالمین ہے۔اور اس کی ربوبیت کسی خاص قوم تک محدود نہیں اور نہ کسی خاص زمانہ تک۔ بلکہ وہ سب قوموں کا رب ہے اور تمام زمانوں کا رب ہے اور تمام مکانوں کا رب ہے اور تمام ملکوں کا رب ہے اور تمام فیضوں کا وہی سرچشمہ ہے اور ہر ایک جسمانی اور روحانی طاقت اسی سے ہے اور اسی سے تمام موجودات پرورش پاتی ہیں اور ہر ایک وجود کا وہی سہارا ہے۔

خدا تعالیٰ کا فیض عام ہے، جو تمام قوموں اور تمام ملکوں اور تمام زمانوں پر محیط ہو رہا ہے۔ یہ اسی لئے ہوا کہ تا کسی قوم کو شکایت کرنے کا موقعہ نہ ملے اور یہ نہ کہے کہ خدا تعالیٰ نے فلاں فلاں قوم پر احسان کیا، مگر ہم پر نہ کیا، یا فلاں فلاں قوم کو اس کی طرف سے کتاب ملی، تو وہ اس سے ہدایت پا گئیں، مگر ہم کو نہ ملی یا فلاں زمانہ میں وہ اپنی وحی اور الہام اور معجزات کے ساتھ ظاہر ہوا، مگر ہمارے زمانہ میں مخفی رہا۔ پس اس نے تمام فیض دکھلا کر ان تمام اعتراضات کو رفع کر دیا اور اپنے ایسے وسیع اخلاق دکھلائے کہ کسی قوم کو اپنی جسمانی اور روحانی فیضوں سے محروم نہیں رکھا اور نہ کسی زمانہ کو بے نصیب ٹھہرایا۔ یہ کس قسم کی عقل مندی ہے کہ ایک طرف خدا تعالیٰ کو تمام دنیا کا خدا تعالیٰ ماننا اور پھر اسی منہ سے یہ بھی کہنا کہ وہ تمام دنیا کی ربوبیت کرنے سے دستکش ہے اور صرف ایک خاص قوم اور ایک خاص ملک پر اس کی نظر رحم ہے۔ کیا خدا تعالیٰ کے جسمانی قانون قدرت میں اس کی کوئی شہادت ملتی ہے۔ پھر اس کا روحانی قانون کیوں ایسی طرفداری پر مبنی ہوگا؟

حقیقت معصومیت انبیاء

جیسے یہاں کے بادشاہوں کے مقرب ہوتے ہیں، جو بادشاہوں کی موافق مرضی اور خیر خواہ ہوتے ہیں اور بجز اطاعت بوئے سرتابی بھی ان میں نہیں ہوتی۔ ورنہ مقرب نہ رہیں اور معتوب ہو جائیں۔ ایسے ہی خدا تعالیٰ کے مقرب وہی ہو سکتے ہیں، جو سراپا اطاعت ہوں اور شائبہ انحراف بھی ان میں نہ ہو۔ اتنا فرق ہے کہ بادشاہان دنیا کو موافق مرضی اور خیر خواہ اور سراپا اطاعت وغیرہ کے سمجھنے میں غلطی بھی ہو جاتی ہے۔ اس لئے عزل ونصب وعتاب ہوتی رہتی ہے۔ اور خداوند علیم وخبیر سے کسی بات کے سمجھنے میں غلطی نہیں ہو سکتی، ورنہ اس کے علم کو در بارہ توضیح حقیقت ایسا کہنا پڑیگا، جیسا کہ قمر وکواکب کے نور سے بوجہ نقصان بہت باریک چیزیں اور بہت باریک فرق محسوس نہیں ہوتے۔ اور ظاہر ہے کہ جس کا وجود کامل ہو، اس کی کسی بات میں نقصان متصور نہیں، ورنہ وجود میں نقصان لازم آئیگا۔ مگر جب اس کا علم کامل ہوا۔ اور اس وجہ سے کسی کے موافق مرضی اور ظاہر وباطن مطیع سمجھنے میں غلطی ممکن الوقوع نہ ہوئی، تو جن کو اس نے مقرب بنایا ہوگا، ان کا معزول ہونا اور اپنے عہدہ احکام رسانی سے موقوف ہو جانا بھی خلاف عقل ہوگا۔ الحاصل انبیاء میں کوئی ایسی بات نہ ہوگی، جو ناپسندیدہ خداوندی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان کے تمام اخلاق کا حمیدہ ہونا اور تمام قویٰ علمیہ کا گزیدہ ہونا لازم آئیگا۔ جس سے ان کی معصومیت کا اقرار کرنا پڑیگا۔ کیونکہ جب بُری صفت ہی نہیں اور فہم کامل ہے، یعنی قوت علمیہ اچھی ہے، تو پھر اعمال ناشائستہ کے صادر ہونیکی کوئی صورت ہی نہیں۔ ہر فعل کے صادر ہونے کے لئے ایک قوت یعنی

ایک صفت کی ضرورت ہے۔ دیکھنے کے لئے بینائی چاہئے، سننے کے لئے شنوائی چاہئے۔ایسے ہی اچھے اعمال کے لئے اچھی صفت کی ضرورت ہے اور بُرے کے لئے بُری صفت کی حاجت۔ جب بُری صفات سے وہ لوگ مبّرا ہوئے، تو بُرے افعال سے بدرجہ اولیٰ مبّرا ہوئے۔

خلفائے محمد مصطفیٰؐ واحمد مجتبیٰؑ کا سلسلہ مدام دنیا میں جاری رہنے کا راز

اس بات کو عقل ضرور قبول کرتی ہے کہ چونکہ الٰہیات اور امور معاد کے مسائل نہایت باریک اور نظری ہیں، گویا امور غیر مرئی اور فوق العقل پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ نہ خدا تعالیٰ کبھی کسی کو نظر آیا، نہ کبھی کسی نے بہشت دیکھی اور نہ دوزخ کا ملاحظہ کیا اور نہ ملائک سے ملاقات ہوئی اور علاوہ اس کے احکام الٰہی مخالف جذبات نفس ہیں اور نفس امارہ، جن باتوں میں لذت پاتا ہے، احکام الٰہی ان سے منع کرتے ہیں۔ لہٰذا عند العقل یہ بات نہ صرف احسن بلکہ واجب ہے کہ خدا تعالیٰ کے پاک نبی، جو شریعت اور کتاب لے کر آتے ہیں اور اپنے نفس میں تاثیر اور قوت قدسیہ رکھتے ہیں، یا تو وہ ایک لمبی عمر لیکر آئیں اور ہمیشہ اور ہر صدی میں ہر یک اپنی نئی امت کو اپنی ملاقات اور صحبت سے شرف بخشیں اور اپنے زیر سایہ رکھ کر اور اپنے پُر فیض پروں کے نیچے ان کو لے کر وہ برکت اور نور اور روحانی معرفت پہنچائیں، جو انہوں نے ابتداء زمانہ میں پہنچائی تھی۔ اور اگر ایسا نہیں تو پھر ان کے وارث، جو ان کے کمالات اپنے اندر رکھتے ہوں اور کتاب الٰہی کے دقائق اور معارف وحی اور الہام کو بیان کر سکتے ہوں اور منقولات کو مشہودات کے پیرایہ میں دکھلا سکتے ہوں اور طالب حق کو یقین تک پہنچا سکتے ہوں، ہمیشہ فتنہ اور فساد کے وقتوں میں ضرور پیدا ہونے چاہئیں، تا انسان، جو مغلوب شبہات ونسیان ہے، ان کے فیض حقیقی سے محروم نہ رہے۔ کیونکہ یہ بات نہایت صاف اور بدیہی ہے کہ جب ایک نبی کا زمانہ اپنے خاتمہ کو پہنچتا ہے اور اس کی برکات کے دیکھنے والے فوت ہو جاتے ہیں، تو وہ تمام مشہودات ومنقولات کے رنگ میں آ جاتے ہیں۔ پھر دوسری صدی کے لوگوں کی نظر میں اس نبی کے اخلاق اور اس نبی کے عبادات اور اس نبی کا صبر اور استقامت اور صدق اور صفا اور وفا اور تمام تائیدات الٰہیہ اور خوارق اور معجزات، جن سے اس کی صحت نبوت اور صداقت دعویٰ پر استدلال ہوتے تھے، نئی صدی کے لوگوں کو کچھ قصے سے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ انشراح ایمانی اور جوش اطاعت، جو نبی کے دیکھنے والوں میں ہوتا ہے، دوسروں میں وہ بات نہیں پائی جاتی۔ اور صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ صحابہءآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمانی صدق دکھلایا اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں اور عزتوں اور اپنی آبروؤں کو اسلام کی راہوں میں نہایت اخلاص سے قربان کیا، اس کا نمونہ اور صدیوں میں تو کجا دوسری صدی کے لوگوں یعنی تابعین میں بھی نہیں پایا گیا۔ اس کی وجہ کیا تھی؟

وہ یہی تھی کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس مرد صادق کا منہ دیکھا تھا، جس کے عاشق اللہ ہونے کی گواہی کفار قریش کے منہ سے بھی بلا ساختہ نکل گئی اور روز کی مناجاتوں اور پیار کے سجدوں کو دیکھ کر اور فنا فی الاطاعت کی حالت اور کمال محبت اور دلدادگی کے منہ پر روشن نشانیاں اور اس پاک منہ پر نور الٰہی برستا مشاہدہ کر کے کہتے تھے کہ **عشق محمدعلی ربہ** کہ محمد اپنے رب پر عاشق ہو گیا ہے اور پھر صحابہ نے صرف وہ صدق اور اخلاص ہی نہیں دیکھا، بلکہ اس پیار کے مقابل پر، جو ہمارے سید محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل سے ایک دریا کی طرح جوش مارتا تھا، خدا تعالیٰ کے پیار کو ہی تائیدات خارق عادت کے رنگ میں مشاہدہ کیا۔ تب اسکو پتہ لگ گیا کہ خدا ہے اور ان کے دل بول اٹھے کہ وہ خدا اس مرد کے ساتھ ہے۔ انہوں نے اس قدر عجائبات الٰہیہ دیکھے اور اس قدر نشان آسمانی مشاہدہ کئے کہ ان کو کچھ بھی اس بات میں شک نہ رہا کہ فی الحقیقت ایک اعلیٰ ذات موجود ہے، جس کا نام خدا ہے اور جس کے قبضہ قدرت میں ہر ایک امر ہے اور جس کے آگے کوئی بات بھی انہونی نہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے وہ کام صدق اور صفا کے دکھلائے اور وہ جانفشانیاں کیں کہ انسان کبھی کر نہیں سکتا جب تک اس کے تمام شکوک وشبہات دور نہ ہو جائیں۔ اور انہوں نے بچشم خود دیکھ لیا کہ وہ ذات پاک اسی میں راضی ہے کہ انسان اسلام میں داخل ہو اور اس کے رسول کریم کی بدل و جان متابعت اختیار کرے۔ تب اس حق الیقین کے بعد جو کچھ انہوں نے متابعت دکھلائی اور جو کچھ انہوں نے متابعت کے جوش سے کام کئے اور جس طرح پر اپنی جانوں کو اپنے برگزیدہ ہادی کے آگے پھینک دیا، یہ وہ باتیں ہیں کہ ممکن ہی نہیں کہ انسان کو حاصل ہو سکیں، جب تک وہی بہار اس کی نظر کے سامنے نہ ہو، جو صحابہ پر آئی تھی۔ اور جب کہ ان کمالات کو پیدا کرنا بغیر وجود ان وسائل کے محالات میں سے ہے اور نجات کا یقینی طور پر حاصل ہونا بھی بغیر ذریعہ ان کمالات کے از قبیل محالات میں سے ہے اور نجات کا یقینی طور پر حاصل ہونا بھی بغیر ذریعہ ان کمالات کے از قبیل محال، تو ضرور ہی ہوا کہ وہ خداوند کریم، جس نے ہر ایک کو نجات کے لئے بلایا ہے، ایسا ہی انتظام ہر یک صدی کے لئے رکھے، تا اس کے بندے کسی زمانہ میں حق الیقین کے مراتب سے محروم نہ رہیں۔

اور یہ کہنا کہ ہمارے لئے قرآن اور احادیث کافی ہیں اور صحبت صادقین کی ضرورت نہیں، یہ خود مخالفت تعلیم قرآن ہے۔ کیونکہ اللہ جلشانہ فرماتا ہے **و کونوا مع الصادقین** (ترجمہ۔ صادقین کی معیت کو اختیار کرو)۔ اور صادق وہ ہیں کہ جنہوں نے صدق کو علی وجہ البصیرت شناخت کیا اور پھر اس پر دل و جان سے قائم ہو گئے۔ اور یہ اعلیٰ درجہ بصیرت کا بجز اس کے ممکن نہیں کہ ہماری تائید شامل حال ہو کر اعلیٰ درجہ حق الیقین تک پہنچا دے۔ پس ان معنوں میں صادق حقیقی انبیا و رسل اور محدث اور اولیاء کاملین

مکملین ہیں، جن پر آسمانی روشنی پڑی اور جنہوں نے خداتعالیٰ کو اسی جہان میں یقین کی آنکھوں سے دیکھ لیا اور آیت موصوفہ بالا بطور اشارت ظاہر کر رہی ہے کہ دنیا صادقوں کے وجود سے کبھی خالی نہیں ہوتی، کیونکہ دوام حکم **کونوا مع الصادقین** کو مستلزم ہے۔

علاوہ اس کے مشاہدہ صاف بتلا رہا ہے کہ جو لوگ صادقوں کی صحبت سے لا پرواہ ہو کر عمر گزارتے ہیں، ان کے علوم وفنون جسمانی جذبات سے ان کو ہرگز صاف نہیں کر سکتے اور کم سے کم اتنا ہی مرتبہ اسلام کا کہ دلی یقین اس بات پر ہو کہ خدا ہے، ان کو ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور جس طرح وہ اپنی دولت پر یقین رکھتے ہیں، جو ان کے صندوقچوں میں بند ہو، یا اپنے ان مکانات پر، جو ان کے قبضہ میں ہوں، ہرگز ان کو ایسا یقین خداتعالیٰ پر نہیں ہوتا۔ وہ سم الفار کھانے سے ڈرتے ہیں، کیونکہ وہ یقیناً جانتے ہیں کہ وہ ایک مہلک زہر ہے، لیکن گناہوں کے زہر سے نہیں ڈرتے، حالانکہ ہر روز قرآن پڑھتے ہیں۔ **انہ من یات ربہ مجرما فان لہ جھنم لا یموت فیھا و لا یحییٰ** ۔ پس سچ تو یہ ہے کہ جو شخص خداتعالیٰ کو نہیں پہچانتا وہ ان کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ ہاں یہ بات بھی درست ہے کہ قرآن ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے۔ مگر قرآن کی ہدایتیں اس شخص کے وجود کے ساتھ وابستہ ہیں، جس پر قرآن نازل ہوا یا وہ شخص جو منجانب اللہ اس کا قائم مقام ٹھہرا دیا گیا۔ اگر قرآن اکیلا ہی کافی ہوتا، تو خداتعالیٰ قادر تھا کہ قدرتی طور پر درختوں کے پتوں پر قرآن لکھا جاتا یا لکھا لکھایا آسمان سے نازل ہو جاتا۔ مگر خداتعالیٰ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ قرآن کو دنیا میں نہیں بھیجا جب تک معلم القرآن دنیا میں نہیں بھیجا گیا۔

قرآن کریم کو کھول کر دیکھ لو، کتنے مقاموں میں اس مضمون کی آیتیں ہیں کہ **یعلمھم الکتاب والحکمۃ** یعنی وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن اور قرآنی حکمت لوگوں کو سکھلاتا ہے۔ اور پھر ایک اور جگہ فرماتا ہے۔ **لا یمسہ الا المطھرون** ۔ یعنی قرآن کے حقائق ودقائق ان ہی پر کھلتے ہیں، جو پاک کئے گئے ہیں۔ پس ان آیات سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے سمجھنے کے لئے ایک معلم کی ضرورت ہے، جس کو خداتعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پاک کیا ہو۔

اگر قرآن کے سیکھنے کے لئے معلم کی حاجت نہ ہوتی، تو ابتدائے زمانہ میں بھی نہ ہوتی۔ اور یہ کہنا کہ ابتداء میں حل مشکلات قرآن کے لئے ایک معلم کی ضرورت تھی۔ لیکن جب حل ہو گئی، تو اب کیا ضرورت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حل شدہ بھی ایک مدت کے بعد پھر قابل حل ہو جاتے ہیں، ماسوا اس کے امت کو ہر ایک زمانہ میں نئی مشکلات بھی تو پیش آتی ہیں اور قرآن جامع جمیع علوم تو ہے، لیکن یہ

ضروری نہیں کہ ایک ہی زمانہ میں اس کے تمام علوم ظاہر ہو جائیں۔ بلکہ جیسے جیسے مشکلات کا سامنا ہوتا ہے، ویسے ویسے قرآنی علوم کھلتے ہیں۔ اور ہر ایک زمانہ کی مشکلات کے مناسب حال ان مشکلات کو حل کرنے کے لئے روحانی معلم بھیجے جاتے ہیں، جو وارث رسل ہوتے ہیں اور مماثلی طور پر رسولوں کے کمالات کو پاتے ہیں۔

نئے معلموں کی اس وجہ سے بھی ضرورت پڑتی ہے کہ بعض حصے تعلیم قرآن شریف کے از قبیل حال ہیں نہ از قبیل قال۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے، جو پہلے معلم اور اصل وارث اس تخت کے ہیں، حالی طور پر ان دقائق کو اپنے صحابہ کو سمجھایا ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ کا یہ کہنا کہ میں عالم الغیب ہوں اور میں مجیب الدعوات ہوں اور میں قادر ہوں اور میں دعاؤں کو قبول کرتا ہوں اور طالبوں کو حقیقی روشنی تک پہنچاتا ہوں اور میں اپنے صادق بندوں کو الہام دیتا ہوں اور جس پر چاہتا ہوں اپنے بندوں میں سے اپنی روح ڈالتا ہوں۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں کہ جب تک معلم خود ان کا نمونہ بن کر نہ دکھلا دے تب تک یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتیں۔

وَ قَدْ جَآءَ قَوْلُ اللّٰہِ بِالرُّسُلِ تَوَاماً ۔۔۔ وَ مِنْ دُوْنِھِمْ فَھْمُ الْھُدَیٰ مُتَعَسِّرٌ

وَ فِیْ الدِّیْنِ اَسْرَارٌ وَ سُبُلٌ خَفِیَّۃٌ ۔۔۔ وَ یُظْھِرُ ھَا رَبِّی لِعَبْدٍ یُخَیَّرٌ

وَ کَمْ مِنْ حَقَائِق لَا یُری کَیْفَ شَبَّحَھا ۔۔۔ کَنَجْمٍ بَعِیْدٍ نُوْرُھَا یُسَتِّرٌ

فَیَاْتِیْ مِنَ اللّٰہِ الْعَلِیْمِ مُعَلِّمٌ ۔۔۔ وَ یَھْدِی اِلٰی اَسْرَارِھَا وَ یُفَسِّرٌ

اگر قرآن کی تعلیم صرف اسی حد تک محدود ہے، جس حد تک ایک تجربہ کار اور لطیف الفکر فلاسفر کی تعلیم محدود ہو سکتی ہے اور آسمانی تعلیم، جو محض حال کے نمونہ سے سمجھائی جاتی ہے، اس میں نہیں، تو پھر نعوذ باللہ قرآن کریم کا آنا لاحاصل ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اگر کوئی ایک دم کے واسطے بھی اس مسئلہ میں فکر کرے کہ انبیاء کی تعلیم اور حکیموں کی تعلیم میں بصورت فرض کرنے صحت ہر دو تعلیموں کے مابہ الامتیاز کیا ہے، تو بجز اس کے اور کوئی مابہ الامتیاز قرار نہیں دے سکتا کہ انبیاء کی تعلیم کا بہت سا حصہ فوق العقل ہے، جو بجز تفہیم اور تعلیم کے اور کسی راہ سے سمجھ ہی نہیں آسکتا۔ اور اس حصہ کو وہی لوگ دل نشین کرا سکتے ہیں، جو صاحب حال ہوں۔ مثلاً ایسے ایسے مسائل کہ اس طرح پر فرشتے جان نکالتے ہیں اور پھر یوں آسمان پر لے جاتے ہیں اور پھر قبر میں حساب اس طور سے ہوتا ہے اور بہشت ایسا ہے اور دوزخ ایسا اور پل صراط ایسا اور عرش کو چار فرشتے اٹھا رہے ہیں اور پھر قیامت کو آٹھ اٹھائیں گے اور اس طرح پر خدا اپنے بندوں پر وحی نازل کرتا ہے یا مکاشفات کا دروازہ ان پر کھولتا ہے۔ یہ تمام حالی تعلیم ہے اور مجرد قیل و قال سے

سمجھ نہیں آ سکتی۔اور جب کہ یہ حال ہے تو پھر میں دوبارہ کہتا ہوں کہ جل شانہٗ نے اپنے بندوں کے لئے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ اس کی کتاب کا یہ حصہ تعلیم ابتدائی کا بغیر توسط ان معلموں کے، جو مرتبہ حال پر پہنچ گئے ہوں، ہرگز سمجھ نہیں آ سکتا اور دنیا ذرہ ذرہ باتوں پر ٹھوکر کھاتی ہے۔

جس طرح پر کہ عقل اس بات کو واجب اور لازمی ٹھہراتی ہے کہ کتب الٰہی کی دائمی تعلیم اور تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ ہمیشہ انبیاء کی طرح وقتاً فوقتاً ملہم اور محدث اور صاحب علم لدنی پیدا ہوتے رہیں، اسی طرح جب ہم قرآن کریم پر نظر ڈالتے ہیں اور غور کی نگاہ سے اس کو دیکھتے ہیں، تو وہ بھی بآواز بلند یہی فرمارہا ہے کہ روحانی معلموں کا ہمیشہ کے لئے ہونا اس کے ارادہ قدیمہ میں مقرر ہو چکا ہے۔دیکھو اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے۔ **و اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض** ۔ترجمہ۔جو چیز انسانوں کو نفع پہنچاتی ہے، وہ زمین پر باقی رہتی ہے۔اب ظاہر ہے کہ دنیا میں زیادہ تر انسانوں کو نفع پہنچانے والے گروہ انبیاء ہیں کہ جو خوارق سے، معجزات سے، پیشگوئیوں سے، حقائق سے، معارف سے، اپنی راستبازی کے نمونہ سے انسانوں کے ایمان قوی کرتے ہیں اور حق کے طالبوں کو نفع دینی پہنچاتے ہیں۔اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ دنیا میں بہت مدت تک نہیں رہتے ، بلکہ تھوڑی سی زندگی بسر کر کے اس عالم سے اٹھائے جاتے ہیں۔لیکن آیت بالا کے مضمون میں خلاف نہیں اور ممکن نہیں کہ خدا تعالیٰ کا کلام خلاف واقع ہو۔پس انبیاء کی طرف نسبت دے کر معنی آیت کے یوں ہوں گے کہ انبیاء من حیث الظل باقی رکھے جاتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ ظلی طور پر ہر یک ضرورت کے وقت میں کسی اپنے بندہ کو ان کی نظیر اور مثیل پیدا کر دیتا ہے، جو انہیں کے رنگ میں ہو کر ان کی دائمی زندگی کا موجب ہوتا ہے۔اور اسی ظلی وجود کے قائم رکھنے کے لئے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ دعا سکھائی ہے۔ **اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم** ۔یعنی اے خدا ہمارے ہمیں وہ سیدھی راہ دکھا، جو تیرے ان بندوں کی راہ ہے، جن پر تیرا انعام ہے اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کا انعام جو انبیاء پر ہوا تھا، جس کے مانگنے کے لئے اس دعا میں حکم ہے، وہ درم اور دینار کی قسم میں سے نہیں، بلکہ وہ انوار اور برکات اور محبت اور یقین اور خوارق اور تائید سماوی اور قبولیت اور معرفت تامہ کاملہ اور وحی اور کشف کا انعام ہے۔اور خدا تعالیٰ نے اس انعام کے مانگنے کا تب ہی حکم فرمایا کہ اول اس انعام کے عطا کرنے کا ارادہ بھی کر لیا ہے۔پس آیت سے بھی کھلے کھلے طور پر یہی ثابت ہوا کہ جب تک دنیا کا قیام ہے، خدا تعالیٰ اس امت کو تمام انبیاء کا وارث ٹھہراتا ہے، تا انبیاء کا وجود مماثلی طور پر ہمیشہ باقی رہے اور دنیا ان کے وجود سے کبھی خالی نہ ہو اور نہ صرف دعا کے لئے حکم کیا بلکہ ایک آیت میں وعدہ بھی فرمایا ہے اور وہ یہ ہے۔ **والذین جاھدوا فینا لنھدینھم**

سبلنا ۔یعنی جولوگ ہماری راہ میں، جوصراط مستقیم ہے مجاہدہ کریں گے،تو ہم ان کو اپنی راہیں بتلا دیں گے۔اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی راہیں وہی ہیں، جو انبیاء کو دکھلائی گئیں تھیں۔

بعض اور آیات ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ضرور خداوند کریم نے یہی ارادہ فرمایا ہے کہ روحانی معلم، جو انبیاء کے وارث ہیں، ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں۔اور وہ یہ ہیں۔**وعد الله الذین آمنوا منکم و عملو الصالحات لیستخلفنهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم ۔** یعنی خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے اے امت محمد یہ کے مومنو یہ وعدہ کیا ہے کہ تمہیں بھی وہ زمین میں خلیفہ کرے گا، جیسا کہ تم سے پہلوں کو کیا۔

اگر اس آیت کو کوئی شخص تامل اور غور کی نظر سے دیکھے،تو وہ اس بات کو سمجھ جائیگا کہ خدا تعالیٰ اس امت کے لئے خلافت دائمی کا صاف وعدہ فرماتا ہے۔اگر خلافت دائمی نہیں تھی،تو شریعت موسوی کے خلیفوں سے تشبیہ دینا کیا معنے رکھتا تھا۔اگر خلافت راشدہ صرف تیس برس تک رہ کر ہمیشہ کے لئے اس کا دور ختم ہو گیا تھا،تو اس سے لازم آتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا ہرگز یہ ارادہ نہ تھا کہ اس امت پر ہمیشہ کے لئے ابواب سعادت مفتوح رکھے، کیونکہ روحانی سلسلہ کی موت سے دین کی موت لازم آتی ہے۔اور ایسا مذہب ہرگز زندہ نہیں کہلا سکتا، جس کے قبول کرنے والے خود اپنی زبان سے اقرار کریں کہ تیرہ سو برس سے یہ مذہب مرا ہوا ہے اور خدا تعالیٰ نے اس مذہب کے لئے ہرگز ارادہ نہیں کیا کہ حقیقی زندگی کا وہ نور، جو نبی کریم کے سینہ میں تھا، وہ توارث کے طور پر دوسروں میں چلا آئے۔

ایسے خیال پر جمنے والے خلیفہ کے لفظ کو بھی، جو استخلاف سے مفہوم ہے، تدبر سے نہیں سوچتے۔ کیونکہ خلیفہ جانشین کو کہتے ہیں اور رسول کا جانشین حقیقی معنوں کے لحاظ سے وہی ہوسکتا ہے، جو ظلی طور پر رسول کے کمالات اپنے اندر رکھتا ہو۔اس واسطے رسول کریم نے نہ چاہا کہ ظالم بادشاہوں پر خلیفہ کے لفظ کا اطلاق ہو، کیونکہ خلیفہ درحقیقت رسول کا ظل ہوتا ہے۔اور چونکہ کسی انسان کے لئے دائمی طور پر بقا نہیں، لہٰذا خدا تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ رسولوں کے وجود کو، جو تمام دنیا کے وجودوں سے اشرف واولیٰ ہیں، ظلی طور پر ہمیشہ کے لئے تا قیامت قائم رکھے۔سو اسی غرض سے خدا تعالیٰ نے خلافت کو تجویز کیا، تا دنیا کبھی اور کسی زمانہ میں برکات رسالت سے محروم نہ رہے۔پس جو شخص خلافت کو صرف تیس برس تک مانتا ہے، وہ اپنی نادانی سے خلافت کی علت غائی کو نظر انداز کرتا ہے۔اور نہیں جانتا کہ خدا تعالیٰ کا یہ ارادہ تو ہرگز نہیں تھا کہ رسول کریم کی وفات کے بعد صرف تیس برس تک رسالت کی برکتوں کو خلیفوں کے لباس میں قائم رکھنا ضروری ہے، پھر اس کے بعد دنیا تباہ ہوتی ہے،تو ہو جائے کچھ پرواہ نہیں۔ بلکہ پہلے دنوں

میں تو خلیفوں کا ہونا بجز شوکت اسلام پھیلانے کے لئے اور زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا، کیونکہ انوار رسالت اور کمالات نبوت تازہ بتازہ پھیل رہے تھے اور ہزارہا معجزات بارش کی طرح نازل ہو چکے تھے۔ اور اگر خدا تعالیٰ چاہتا، تو اس کی سنت اور قانون سے یہ بھی بعید نہ تھا کہ بجائے ان چار خلیفوں کے اس تیس برس کے عرصہ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کو ہی بڑھا دیتا۔ اس حساب سے تیس برس کے ختم ہونے تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل ۹۳ برس کی عمر کو پہنچتے اور یہ اندازہ اس زمانہ کی مقررہ عمروں سے نہ کچھ زیادہ ہے اور نہ اس قانون قدرت سے کچھ بڑھ کر ہے، جو انسانی عمروں کے بارے میں ہماری نظر کے سامنے ہے۔

پس یہ حقیر خیال خدا تعالیٰ کی نسبت تجویز کرنا کہ اس کو صرف اس امت کے تیس برس کا ہی فکر تھا اور پھر ان کو ہمیشہ کیلئے ضلالت میں چھوڑ دیا اور وہ نور، جو قدیم سے انبیاء سابقین کی امت میں خلافت کے آئینہ میں وہ دکھلاتا رہا، اس امت کے لئے دکھلانا اس کو منظور نہ ہوا۔ کیا عقل سلیم خدا رحیم و کریم کی نسبت ان باتوں کو تجویز کرے گی؟ ہرگز نہیں۔ اور پھر یہ آیت خلافت دائمہ پر گواہ ناطق ہے۔ **و لاقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثها عبادی الصالحون** ۔ کیونکہ یہ آیت صاف صاف پکار رہی ہے کہ اسلامی خلافت دائمی ہے۔ اس لئے کہ **یرثھا** کا لفظ دوام کو چاہتا ہے۔ وجہ یہ کہ آخری نوبت فاسقوں کی ہو، تو وارث وہی ہوتا ہے، جو سب کے بعد ہے۔

پھر اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ جس حالت میں خدا تعالیٰ نے ایک مثال کے طور پر سمجھا دیا تھا کہ میں اسی طور اس امت میں خلیفے پیدا کرتا رہوں گا، جیسے موسیٰ کے بعد خلیفے پیدا کئے، تو دیکھنا چاہئے کہ موسیٰ کی وفات کے بعد خدا تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا۔ کیا اس نے صرف تیس برس تک اس سلسلہ کو لمبا کیا؟ پھر جس حالت میں خدا تعالیٰ کا فضل ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہیں زیادہ تھا۔ چنانچہ اس نے خود فرمایا **و کان فضل اللہ علیک عظیما** اور ایسا ہی اس امت کی نسبت فرمایا **کنتم خیر امة اخرجت للناس** ۔ تو پھر کیونکر ہو سکتا تھا کہ حضرت موسیٰ کے خلیفوں کا سلسلہ چودہ سو برس تک ممتد ہو اور اس جگہ صرف تیس برس تک خلافت کا خاتمہ ہو جائے۔ اور نیز جب کہ یہ امت خلافت کے انوار روحانی سے ہمیشہ کے لئے خالی ہے، تو پھر آیت **اخرجت للناس** کے کیا معنی ہیں۔ کوئی بیان تو کرے۔ مثل مشہور ہے کہ اوخویشتن گم است کرا راہبری کند۔ جب کہ اس امت کو ہمیشہ کے لئے اندھا رکھنا ہی منظور ہے اور اس مذہب کو مردہ رکھنا ہی مدنظر ہے، تو پھر یہ کہنا کہ تم سب سے بہتر ہو اور لوگوں کی بھلائی اور راہنمائی کے لئے پیدا کئے گئے ہو، کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا اندھا اندھے کو راہ دکھا سکتا ہے۔ پس

ان سب سوالات کا جواب اس آیت میں مذکور ہے، جس کے یہ معنی ہیں کہ قیامت تک ہمیشہ تم میں روحانی زندگی اور باطنی بینائی رہے گی۔ اور غیر مذہب والے تم سے روشنی حاصل کریں گے اور یہ روحانی زندگی اور باطنی بینائی، جو غیر مذہب والوں کو حق کی طرف دعوت کرنے کے لئے اپنے اندر لیاقت رکھتی ہے، یہی وہ چیز ہے جس کو دوسرے لفظوں میں خلافت کہتے ہیں۔

سوال۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ **الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی** خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ دین اسلام کو میں نے تمہارے لئے کامل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت پوری نازل کر چکا ہوں۔ پس جب کہ دین کمال کو پہنچ چکا ہے اور نعمت پوری ہو چکی ہے، تو پھر نہ کسی نبی کی ضرورت ہے اور نہ کسی خلیفہ کی حاجت رہتی ہے۔

جواب۔ یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں، جنہیں وہ لوگ منہ پر لاتے ہیں، جن کو ایمان کی کچھ بھی پرواہ نہیں۔ ورنہ انسان نہایت ضعیف ہے اور ہمیشہ تقویت ایمان کا محتاج ہے۔ اور اس راہ میں اپنے خود ساختہ دلائل کبھی کام نہیں آ سکتے، جب تک تازہ طور پر معلوم نہ ہو کہ خدا موجود ہے۔ ہاں جھوٹا ایمان، جو بدکاریوں کو روک نہیں سکتا، نقلی اور عقلی طور پر قائم رہ سکتا ہے۔ اور اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ دین کی تکمیل اس بات کو مستلزم نہیں، جو اس کی حفاظت سے بکلی دست بردار ہو جائیں۔ مثلاً اگر کوئی گھر بنائے اور اس کے تمام کمرے سلیقے سے تیار کرے اور اس کی تمام ضرورتیں، جو عمارت سے متعلق ہیں باحسن وجہ پوری کر دے اور پھر مدت کے بعد اندھیریاں چلیں اور بارشیں ہوں اور اس گھر کے نقش و نگار پر گرد و غبار بیٹھ جائے اور اس کی خوبصورتی چھپ جائے اور پھر اس کا کوئی وارث اس گھر کو صاف اور سفید کرنا چاہے، مگر اس کو منع کر دیا جائے کہ گھر مکمل ہو چکا ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ منع کرنا سراسر حماقت ہے۔ خوب سوچو کہ تکمیل دیگر شے ہے اور وقتاً فوقتاً ایک مکمل عمارت کی صفائی کرنا اور بات ہے۔ خلفائے نبوی دین میں کچھ کمی بیشی نہیں کرتے، ہاں گم شدہ دین کو پھر دلوں میں قائم کرتے ہیں۔

الغرض جب پاک تعلیم پر خیالات فاسدہ کا ایک غبار پڑ جاتا ہے اور حق کا خالص چہرہ چھپ جاتا ہے، تب اس خوبصورت چہرے کو دکھانے کے لئے روحانی خلیفے آتے ہیں۔

روحانی خلیفے دنیا میں آ کر دین کی کچھ ترمیم و تنسیخ نہیں کرتے۔ وہ دین کو منسوخ نہیں کرنے آتے، بلکہ دین کی چمک اور روشنی دکھانے کو آتے ہیں۔ اور معترض کا یہ خیال کہ ان کی ضرورت ہی کیا ہے، صرف اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ معترض کو اپنے دین کی پرواہ نہیں اور کبھی اس نے غور نہیں کیا کہ اسلام کیا چیز ہے اور اسلام کی ترقی کس کو کہتے ہیں اور حقیقی ترقی کیونکر اور کن راہوں سے ہو سکتی ہے۔ پھر

غور کرو کہ اگر تکمیل دین کے بعد کوئی بھی کاروائی درست نہیں، تو بقول معترض کے جو تیس سال کی خلافت ہے، وہ بھی باطل ٹھہرتی ہے۔ کیونکہ جب دین کامل ہو چکا، تو پھر کسی دوسرے کی ضرورت نہیں۔

نسخ کتب وتبدیل احکام الٰہی کی فلاسفی

سوال۔ آریوں کا اعتراض ہے کہ مسلمانوں کا خدا متغیر ہے، کبھی کوئی حکم دیتا ہے، کبھی کوئی اور۔ لیکن یہ امر خلاف عقل ہے، کیونکہ اسکے یہ معنی ہوئے کہ خدا نے بے سوچے آج کچھ کہہ دیا، کل کو جب کوئی خرابی دیکھی، تو حکم بدل دیا۔ خدا کا حکم آدمیوں کے حکم کے برابر نہیں۔ اسکا حکم ہمیشہ ایک رہتا ہے۔

جواب ۔(۱) ساری شریعتیں انوار ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت ان نوروں کے درمیان ایسی ہے، جیسے نور آفتاب کے سامنے ستاروں کے نور ہوتے ہیں۔ جب آفتاب ظاہر ہوتا ہے، تو ستاروں کی روشنیاں چھپ جاتی ہیں اور نور آفتاب میں ان کے انوار محو ہو جاتے ہیں۔ ہمیں لازم ہے کہ سارے رسولوں اور شریعتوں پر ایمان لائیں کہ وہ برحق ہیں اور اس نسخ سے وہ باطل نہیں ہو جاتی ہیں۔ بلکہ ہر شریعت مابعد شریعت ماقبل کو مکمل کرنیوالی ہوتی ہے اور سب شرائع سابقہ کو مکمل کرنے والی شریعت محمدی ہے۔

(۲) خدا تعالیٰ کی کتاب کو، جو طب روحانی ہے، طب جسمانی سے بہت مناسبت ہے۔ ہر بیمار، جو طبیب کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے، اسکے علاج میں بھی تبدیلیاں کی جاتی ہیں۔ اور جو نسخہ بیمار کی ایک خاص حالت میں تجویز کیا جاتا ہے، وہ نسخہ دوسری حالت کے شروع ہونے پر بدلا جاتا ہے۔ اور جب بیمار میں تیسری حالت پیدا ہو جائے، تو پھر اسی حالت کے موافق نسخہ لکھا جاتا ہے۔ پس جبکہ طب جسمانی میں یہ تبدیلیاں لازمی ہیں، تو پھر طب روحانی میں کیوں لازمی نہ ہوں گی۔ پس ایسا شخص، جو ان تبدیلیوں پر اعتراض کرتا ہے، اگر وہ بیمار ہو کر کسی طبیب کی خدمت میں حاضر ہو، تو اسکو سوچنا چاہئے کہ کیا جب طبیب بیماری کے عوارض بدلنے کی وجہ سے نسخہ کو بدلنا چاہے، تو وہ کہہ سکتا ہے کہ اے طبیب یہ دوسرا نسخہ تم نے ایک غلطی کا ارتکاب کرنے کے بعد سوچا ہے۔ پہلے تو نے یہ نسخہ کیوں نہ لکھا۔

(۳) ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ نوع انسان کو مختلف زمانوں میں اخلاق، اعمال، عقائد، تمدنی صورتوں اور قومی عادات میں بڑی بڑی تبدیلیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اور خدا تعالیٰ ہر ایک انقلاب کے موافق اپنی طرف سے کوئی کتاب بھیجتا رہا ہے۔

(۴) ایک سادہ لوح عورت بھی، جو چنداں عقل اور ہنر نہیں رکھتی، اپنے بچے کی عمر اور موسم کی تبدیلی کے ساتھ اس کے طریق تعہد میں تبدیلیاں کرتی رہتی ہے۔ ایک زمانہ ہوتا ہے، جب بچہ صرف

دودھ پینے کے قابل ہوتا ہےاور پھر دوسرا زمانہ آتا ہے کہ کچھ نرم نرم غذا بھی دینا شروع کرتی ہے۔اور پھر تیسرا زمانہ آتا ہے کہ اس کو دودھ دینا بند کر دیتی ہے۔اور پھر اوائل میں بچے کو جب پاجامہ پہنایا جاتا ہے، تو اس میں آگے اور پیچھے ایک چاک کر دیتی ہے، تا پیشاب کرنے اور پاخانہ پھرنے میں اس کو تکلیف نہ ہو۔اور پھر جب کچھ ہوش سنبھل جاتا ہے، تو وہ چاک بند کر دیا جاتا ہے۔اس طرح تبدیلیاں وقوع میں آتی رہتی ہیں۔تدبر کی نظر سے دیکھا جائے، تو خدا نے انسان کے لئے جسمانی رزق پیدا کرنے کے لئے جو قانون قدرت رکھا ہے وہ بھی تبدیلیوں سے بھرا ہوا ہے۔ایک موسم اس نے بارشوں کے لئے مقرر کیا ہے اور دوسرا دھوپ کے لئے۔اگر بارشیں ہوتی رہیں اور دھوپ نہ نکلے، تو تمام تخم، جو بویا گیا ہے، پانی میں بہہ جائے گا۔اور اگر صرف دھوپ ہی نکلتی رہے اور بارشیں نہ ہوں، تو تخم جل جائیں گے اور قحط پڑ جائیگا۔جسمانی تبدیلیوں کو دیکھو کہ کبھی دن ہوتا ہے اور کبھی رات۔اور رات بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔کبھی چاندنی کی روشنی ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔اور دن میں کبھی صبح ہوتی ہے، کبھی دوپہر اور پھر کبھی موسم گرما آجاتا ہے اور کبھی موسم سرما۔اسی طرح خدا کے جسمانی نظام میں ہزاروں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔پس اگر خدا نے روحانی قانون میں تبدیلیاں رکھ دیں، تو کیا غضب آگیا۔ بلکہ ایسی "الہامی" کتاب، جو خدا تعالیٰ کے جسمانی قانون قدرت کے ساتھ موافقت نہیں رکھتی، وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوسکتی۔

(۵) قانون میں تبدیلی وتغیر کا یہ بھی سبب ہوا کرتا ہے کہ انسان کے حالات بدلتے رہتے ہیں، کیونکہ انسان اپنی جسمانی اور روحانی وضع کی رو سے تغیر وتبدل کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔اور چونکہ کمال تام، جو کسی حالت منتظرہ کا محتاج نہیں، صرف خدا تعالیٰ سے مخصوص ہے اور انسان رفتہ رفتہ اپنے کمال کو پہنچتا ہے، اسلئے اس کو تبدیلیوں سے مسلسل واسطہ پڑتا ہے۔اور جیسا کہ انسان اپنی ابتدائے پیدائش سے اخیر عمر تک اپنی فطرت کی رو سے معرض تبدل وتغیر میں پڑا ہوا ہے اور پیدائش سے اخیر عمر تک صدہا تغیر اس پر وارد ہوتے ہیں، اسی طرح نوع انسان اپنے ابتدائی زمانہ سے اخیر تک تغیر وتبدل کا نشانہ ہے۔

(۶) تبدیلی قانون کا بھاری سبب وہ تبدیلیاں ہوتی ہیں، جو انسان کے ذاتی حالات اور چال چلن اور ذہنی قویٰ اور اموال اور املاک اور اس کی تمدنی صورتوں یا جنگی طریقوں میں ظہور پاتی ہیں۔مثلاً ایک وہ زمانہ تھا، جو تیر وکمان یا تلوار سے لڑائی ہوتی تھی۔اور دوسرے زمانہ میں بندوق وغیرہ ہتھیار پیدا ہوگئے، جنہوں نے تیر وکمان کو بیکار کر دیا اور ساتھ ہی لڑائی کا قانون بھی بدل دیا گیا۔ایسا ہی ایک ملک اپنی آبادی کے لحاظ سے، اپنی کاشتکاری کے لحاظ سے اور اپنی تجارت کے لحاظ سے ادنیٰ درجہ کی حالت میں

ہوتا ہے۔ اور اکثر زمین بنجر اور نا قابل زراعت ہوتی ہے اور لوگ جاہل اور وحشیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ اس صورت میں بہت نرمی سے ان کی نسبت قانون بنایا جاتا ہے اور سرکاری لگان بہت کم مقرر کیا جاتا ہے اور تجارتی امور میں نرم ٹیکس لگایا جاتا ہے۔ لیکن جب ایک مدت کے بعد زمین کی ایک عمدہ حالت پیدا ہو جاتی ہے اور ہزار ہا گھماؤں بنجر توڑ کر آباد کیا جاتا ہے اور خوش حالی بڑھ جاتی ہے۔ اور ایسا ہی تجارتی کاروبار بھی ترقی پذیر ہوتا ہے، تو پھر قانون بدلنا پڑتا ہے اور یہ تبدیلی گورنمنٹ کے قانون پر ہی موقوف نہیں، تعلیمی صیغہ میں بھی ضروری طور پر یہ تبدیلی پیش آتی ہے کہ جو بچے ابتدائی مرحلہ میں مدرسہ میں بٹھائے جاتے ہیں، ان کے لئے اور کتابیں ہوتی ہیں اور پھر جب وہ اچھی طرح حرف شناس ہو جاتے ہیں، تو پھر ان کو اور کتابیں دی جاتی ہیں۔ اور پھر جب استعداد اس سے بھی بڑھ جاتی ہے، تو دوسری کتابیں حسب استعداد ان کو دی جاتی ہیں۔ اور سب کے بعد انتہائی کتاب کا وقت آتا ہے۔ اور چونکہ خدا اچھی تعلیم میں گڑ بڑ نہیں ڈالنا چاہتا، اس لئے پیش از وقت کوئی الہامی قانون انسانوں کو نہیں دیا جاتا۔ کیونکہ جن تغیرات کا ابھی انسان کو علم ہی نہیں، ان تغیرات کے موافق انسان کو قانون دینا گویا ان کو سخت پریشانی میں ڈالنا ہے۔

(۷) دراصل حقیقت اسلامیہ، جس کی تعلیم قرآن کریم دیتا ہے، کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے اور تمام الہامی کتابوں کا یہی مدار رہا ہے تا بنی آدم کو اس صراط مستقیم پر قائم کریں۔ لیکن قرآن کریم کی تعلیم کو، جو دوسری تعلیموں پر کمال درجہ کی فوقیت رکھتی ہے، تو اس کی دو وجوہات ہیں۔ اول یہ کہ پہلے نبی اپنے زمانہ کے جمیع بنی آدم کے لئے مبعوث نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ وہ صرف اپنی ایک خاص قوم کے لئے بھیجے جاتے تھے، جو خاص استعداد میں محدود اور خاص طور کے عادات اور عقائد اور اخلاق اور روش میں قابل اصلاح ہوتے تھے۔ پس اس وجہ سے وہ کتابیں قانون مختص القوم کی طرح ہو کر صرف اسی حد تک اپنے ساتھ ہدایت لاتی تھیں، جو اس خاص قوم کے مناسب حال اور ان کے پیمانہ استعداد کے موافق ہوتی تھی۔

دوسری وجہ یہ کہ ان انبیاء علیہم السلام کو ایسی شریعت ملتی تھی، جو ایک خاص زمانہ تک محدود تھی اور خدا تعالیٰ نے ان کتابوں میں یہ ارادہ نہیں کیا تھا کہ دنیا کے اخیر تک وہ ہدائتیں جاری رہیں۔ اس لئے وہ کتابیں مختص الزمان کی طرح ہو کر صرف اسی زمانہ کی حد تک ہدایت لاتی تھیں، جو ان کتابوں کی پابندی کا زمانہ حکمت الٰہی نے اندازہ کر رکھا تھا۔ ان دونوں قسم کے نقصوں سے، جو ہم نے بیان کئے ہیں، قرآن کریم بکلی مبرا ہے۔ کیونکہ اس کے اتارنے سے اللہ جل شانہٗ کا یہ مقصد تھا کہ وہ تمام بنی آدم اور تمام

زمانوں اور تمام استعدادوں کی اصلاح اور تکمیل اور تربیت کر سکے۔ اور اسلام کی پوری شکل اور پوری عظمت بنی آدم پر ظاہر ہو اور اس کے ظہور کا وقت بھی آن پہنچا تھا۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے قرآن مجید کو تمام قوموں اور تمام ان زمانوں کے لئے، جو قیامت تک آنے والے تھے، ایک کامل اور جامع قانون کی کتاب بنا کر نازل فرمایا ہے اور ہر ایک درجہ کی استعداد کے لئے افادہ اور افاضہ کا دروازہ کھول دیا۔

اب سمجھنے والے خوب سمجھ جائیں گے کہ الٰہی قوانین میں تغیرات انسانی حالات کے تغیرات کے باعث ہوتے ہیں۔ چونکہ انسان متغیر ہے، اس لئے اس کے مناسب حال خدا اس کے لئے تبدیلیاں کرتا ہے۔ جب بچہ پیٹ میں ہوتا ہے، تو صرف اس کو خون کی غذا ملتی ہے۔ اور جب بچہ پیدا ہوتا ہے، تو ایک مدت تک صرف دودھ پیتا ہے اور پھر بعد اس کے اناج کھاتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ تینوں سامان اس کیلئے وقتاً فوقتاً پیدا کر دیتا ہے۔ پیٹ میں ہونیکی حالت میں پیٹ کے فرشتوں کو، جو اندرونی ذرات ہیں، حکم کر دیتا ہے کہ اس کی غذا کے لئے خون بنا دیں اور پھر جب پیدا ہوتا ہے تو اس حکم کو منسوخ کر دیتا ہے۔ تو پھر پستان کے فرشتوں کو، جو اس کے ذرات ہیں، حکم کر دیتا ہے، جو اس کے لئے دودھ بنا دیں۔ اور جب وہ دودھ سے پرورش پا چکتا ہے تو پھر اس حکم کو بھی منسوخ کر دیتا ہے۔ تو پھر زمین کے فرشتوں کو، جو اس کے ذرات ہیں حکم کرتا ہے، جو اس کے لئے اخیر مدت تک اناج اور پانی پیدا کرتے رہیں۔ پس ہم مانتے ہیں کہ ایسے تغیرات خدا تعالیٰ کے احکام میں ہیں، خواہ بذریعہ قانون قدرت اور خواہ بذریعہ شریعت۔ مگر اس سے خدا میں کوئی تغیر لازم نہیں آتا۔ (ماخوذ)

(۸) اگر حکم خداوندی میں کوئی تبدل خلاف عقل ہے، تو ارادہ خداوندی میں بھی تغیر و تبدل خلاف عقل ہے۔ حکم کی تبدیلی میں اگر چہ یہ خرابی ہے کہ خدا کی طرف غلط فہمی کا الزام آئیگا، تو ارادہ کے تغیر و تبدل میں بھی یہی خرابی ہے۔ وہ بھی مثل حکم فہم پر موقوف ہے، یعنی جیسے حکم تب دیتے ہیں، جب پہلے کچھ دل میں سمجھ لیتے ہیں۔ ایسے ہی ارادہ خداوندی بھی کسی کام کا جب ہی کرتے ہیں، جب اول اپنے دل میں کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ مگر یہ ہے، تو پھر پیدا کرنے کے بعد معدوم کر دینا اور جلانے کے بعد مارنا اور عطائے صحت کے بعد مریض کر دینا اور راحت کے بعد تکلیف میں ڈال دینا علیٰ ہذا القیاس اس کے الٹ بھی خدا تعالیٰ سے ممکن نہ ہو سکے۔ کیونکہ یہ سب بارادہ خدا ہوتے ہیں۔ سو خدا ایک ارادہ کے بعد دوسرا ارادہ مخالف ارادۂ اول کرے، تو یوں سمجھو کہ پہلے بے سوچے سمجھے خدا نے ارادہ کر لیا تھا۔

حکم اول کہیں بوجہ غلطی کے بدلا جاتا ہے اور کبھی بوجہ مصلحت۔ طبیب کبھی تشخیص میں غلطی کرتا ہے اور اس وجہ سے بعد اطلاع غلطی کے نسخہ اول کو بدل دیتا ہے۔ اور کبھی بوجہ تبدیل احوال مریض یا بوجہ

اختتام وقت دوائے اول کو بدل دیتا ہے۔اثنائے بخار میں اگر سرسام ہو جائے، تو یہ تبدیلی بوجہ اختتام وقت دوائے اول ہوتی ہے۔مگر پھر بھی ان دونوں صورتوں میں تغیر وتبدل بوجہ اطلاع غلطی نہیں ہوتی۔سو خداتعالیٰ کے احکام کا تبدل وتغیر بھی اِسی قسم کا ہوتا ہے۔

(۱۱) مصلحان قوم یامقننان شرع پر نگاہ کرو۔ جب دنیا میں آدمی تھوڑے تھے اور تہذیب ابھی سن طفولیت میں تھی، اس وقت کے قوانین اور پھر جب کثرت ہوگئی، باہمی تعلقات بڑھ گئے، تہذیب کو نشوونما ہونے لگا، تو اس وقت کے قوانین کیونکر برابر ہو سکتے ہیں۔پس یہی وجہ ہے کہ شرائع انبیاء میں اور مصلحان احکام میں کچھ باہم تغیر وتبدل موجود ہے۔مگر اصول سب کے ایک جیسے ہیں۔صرف خصوصیت عارضہ میں اختلاف ہے۔ایک قوم میں مختلف اوقات میں مختلف احکام شرعیہ ہوتے رہے اور یہ اختلاف بغرض تکمیل ہے۔چنانچہ قرآن کریم میں خداتعالیٰ فرماتا ہے۔ **الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیک بنعمتی** ۔ترجمہ۔یعنی آج میں پورا دے چکا تم کو تمہارا دین اور پورا کیا تم پر اپنا احسان۔الغرض حسب مصلحت ان تغیرات قوانین وشرائع کو جو مختلف اوقات میں واقع ہوئے نسخ کہا جاتا ہے، جو بموجب اصطلاح قرآن کریم بمعنے تکمیل ہے۔اور اس بات کا ذکر آیت مذکورہ میں ہے۔جس کے بارے میں مولانا روم نے لکھا۔

رمز تنسیخ آیاتٍ اَوْ نَنْسَهَا ۔۔۔ نَات خَیراً وزعقب میدان مہا
ہر شریعت را کہ حق منسوخ کرد ۔۔۔ او گیاہ بر دو عوض اورد ورد
شب کند منسوخ نورِ روز را ۔۔۔ بیں جمادی و آں خرد افروز را
باز شب منسوخ شد از نورِ روز ۔۔۔ تا جمادی سوخت زاں آتش فروز

حقیقت قانون قدرت واسباب

واضح ہو کہ بڑے بڑے فلاسفر یہ اقرار کر چکے ہیں کہ انسان کا علم خدا کے نامتناہی علم کے مقابل میں اس قدر بھی نہیں ہے، جیسا کہ ایک سوئی کو سمند میں ڈبو کر اس کی کچھ تری سوئی پر رہ جاتی ہے۔سچے عارفوں کا تو یہ قول ہے کہ چونکہ قوانین الٰہیہ کی حد بست ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے حد بست سے پہلے کسی امر کی نسبت ایک حد لگا دینا دو متناقص اقرار کو اپنی کلام میں جمع کرنا ہے۔انسانی علوم، جو انسانی عقل کے ماتحت ہیں، وہ محض بذریعہ حواس خمسہ یا بذریعہ حواس باطنی کے معلوم ہوتے ہیں۔اور یہ آلہ قوانین قدرت کی شناخت کا خود محدود ہے۔اور ظاہر ہے کہ غیر محدود بذریعہ محدود کے دریافت نہیں ہوسکتا۔پس جن قوانین کو ہم معلوم شدہ کہتے ہیں، ممکن ہے کہ وہ بھی دراصل کامل طور پر معلوم نہ ہوں، کیونکہ کارخانہ

قدرت وراء الوراء پڑا ہوا ہے۔ انسان صرف کنوئیں کی مینڈک کی طرح ایک سمندر کو اپنے تھوڑے سے پانی کے برابر سمجھ لیتا ہے۔ اور انسان کی تحقیقاتیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً جو کچھ طبعی اور ہیئت جدیدہ کے ذریعہ صدہا اسرار اب معلوم ہوتے ہیں، پہلے ان کا نام و نشان نہ تھا۔ پس ظاہر ہے کہ جن امور کو وہ قانون قدرت سمجھ رہے تھے، وہ قانون قدرت اب اس زمانہ میں ہنسی کے لائق ہیں۔ اور ممکن ہے کہ بعد اس کے ایک اور زمانہ اس موجودہ طبعی اور ہیئت کو بھی نئی تحقیقاتوں کے ذریعہ سے منسوخ کر دے۔ پس انسان کا قانون قدرت ایک ریت کا طومار ہے، جو ایک پُر زور ہوا سے اپنی جگہ کو چھوڑ دیتا ہے۔ یہ تو ہم نے محض ظاہری ترقی علوم اور تجربہ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ایسے روحانی امور بھی ہیں، جن کے مقابل پر طبعی قانون قدرت کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **و لا یحیطون بشیء من علمہ الا بما شاء** ۔ ترجمہ یعنی انسان خدا تعالیٰ کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے، مگر اسی قدر جس قدر خدا تعالیٰ چاہے۔ خدا کے قانون قدرت کی وہ شخص حد بست کر سکتا ہے جو خدا سے بھی بڑھ کر ہو۔ ورنہ یہ خیال نہایت بے ادبی اور بے ایمانی ہے کہ وہ خدا، جس کے اسرار وراء الوراء ہیں اور جس کی قدرتیں اس کی ذات کی طرح ناپیدا کنار ہیں، اس کے عجائبات قدرت کو کسی حد تک محدود کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ جب تک خدا تعالیٰ کی ذات غیر محدود ہے، تو پھر اس کی صفات کیونکر محدود ہو جائیں گی۔ ہاں جو امر اس کی ثابت شدہ صفات کے برخلاف ہو یا اس کے ذکر کردہ عہد کے منافی ہو، وہی اس کے قانون قدرت کے برخلاف سمجھا جائیگا۔ مثلاً اس کی صفات ثابت شدہ سے یہ امر ہے کہ اس کا کوئی ثانی نہیں اور یہ امر ہے کہ اس پر موت وارد نہیں ہو سکتی اور نیز یہ امر کہ اپنی صفات کے مطابق وہ کسی بات کے کرنے سے عاجز نہیں۔ کس کی مجال ہے کہ وہ یہ کہے صرف فلاں حد تک اس کی قدرتیں ہیں آگے نہیں۔ یا فلاں فلاں امور اس کے احاطہ اقتدار سے باہر ہیں اور وہ ان کے کرنے سے عاجز ہے۔ ہاں اس کی عجائب قدرتیں ہر ایک کے ساتھ یکساں نہیں۔ جیسے جیسے انسان اس سے تعلق محبت اور اخلاص پیدا کرتا ہے اسی قدر اس پر قدرتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور جو اس کے کام عوام کے لئے محال ہیں اور ظاہر نہیں ہوتے، وہ خواص کے لئے بباعث ان کے تعلق کے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ غرض اس کی ذات میں ایسی بیشمار عجائب قدرتیں ہیں۔ اب خلاصہ اس مقدمہ کا یہ ہے کہ قانون قدرت کوئی ایسی شئی نہیں ہے کہ ایک حقیقت ثابت شدہ کے آگے ٹھہر سکے۔ کیونکہ قانون قدرت خدا تعالیٰ کے ان افعال سے مراد ہے، جو قدرتی طور پر ظہور میں آئے یا آئندہ آئیں گے۔ لیکن چونکہ ابھی خدا تعالیٰ اپنی قدرتوں کے دکھانے سے تھک نہیں گیا اور نہ یہ کہ اب قدرت نمائی سے بے زور ہو گیا ہے یا کسی طرف کو کھسک گیا ہے یا کسی

خارجی قاسر سے مجبور کیا گیا ہے اور مجبوراً آئندہ کے عجائب کاموں سے دستکش ہوگیا ہے اور ہمارے لئے وہی چند صدیوں کی کارگذاری یا اس سے کچھ زیادہ سمجھ لو چھوڑ گیا ہے۔ اس لئے ساری عقلمندی اور حکمت اور فلسفیت اور ادب اور تعلیم اسی میں ہے کہ ہم چند موجودہ مشہودہ قدرتوں کو، جن میں ابھی صدہا طور کا اجمال باقی ہے، مجموعہ قوانین قدرت خیال نہ کر بیٹھیں۔ اور اس پر نادان لوگوں کی طرح ضد نہ کریں کہ ہمارے مشاہدات سے خدا تعالیٰ کا فعل ہرگز تجاوز نہیں کرسکتا، کیونکہ یہ صرف احمقانہ دعویٰ ہے، جو ہرگز ثابت نہیں کیا گیا اور نہ ثابت کیا جاسکتا ہے۔ ہم نے مانا کہ مذہب نیچر کا نقیض نہیں ہے۔ مگر یہ آپ کیونکر تسلیم کراتے ہیں کہ سب خواص نیچر یہ پر انسان محیط ہو چکا ہے۔ کیا اس پر کوئی دلیل بھی ہے یا نرا تحکم سے ہی منہ بند کرنا چاہتے ہیں۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ اگر تجارب و مشاہدات، جو آج تک قلم بند ہو چکے ہیں ،صحیح اور کامل ہوتے تو علوم جدیدہ کو قائم رکھنے کی جگہ نہ رہتی۔ حالانکہ آپ لوگ بھی کہا کرتے ہیں کہ علوم جدیدہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کیونکر ایسی چیزیں کامل اور قطعی طور پر مقیاس الصداقت یا میزان الحق ٹھہر سکتی ہیں، جن کے اپنے ہی پورے طور پر انکشاف میں ابھی بہت سی منازل باقی ہیں۔ اور اس پیچ در پیچ معمانے یہاں تک حکماء کو حیران اور سرگردان کر رکھا ہے کہ بعض ان میں سے حقائق اشیاء کے منکرین ہو گئے۔ منکریں حقائق کا وہی گروہ، جس کو سوفسطائی کہتے ہیں، اور بعض ان میں سے یہ بھی کہہ گئے کہ اگرچہ خواص اشیاء ثابت ہیں، تاہم دائمی طور پر ان کا ثبوت نہیں پایا جاتا کہ پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ مگر ممکن ہے کہ کسی ارضی یا سماوی تاثیر سے کوئی چشمہ پانی کا اس خاصیت سے باہر آ جاوے۔ آگ لکڑی کو جلا دیتی ہے، مگر ممکن ہے کہ ایک آگ بعض موجبات اندورونی و بیرونی سے اس خاصیت کو ظاہر نہ کر سکے، کیونکہ ایسی عجائب باتیں ہمیشہ ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ حکماء کا یہ بھی قول ہے کہ بعض تاثیرات ارضی یا سماوی ہزاروں بلکہ لاکھوں برسوں کے بعد ظہور میں آتی ہیں، جو ناواقف اور بے خبر لوگوں کو بطور فوق عادت معلوم دیتی ہیں اور کبھی کبھی کسی کسی زمانہ میں ایسا کچھ ہوتا رہتا ہے کہ عجائبات آسمان میں یا زمین میں ظاہر ہوتے ہیں، جو بڑے بڑے فلسفیوں کو حیرت میں ڈالتے ہیں اور پھر فلسفی لوگ ان کے قطعی ثبوت اور مشاہدہ سے خیرہ اور متذم ہو کر کچھ نہ کچھ تکلفات کر کے طبعی یا ہیئت میں اس کو گھسیڑ دیتے ہیں، تا ان کے قانون میں کچھ فرق نہ آ جائے۔ ایسا ہی یہ لوگ ادھر ادھر لگا کر اور نئی باتوں کو کسی علمی قاعدہ میں جبراً دھسا کر گذارہ کر لیتے ہیں۔ جب تک پردار مچھلی نہیں دیکھی گئی تھی، تب تک کوئی فلاسفر اس کا قائل نہ تھا۔ اور جب تک متواتر دُم کے کٹنے سے دُم کٹے کتے نہ پیدا ہونے لگے، تب تک اس خاصیت کا کوئی فلاسفر اقراری نہ ہوا۔ اور جب تک بعض بعض زمینوں سے کسی سخت زلزلہ کی وجہ سے

کوئی ایسی آگ نہ نکلی کہ وہ پتھروں کو پگلا دیتی تھی، مگر لکڑی کو نہیں جلا سکتی تھی، تب تک فلسفی لوگ ایسی خاصیت کا آگ میں ہونا خلاف قانون قدرت سمجھتے رہے۔ جب تک ایسی ایٹر کا آلہ نہیں نکلا تھا، کسی فلسفی کو معلوم نہ تھا کہ عمل ٹرمینس فیوزن آف بلڈ یعنی ایک انسان کا خون دوسرے انسان میں داخل کرنا قانون فطرت میں داخل ہے۔ بھلا اس فلاسفر کا نام لینا چاہئے، جو الیکٹریشن یعنی بجلی کی کل نکلنے سے پہلے اس بجلی کے عمل کا قائل تھا۔

فلسفی را چشم حق سخت نابینا بود گرچہ بیکن باشد یا بوعلی سینا بود

یہ ثابت ہو چکا ہے اور ہمیشہ مشاہدہ میں آتا ہے کہ جو لوگ خواہ نخواہ قانون قدرت کے پابند کہلاتے ہیں، وہ اپنی رائے میں بہت کچے ہوتے ہیں۔ اگر دس بیس معتبر اور پختہ عقلمند اور ان کے ہم مرتبہ آدمی کوئی عجیب بات ہنسی کے طور پر بیان کر دیں کہ ہم ایک پردار آدمی کو بچشم خود دیکھ آئے ہیں یا ایک پتھر میں سے شہد مترشح ہوتا ہم نے دیکھا بلکہ کھایا ہے یا آسمان سے ہم نے پھول برستے دیکھے اور پھولوں میں سے سونا نکلا یا شاید کوئی واقعہ صحیح ہی پیش آوے، جیسے آج کل کے بعض اخباروں میں شائع کیا گیا ہے کہ یورپ کے ایک ملک میں ایک پتھر تیس من وزنی برسا، جس میں ہڈیاں بھی ملی ہیں، شاید ان کی ہڈیاں ہیں جو چاند کے کرّہ میں رہنے والے ہیں، تو فی الفور فلاسفر صاحب کے دل میں ایک دھڑکا سا شروع ہو جائیگا۔ تو یہ دھڑکا اور اضطراب اس کم بخت کا اس کے نقص عقل اور فہم پر صریح شہادت دیتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر سرمایہ اس کا ظن ہے، کیونکہ کسی قطعی ثبوت میں انسان کبھی تردد نہیں کر سکتا۔ مثلاً اگر کسی زندہ آدمی کو دس بیس آدمی مل کر یہ کہیں کہ تو زندہ نہیں بلکہ مرا ہوا ہے، تو اس قدر کیا وہ دس ہزار آدمی کی شہادت سے بھی اپنی زندگی سے شک میں نہیں پڑیگا۔ بلکہ بیشمار اشخاص کا مجمع بھی اپنی حلفی گواہیوں سے اس کو اضطراب میں نہیں ڈالیگا، کیونکہ اس کو اپنی زندگی پر پورا پورا یقین ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ فلسفہ میں جو واقعی دانا ہیں، وہ تجارب فلسفیہ پر بہت ہی کم یقین رکھتے ہیں، کیونکہ ان کی معلومات وسیع ہیں اور اس کو اپنے فلسفہ کی اندرونی حقیقت معلوم ہے، بلکہ اکثر یونانی فلسفی افلاطون اور ارسطو بھی اس بات پر متفق ہیں کہ حادث چیزوں کی آبادی آسمانوں کی حرکتیں اور ان کے مختلف دورے ہیں۔ اسی جہت سے علوی اور سفلی چیزوں کے حکم اور حال مختلف ہوتے ہیں اور اسی بنا پر ان کے مذہب کی رو سے ممکن ہے کہ ایک دور میں ایسی عجائب چیزیں یا عجائب شکلوں کے جانور پیدا ہوں کہ نہ تو دور سابق میں اور نہ دور لاحق میں ان کی نظیر پائی جاوے۔ غرض نادر الظہور اشیاء کا سلسلہ اس وضع عالم کو لازمی پڑا ہوا ہے اور علامہ موصوف نے اس مقام میں ایک تقریر بہت عمدہ لکھی ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ اگر چہ سب انسان ایک نوع میں ہونیکی وجہ سے باہم مناسب الطبع واقع ہیں، مگر پھر بھی ان میں سے بعض کو نادر طور پر کبھی کبھی کسی کسی زمانہ میں خاص خاص طاقتیں یا کسی اعلیٰ درجہ کی قوتیں عطا ہوتی ہیں، جو عام طور پر دوسروں میں نہیں پائی جاتیں۔ جیسے مشاہدہ سے ثابت ہوا ہے کہ بعض نے حال کے زمانہ میں تین سو برس سے زیادہ عمر پائی ہے، جو بطور خارق عادت ہے اور بعض کی قوت حافظہ یا قوت نظر ایسی کمال درجہ کو پہنچتی ہے، جو اس کی نظیر نہیں پائی گئی۔ اور اس قسم کے لوگ بہت نادر الوجود ہوتے ہیں، جو صدہا یا ہزاروں برسوں کے بعد کوئی فرد ان میں سے ظہور میں آتا ہے۔ اور چونکہ عوام الناس کی نظر اکثر امور کثیر الوقوع اور متواتر الظہور پر ہوا کرتی ہے، اور یہ بھی ہوتا ہے کہ عام لوگوں کی نگاہ میں جو باتیں کثیر الوقوع اور متواتر الظہور رہوں، وہ بطور قاعدہ یا قانون قدرت کے مانی جاتی ہیں، اور ان کی سچائی پر انہیں اعتماد ہوتا ہے۔ اس لئے دوسرے امور، جو نادر الوقوع ہوتے ہیں، وہ بمقابلہ امور کثیر الوقوع نہایت مضمحل اور مشتبہ بلکہ باطل کے رنگ میں دکھائی دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے عوام کیا بلکہ خواص کو بھی ان کے وجود میں شکوک وشبہات پیدا ہو جاتے ہیں۔ سو بڑی غلطی، جو حکماء کو پیش آتی ہے، اور بڑی بھاری ٹھوکر، جو ان کو قدم رکھنے سے روکتی ہے، یہ ہے کہ وہ امور کثیر الوقوع کے لحاظ سے نادر الوقوع کی تحقیق کے درپے نہیں ہوتے اور جو کچھ ان کے آثار چلے آتے ہیں ان کو صرف قصے اور کہانیاں خیال کر کے اپنے سر پر سے ٹال دیتے ہیں۔ حالانکہ قدیم سے یہ عادت اللہ ہے، جو امور کثیر الوقوع کے ساتھ نادر الوقوع عجائبات بھی کبھی کبھی ظہور میں آتے رہتے ہیں، اس کی نظریں بہت ہیں، جن کا لکھنا موجب طوالت ہے۔ اور حکیم بقراط نے اپنی ایک طبی کتاب میں چند چشم دید بیماروں کا بھی حال لکھا ہے، جو قواعد طبی اور تجربہ اطباء کے رو سے وہ ہرگز قابل علاج نہیں تھے، مگر ان بیماروں نے عجیب طور پر شفا پائی، جس کی نسبت ان کا خیال ہے کہ شفا بعض نادر تاثیرات ارضی یا سماوی سے ہے۔

اس جگہ ہم اس قدر اور لکھنا چاہتے ہیں کہ یہ بات صرف نوع انسان میں محدود نہیں کہ کثیر الوقوع اور نادر الوقوع خواص کا اس میں سلسلہ چلا آتا ہے۔ بلکہ اگر غور کر کے دیکھیں تو یہ دوسرا سلسلہ ہر ایک نوع میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً نباتات میں سے آک کے درخت کو دیکھو کہ کیسا تلخ اور زہرناک ہوتا ہے۔ مگر کبھی مدتوں اور برسوں کے بعد ایک قسم کی نبات اس میں پیدا ہوتی ہے، جو نہایت لذیذ اور شیرین ہوتی ہے۔ اب جس شخص نے اس نبات کو کبھی نہ دیکھا ہو اور معمولی قدیمی تلخی کو دیکھتا آیا ہو، بیشک وہ اس نبات کو ایک امر طبعی کے نقیض سمجھے گا۔ ایسا ہی بعض دوسری نوع کی چیزوں میں بھی دور دراز عرصہ کے بعد کوئی نہ کوئی خاصہ نادر ظہور میں آجاتا ہے۔

ایسا ہی بعض لوگوں کا تجربہ ہے کہ بعض ریشم کے کیڑے کی مادہ بے نر کے انڈے دیتی ہیں اور ان میں سے بچے نکلتے ہیں۔ بعض نے یہ بھی دیکھا کہ چوہا مٹی خشک سے پیدا ہوا، جس کا آدھا دھڑ تو مٹی تھی اور آدھا چوہا بن گیا۔ حکیم فاضل قرشی یا شاید علامہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک بیمار ہم نے دیکھا جس کا کان ماؤف ہو کر بہرہ ہو گیا تھا۔ پھر کان کے نیچے ایک ناسور سا پیدا ہو گیا، جو آخر وہ سوراخ سے ہو گئے۔ اس سوراخ کی راہ سے وہ برابر سن لیتا تھا۔ گویا خدا نے اس کے لئے دوسرا کان عطا کیا۔ دو طبیبوں میں سے ایک نے اور غالباً قرشی نے خود اپنی اڈی میں سوراخ کر کے اور پھر اس راہ سے مدت تک براز یعنی پاخانہ آتے رہنا تحریر کیا ہے۔ جالینوس سے سوال کیا گیا کہ کیا انسان آنکھوں کی راہ سے سن سکتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ ہنوز تجربہ شہادت نہیں دیتا۔ لیکن ممکن ہے کوئی ایسی مشارکت قانون اور آنکھوں کی مخفی ہو، جو کسی ہاتھ کے عمل سے یا کسی سماوی موجب سے ظہور پذیر ہو کر اس خاصیت کے ظہور کا موجب ہو جاوے، کیونکہ ابھی علم استدراک خواص مختتم نہیں۔

خدا تعالیٰ ایک پیارا خزانہ ہے۔ اس کی قدر کرو کہ وہ تمہارے ہر ایک قدم میں تمہارا مددگار ہے۔ تم بغیر اس کے کچھ بھی نہیں اور نہ تمہارے اسباب اور تدبیریں کچھ چیز ہیں۔ حد اعتدال تک رعایت اسباب کرو، لیکن اور اقوام کی طرح نرے اسباب کے بندے مت بنو اور اس خدائے وحدہٗ لاشریک کو فراموش نہ کرو، جو اسباب کو مہیا کرتا ہے۔ اگر تمہیں آنکھیں ہوں، تو تمہیں نظر آ جائے کہ خدا ہی خدا ہے اور باقی سب ہیچ ہے۔

نیچر کے ماننے والے یعنی قانون قدرت کے پیرو کہلانیوالے اس خیال پر زور دیتے ہیں کہ یہ بات بدیہی ہے کہ جہاں تک انسان اپنی عقلی قوتوں سے جان سکتا ہے، وہ بجز قدرت اور قانون قدرت کے کچھ نہیں۔ یعنی مصنوعات و موجودات مشہودہ موجودہ پر نظر کرنے سے چاروں طرف یہی نظر آتا ہے کہ ہر ایک چیز مادی یا غیر مادی، جو ہم میں اور ہمارے اردگرد یا فوق یا تحت میں موجود ہے، وہ اپنے وجود اور قیام اور ترتیب آثار میں ایک عجیب سلسلہء انتظام سے وابستہ ہے، جو ہمیشہ اس کی ذات میں پایا جاتا ہے اور کبھی اس سے جدا نہیں ہوتا۔ قدرت نے جس طرح پر جس کا ہونا بنا دیا بغیر خطا کے اسی طرح ہوتا ہے اور اسی طرح ہوگا۔ پس وہی سچ ہے اور اصول بھی وہی سچے ہیں، جو اس کے مطابق ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ بلاشبہ سب سچ ہے، مگر کیا اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ قدرت الٰہی کے طریقے اور اس کے قانون اسی حد تک ہیں، جو ہمارے تجربہ اور مشاہدہ میں آ چکے ہیں، اس سے زیادہ نہیں۔ جس حالت میں الٰہی قدرتوں کو غیر محدود ماننا ایک ایسا ضروری مسئلہ ہے، جو اس نظام کارخانہ الوہیت سے وابستہ اور اس سے

ترقیات علمیہ کا ہمیشہ کے لئے دروازہ کھلا ہوا ہے، تو پھر کس قدر غلطی کی بات ہے کہ ہم یہ ناکارہ حجت پیش کریں کہ جو تمہاری سمجھ اور مشاہدہ سے باہر ہے، وہ قانون قدرت سے بھی باہر ہے۔ بلکہ جس حالت میں ہم اپنے منہ سے اقرار کر چکے کہ قوانین قدرتیہ غیر متناہی اور غیر محدود ہیں، تو پھر ہمارا یہ اصول ہونا چاہئے کہ ہر ایک نئی بات، جو ظہور میں آوے، پہلے ہی اپنی عقل سے بالاتر دیکھ کر اسکو رد نہ کریں، بلکہ خوب متوجہ ہو کر اس کے ثبوت یا عدم ثبوت کا حال جانچ لیں۔ اگر وہ ثابت ہو، تو اپنے قانون قدرت کی فہرست میں اس کو بھی داخل کر لیں اور اگر وہ ثابت نہ ہو، تو صرف اتنا کہہ دیں کہ ثابت نہیں۔ مگر اس بات کے کہنے کے ہم ہرگز مجاز نہیں ہوں گے کہ وہ امر قانون قدرت سے باہر ہے۔ بلکہ قانون قدرت سے باہر کسی کو سمجھنے کے لئے ہمارے لئے یہ ضرور ہے کہ ہم ہر ایک دائرہ کی طرح خدا تعالیٰ کے تمام قوانین ازلی وابدی پر محیط ہو جائیں اور بخوبی ہمارا فکر اس بات پر احاطہ تام کر لے کہ خدا تعالیٰ نے روز ازل سے آج تک کیا کیا قدرتیں ظاہر کیں اور آئندہ اپنے ابدی زمانہ میں کیا کیا قدرتیں ظاہر کریگا۔ وہ جدید در جدید قدرتوں کے ظاہر کرنے پر قادر ہوگا یا کولھو کے بیل کی طرح انہیں چند قدرتوں میں مقید اور محصور رہیگا، جن کو ہم دیکھ چکے ہیں اور جن پر ہمارا بخوبی احاطہ ہے۔ اور اگر انہیں میں مقید اور محصور رہے گا، تو باوجود اس کے غیر محدود الوہیت اور قدرت اور طاقت کے یہ مقید اور محصور رہنا کس وجہ سے ہوگا۔ کیا وہ آپ ہی وسیع قدرتوں کے دکھلانے سے عاجز آ ئیگا یا کسی دوسرے قاہر نے اس پر جبر کیا ہوگا یا اس کی خدائی کو انہیں چند قسم کی قدرتوں سے قوت پہنچتی ہے اور دوسری قدرتوں کے ظاہر کرنے سے اس پر زوال آتا ہے۔ بہرحال اگر ہم خدا تعالیٰ کی قدرتوں کو غیر محدود مانتے ہیں، تو یہ جنون اور دیوانگی ہے کہ اس کی قدرتوں پر احاطہ کرنے کی امید رکھیں۔ کیونکہ اگر وہ ہمارے مشاہدہ کے پیمانہ میں محدود ہو سکیں، تو پھر غیر محدود اور غیر متناہی کیونکہ رہیں اور اس صورت میں نہ صرف یہ نقص پیش آتا ہے کہ ہمارا فانی اور ناقص تجربہ خدا تعالیٰ ازلی ابدی کی تمام قدرتوں کا حد بست کرنیوالا ہوگا۔ بلکہ ایک بڑا بھاری نقص یہ ہے کہ اس کی قدرتوں کے محدود ہونے سے وہ خود بھی محدود ہو جائیگا۔ اور پھر یہ کہنا پڑیگا کہ جو کچھ خدا تعالیٰ کی حقیقت اور کنہ ہے ہم نے سب معلوم کر لی ہے اور اس کے گہراؤ اور تہہ تک ہم پہنچ گئے ہیں۔ اور اس کلمہ میں جس قدر کفر اور بے ادبی اور بے ایمانی بھری ہوئی ہے، وہ ظاہر ہے حاجت بیان نہیں۔ سو ایک محدود زمانہ کے محدود در محدود تجارب کو پورا پورا قانون قدرت خیال کر لینا اور اس پر غیر متناہی سلسلہ قدرت کو ختم کر دینا اور آئندہ کے لئے اسرار کھلنے سے ناامید ہو جانا ان پست نظروں کا نتیجہ ہے، جنہوں نے خدائے ذوالجلال کو جیسا کہ چاہئے شناخت نہیں کیا اور جو اپنی فطرت میں نہایت منقبض واقع ہوئے ہیں، یہاں

تک کہ ایک کنوئیں کے مینڈک ہو کر یہ خیال کر رہے ہیں کہ گویا ایک سمند ناپیدا کنار پر ان کو عبور حاصل ہو گیا ہے۔ تمام خوشیاں ان کی اور تمام راحتیں غمزدوں کی اس میں ہیں کہ خدا تعالیٰ کی قدرتوں کا کنارہ لا یدرک ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ بے تحقیق اور بے ثبوت عقلی یا آزمائش تاریخی کسی نئی بات کو مان لو، کیونکہ اس عادت سے بہت سے رطب و یابس کا ذخیرہ اکٹھا ہو جاویگا۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ خدائے ذوالجلال کی تعظیم کر کے اس کے نئے کاموں کی نسبت، جو تمہاری نظروں میں نئے دکھائی دیتے ہیں، بیجا ضد بھی مت کرو۔ کیونکہ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں خدا تعالیٰ کی عجائب قدرتوں اور دقائق حکمتوں اور پیچ در پیچ اسراروں سے ابھی تک انسان نے بکلی حد بست نہیں کی اور نہ آگے کو اس کی لیاقت و طاقت ایسی نظر آتی ہے کہ اس مالک الملک کے وراءالوراء بھیدوں کے ایک چھوٹے سے رقبہ زمین کی طرح پیمائش کر سکے یا کسی ایک چیز کے جمیع خواص پر احاطہ کرنے کا دم مار سکے۔ مجھے ان صاف باطن لوگوں کے آگے منطق و دلائل کی حاجت نہیں، جو اپنے اس پیارے مالک سے دلی محبت رکھتے ہیں، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ خود ان کو وہی انکی سچی محبت یہ طریق ادب سکھا دے گی کہ ذات جامع الکمالات حضرت احدیت کے علم کے ساتھ اپنے محدود علم کو برابر جاننا اور اسکی ازلی ابدی قدرتوں کو اپنے مشاہدوں و معلومات سے زیادہ نہ سمجھنا بہت بُرا اور نالائق خیال ہے، جو ادب اور تعظیم اور عجز اور عبودیت کی حقیقت سے نہایت دور پڑا ہوا ہے۔ لیکن میں ان خشک فلسفیوں کو، جو عشق الٰہی اور اسکی بزرگ ذات کی قدرت شناسی سے غافل ہیں، جہاں تک مجھے طاقت عقلی دی گئی ہے، بدلائل شافیہ راہ راست کی طرف پھیرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ انکی روحانی زندگی بہت کمزور ہو گئی ہے۔ **و لا یحیطون بشئی من علمه الا بما شاء۔**

خدا تعالیٰ کی خدائی اور الوہیت، اس کی قدرت غیر محدود اور اسرار نامعدودہ سے وابستہ ہے، جس کو قانون کے طور پر کسی حد کے اندر گھیر لینا انسان کا کام نہیں ہے۔ خدا شناس کے لئے یہ بڑا بھاری بنیادی مسئلہ ہے کہ خدائے ذوالجلال کی قدرتیں اور حکمتیں بے انتہا ہیں۔ اس مسئلہ کی حقیقت سمجھنے اور اس پر عمیق غور کرنے سے سب الجھاؤ اور پیچ خیالات کا رفع ہوتا ہے اور سیدھا راہ حق شناسی اور حق پرستی کا نظر آنے لگتا ہے۔ ہم اس جگہ اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ خدا تعالیٰ ہمیشہ اپنی ازلی ابدی صفات کے موافق کام کرتا ہے۔ اگر ہم دوسرے لفظوں میں اس ازلی ابدی صفات پر چلنے کا نام قانون الٰہی رکھیں، تو بجا۔ مگر ہمارا کلام اور بحث اس میں ہے کہ وہ آثار صفات ازلی ابدی یا یوں کہو کہ وہ قانون قدیم الٰہی محدود یا معدود کیوں مانا جائے۔ ہاں بیشک یہ تو ہم مانتے ہیں اور مان لینا چاہیئے کہ جو صفتیں جناب الٰہی کی ذات میں موجود ہیں، انہیں صفات غیر محدود کے آثار اپنے اپنے وقتوں میں ظہور میں آتے ہیں نہ کوئی امر ان کا

غیر۔اور وہ صفات ہر یک مخلوق ارضی وسماوی پر مؤثر ہو رہی ہیں اور انہیں آثار الصفات کا نام سنت اللہ یا قانون قدرت ہے۔مگر چونکہ خدا تعالیٰ معہ اپنی صفات کاملہ کے غیر محدود اور غیر متناہی ہے، اس لئے ہماری بڑی نادانی ہوگی اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ اس کے آثار الصفات یعنی قوانین قدرت باندازہ ہمارے تجربہ یا فہم مشاہدہ سے ہیں، اس سے بڑھ کر نہیں۔آج کل فلسفی طبع لوگوں کی یہ بڑی بھاری غلطی ہے کہ اول وہ قانون قدت کو ایسا سمجھ بیٹھے ہیں جس کی من کل الوجوہ حد بست ہو چکی تھی اور پھر اس کے بعد جو امر نیا پیش آئے، اس کو ہرگز نہیں مانتے۔اور ظاہر ہے کہ اس خیال کی بنا راستی پر نہیں ہے۔اور اگر یہی سچ ہوتا، تو پھر کسی نئی بات کے ماننے کے لئے کوئی سبیل باقی نہ رہتی اور امور جدیدہ کا دریافت کرنا غیر ممکن ہو جاتا، کیوں کہ اس صورت میں یہ ایک نیا فعل بصورت نقص قوانین طبعی نظر آئیگا اور اس کے ترک کرنے سے ناحق ایک جدید صداقت کو ترک کرنا پڑیگا۔یہی وجہ ہے کہ یہ منحوس اصول آج تک دکھانے کے ہی دانت رہے ہیں نہ کھانے کے۔اور امور جدیدہ کا قوی ظہور اس قاعدہ کی تارو پود کو ہمیشہ توڑتا رہا ہے۔ جب کسی زمانہ میں کوئی جدید خاصہ متعلق علم طبعی یا ہیئت وغیرہ علوم کے متعلق ظہور پکڑتا رہا ہے، تو ایک مرتبہ فلسفہ کے شیش محل پر ایک سخت بھونچال کا موجب ہوا ہے، جس سے منکر فلسفیوں کا شور شرارہ کچھ عرصہ کے واسطے فرو ہوتا رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے خیالات ہمیشہ سے پلٹے کھاتے رہے ہیں اور کبھی ایک ہی صورت یا ایک نقشہ پر ہرگز قائم نہیں رہے۔اگر کوئی صفحات تاریخ زمانہ میں واقعات سوانح عمری حکماء پر غور کرے، تو اس کو معلوم ہو جائیگا کہ اس کے خیالات کی ٹرین کتنی مختلف سڑکوں و راہوں پر کس قدر متناقض چالوں پر چلی ہے۔(ماخوذ)

حقیقت شق القمر

کسی چیز کے ایک نئے خاصہ کا ظہور میں آنا اس کے پہلے خاصہ کے ابطال کے لئے لازمی امر نہیں ہے۔سو اس قاعدہ کے رو سے دانشمند لوگ، جو خدا تعالیٰ کی عظیم الشان قدرتوں سے ہمیشہ ہیبت زدہ رہتے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ حکیم مطلق، جس کی حکمتوں کا انتہا نہیں، اس کی طرف سے قمر و شمس میں ایسی خاصیت مخفی ہونا ممکن ہے کہ باوجود انشقاق کے ان کے فعل میں فرق نہ آوے۔اسی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔**اقتربت الساعة و انشق القمر** یعنی نزدیک آ گئی وہ گھڑی اور پھٹ گیا چاند۔اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ روز ازل سے حکیم مطلق نے ایک خاصہ مخفی چاند میں رکھا ہوا تھا کہ ایک ساعت مقررہ پر اس کا انشقاق ہوگا۔اور یہ ظاہر ہے کہ نجوم اور شمس و قمر کے خواص کا ظہور ساعات مقررہ سے وابستہ ہے۔اور ساعات کو حدوث عجائبات سماوی وارضی میں بہت کچھ دخل ہے۔اور

حقیقت میں قوانین قدرتیہ کا شیرازہ انہیں ساعات سے باندھا ہے۔ سو کیا عمدہ اور پُر حکمت اور فلسفیانہ اشارہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے آیت مندرجہ بالا میں فرما کر چاند کو پھٹنے کی جو ساعت مقرر اور مقدر تھی وہ نزدیک آ گئی اور چاند پھٹ گیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ اس آیت کے آگے بھی فرماتا ہے۔ **و کذبوا و اتبعوا اھواء ھم و کل امر مستقر**۔ یعنی کفار نے چاند پھٹنے کو سحر پر حمل کیا اور تکذیب کی۔ مگر یہ سحر نہیں ہے، بلکہ خدا تعالیٰ کے ان امور یعنی قوانین قدرتیہ میں سے ہے، جو اپنے اپنے وقتوں میں قرار پکڑنے والے ہیں۔ اور عقلمند انسان اس نشان قدرت سے کیوں تعجب کرے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے کارخانہء قدرت میں یہی ایک بات بالاتر از عقل ہے، جو حکیموں اور فلسفیوں کی سمجھ میں نہیں آتی اور باقی اسرار قدرت انہوں نے سمجھ لئے ہیں۔ اور کیا یہ ایک ہی عقدہ لاینحل ہے اور باقی سب عقدوں کو حل کرنے سے فراغت ہو چکی ہے۔ اور کیا اللہ تعالیٰ کے عجائب کاموں میں سے یہی ایک عجیب کام ہے اور کوئی نہیں۔ بلکہ اگر غور کر کے دیکھو، تو اس قسم کے ہزارہا عجائب کام اللہ تعالیٰ کے دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ زمین پر سخت زلازل آتے رہتے ہیں اور بسا اوقات کئی میل زمین تہ و بالا ہو گئی ہے۔ مگر پھر بھی انتظام عالم میں خلل واقع نہیں ہوا، حالانکہ جیسے کہ چاند کو اس انتظام میں دخل ہے ویسا ہی زمین کو۔ (ماخوذ)

سوال۔ کیا اس شق القمر کا حوالہ ممالک غیر کی تاریخ میں موجود ہے؟

جواب۔ چاند کے دو ٹکڑے کرنے کا دعویٰ زور شور سے ہو چکا تھا، یہاں تک کہ خاص قرآن میں مخالفوں کو الزام دیا گیا کہ انہوں نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا، تو انہوں نے اعراض کر کے کہا کہ یہ پکا جادو ہے۔ اور پھر یہ دعویٰ نہ صرف عرب میں بلکہ اس زمانہ میں تمام ممالک روم، شام و مصر و فارس وغیرہ دور دراز ممالک میں پھیل گیا تھا۔ تو اس صورت میں یہ بات کچھ تعجب کا محل نہ تھا کہ مختلف قومیں، جو مخالف اسلام تھیں، وہ دم بخود اور خاموش رہتیں اور بوجہ عناد و بغض و حسد شق القمر کی گواہی دینے سے زبان بند رکھتیں، کیونکہ منکر اور مخالف کا دل اپنے کفر اور مخالفت کی حالت میں کب چاہتا ہے کہ وہ مخالف مذہب کی تائید میں کتابیں لکھے یا اس کے معجزات کی گواہی دے۔

اگر کوئی ادائے شہادت سے خاموش رہے، تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ بلکہ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اگر مخالف کی طرف سے ایک دعویٰ کا جھوٹا ہونا کھل جائے، تو پھر جھوٹ کی قلعی کھولنے کے لئے قلم نہ اٹھائیں اور دروغگو کو اس کے گھر تک نہ پہنچائیں۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، جنہوں نے عام اور اعلانیہ طور پر یہ دعویٰ مشہور کر دیا تھا کہ میرے ہاتھ سے معجزہ شق القمر وقوع میں آ گیا ہے اور کفار نے اس کو بچشم خود دیکھ بھی لیا ہے، مگر اس کو جادو قرار دیا، اپنے اس دعویٰ میں سچے نہیں تھے تو پھر کیوں مخالفین

آنحضرتؐ، جواس زمانہ میں تھے اور جن کو یہ خبریں گویا نقارہ کی آواز سے پہنچ چکی تھیں، چپ رہے اور کیوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مؤاخذہ نہ کیا کہ آپ نے کب چاند کو دوٹکڑے کر کے دکھایا اور کب ہم نے اس کو جادو کہا اور اس کے قبول سے منہ پھیرا اور کیوں اپنے مرتے دم تک خاموشی اختیار کی اور منہ بند رکھا۔ یہاں تک کہ اس عالم سے گزر گئے۔ کیا ان کی یہ خاموشی، جوان کی مخالفانہ رنگ حالت اور جوش مقابلہ کے بالکل برخلاف تھی، اس بات کا یقین نہیں دلاتی کہ کوئی ایسی سخت روک تھی، جس کی وجہ سے کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ مگر بجز ظہور سچائی کے اور کون سی روک تھی؟ یہ معجزہ مکہ میں ظہور میں آیا تھا اور مسلمان ابھی بہت کمزور اور غریب اور عاجز تھے۔ پھر تعجب یہ کہ ان کے بیٹوں یا پوتوں نے بھی انکار میں کچھ زبان کشائی نہ کی، حالانکہ ان پر واجب ولازم تھا کہ اتنا بڑا دعویٰ اگر افترائے محض تھا اور صدہا کوسوں میں مشہور ہو گیا تھا، اس کے رد میں کتابیں لکھتے اور دنیا میں شائع اور مشہور کرتے۔ اور جب کہ ان لاکھوں آدمیوں عیسائیوں، عربوں، یہودیوں، مجوسیوں وغیر میں رد لکھنے کی کسی کو جرات نہ ہوئی اور جو لوگ مسلمان تھے، وہ علانیہ ہزاروں آدمیوں کے روبرو چشم دید گواہی دیتے رہے، جن کی شہادتیں آج تک اس زمانہ کی کتابوں میں مندرج پائی جاتی ہیں، تو یہ صریح دلیل اس بات پر ہے کہ مخالفین ضرور شق القمر مشاہدہ کر چکے تھے اور لکھنے کے لئے کوئی بھی گنجائش باقی نہیں رہی تھی، اور یہی بات تھی جس نے ان کو شوروغوغائے منکرانہ سے چپ رکھا تھا، سو جب کہ اس زمانہ میں کروڑ ہا مخلوقات میں شق القمر کا معجزہ مشہور ہو گیا، مگر ان لوگوں نے خجلت زدہ ہو کر اس کے مقابلہ میں دم بھی نہ مارا، تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس زمانہ کے مخالفین اسلام کا چپ رہنا شق القمر کے ثبوت کی دلیل ہے۔

ماسوااس کے یہ بھی کچھ ضروری معلوم نہیں ہوتا کہ واقعہ شق القمر پر، جو چند سیکنڈ سے کچھ زیادہ نہیں تھا، ہر یک ولایت کے لوگ اطلاع پا جائیں۔ کیونکہ مختلف ملکوں میں دن رات کا قدرتی تفاوت اور کسی جگہ مطلع ناصاف اور پر غبار ہونا اور کسی جگہ ابر ہونا اور ایسا ہی کئی اور موجبات عدم رویت ہو جاتے ہیں۔ اور نیز بالطبع انسان کی طبیعت اور عادت اس کے برعکس واقع ہوئی ہے کہ ہر وقت آسمان کی طرف نظر لگائے رکھے، بالخصوص رات کے وقت، جو سونے اور آرام کرنے کا اور بعض موسموں میں اندر بیٹھنے کا وقت ہے، ایسا التزام بہت بعید ہے۔

پھر ان سب باتوں کے بعد ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ شق القمر کے واقعہ پر ہندوؤں کی معتبر کتابوں میں بھی شہادت پائی جاتی ہے۔ مہابھارت کے دہرم پرم میں بیاس جی مہاراج صاحب لکھتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں چاند کے دوٹکڑے ہو کر پھر مل گیا تھا اور وہ اس شق القمر کا اپنے بے مثال خیال سے بسوامتر کا

معجزہ قرار دیتے ہیں۔لیکن پنڈت دیانند صاحب کی شہادت اور یورپ کے محققوں کے بیان سے پایا جاتا ہے کہ مہابھارت وغیرہ پران کچھ قدیم اور پرانے نہیں ہیں، بلکہ بعض پرانوں کی تالیف کو تو صرف آٹھ سو یا نو سو برس ہوا ہے۔اب قرین قیاس ہے کہ مہابھارت یا اس کا واقعہ، جو بعد مشاہدہ واقعہ شق القمرو معجزہ آنحضرتؐ تھا،لکھا گیا اور بسوامتر کا نام صرف بیجا طور کی تعریف پر، جیسا کہ قدیم سے ہندوؤں کی اپنے بزرگوں کی نسبت عادت ہے، درج کیا گیا ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی شہرت ہندوؤں میں مؤلف تاریخ فرشتہ کے وقت میں بھی بہت کچھ پھیلی ہوئی تھی ، کیونکہ اس نے اپنی کتاب کے مقالہ یازدہم میں ہندوؤں سے یہ شہرت یافتہ بیان لے کر بیان کیا ہے کہ شہر وہار کہ جو متصل دریائے پھنبل صوبہ مالوہ میں واقع ہے، اب اس کو شاید دھارانگری کہتے ہیں، وہاں کا راجہ اپنے محل کی چھت پر بیٹھا تھا کہ ایک بارگی اس نے دیکھا کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور پھر مل گیا۔اور بعد تفتیش اس راجہ پر کھل گیا کہ یہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے، تب وہ مسلمان ہو گیا۔اس ملک کے لوگ اس کے اسلام کی یہی وجہ بیان کرتے تھے اور اس گردونواح کے ہندوؤں میں یہ ایک واقعہ مشہور تھا۔بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ایک عجیب قسم کا خسوف تھا، جس کی قرآن شریف نے پہلے خبر دی تھی اور یہ آیتیں بطور پیش گوئیوں کے ہیں۔ اس صورت میں شق کا لفظ محض استعارہ کے رنگ میں ہوگا، کیونکہ خسوف کسوف میں، جو حصہ پوشیدہ ہوتا ہے، وہ گویا پھٹ کر علیحدہ ہو جاتا ہے۔یہ ایک استعارہ ہے۔(ماخوذ)

حقیقت معجزات

لفظ معجزہ لغت عرب میں اعجاز سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں عاجز و بے طاقت کرنا اور کسی کو عاجز پانا۔اور اصطلاح میں معجزات سے وہ امور خارق عادت مراد ہیں، جو باریک اور منصفانہ نظر سے ثابت ہوں اور بجز مؤیدان الٰہی دوسرے لوگ ایسے امور پر قادر نہ ہو سکیں۔اس وجہ سے وہ امور خارق عادت کہلاتے ہیں، مگر بدبخت ازلی ان معجزانہ امور سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔شریر انسان کو خدا تعالیٰ کے معجزات ونشانات سے ہدایت حاصل کرنا نصیب نہیں ہوتی۔وہ روشنی دیکھ کر آنکھ بند کر لیتا ہے، تا ایسا نہ ہو کہ روشنی اس کی آنکھوں کو منور کرے اور راہ دکھائی دے۔شریر آدمی ہزار نشان دیکھ کر اس سے منہ پھیر لیتا ہے اور ایک بات جس کو اپنی ہی حماقت سے سمجھ نہیں سکتا، بار بار پیش کرتا ہے۔جو شخص خدا تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے، اس پر یہ فرض نہیں ہے کہ ایسے نشان دکھلائے، جس سے ستارے زمین پر گریں یا آفتاب مغرب سے طلوع کرے یا بکری کو انسان بنا کر دکھلا دے یا لوگوں کے روبرو آسمان پر چڑھ جائے اور ان کے روبرو ہی اترے اور آسمان سے ایک لکھی ہوئی کتاب لاوے، جس کو لوگ خود ہاتھوں میں لیکر

پڑھ لیں یا اس کے تمام مکانات سونے کے بن جائیں یا اسکے ہاتھ سے لوگوں کے باپ دادے مرے ہوئے زندہ ہو کر قبروں سے بولتے ہوئے اور چیختے ہوئے نکلیں اور اپنے بیٹوں کو لعنت کریں اور نفریں کر کے کہیں کہ یہ تو حقیقت میں سچا خدا کا رسول ہے۔ یہ غضب تم نے کیا کہ اس کے منکر ہو گئے۔ ہم بچشم خود دیکھ آئے ہیں کہ اس پر ایمان لانیوالا سیدھا بہشت کی طرف جاتا ہے اور اس سے منکر رہنے والا نہایت ذلیل حالت میں دوزخ میں ڈالا جاتا ہے۔ اور شہر میں جلسے کریں اور تمام منکروں کو ان جلسوں میں بلائیں اور اپنی اولاد کو کہیں کہ تم جانتے ہو کہ ہم تمہارے باپ دادا ہیں اور تم جانتے ہو کہ ہم کس قدر اس شخص کے دشمن تھے۔ لیکن جب ہم مر گئے، تو اس کی دشمنی کی وجہ سے ہم دوزخ میں ڈالے گئے۔ دیکھو ہمارے بدن آگ میں جھلسے ہوئے اور سیاہ ہو رہے ہیں اور تمہارے روبرو ہم قبروں میں سے نکلے ہیں، تا ہم گواہی دیں کہ یہ شخص خدا تعالیٰ کی طرف سے اور سچا نبی ہے۔ یاد رکھو کہ ایسے لیکچر کبھی مُردوں نے قبروں میں سے نکل کر نہیں دیئے اور کبھی اور کسی زمانہ میں ایسے جلسے نہیں ہوئے کہ چند لوگوں کے باپ دار قبروں میں سے زندہ نکل آئے ہوں۔ تب ایک مکان جلسہ کا مقرر ہو کر تمام شہر کے لوگ ان مردوں کے سامنے بلائے گئے ہوں اور ان مردوں نے ہزاروں لوگوں کے روبرو کھڑے ہو کر بلند آواز سے یہ لیکچر دیئے ہوں کہ اے حاضرین ہم آپ کا شکر کرتے ہیں کہ آپ ہمارا لیکچر سننے کے لئے آئے۔ آپ صاحبان جانتے ہیں اور ہمیں خوب پہچانتے ہیں کہ ہم فلاں فلاں محلّہ کے رہنے والے اور فلاں فلاں شخص کے دادا پڑدادا ہیں اور چند سال ہوئے کہ ہم طاعون سے یا ہیضہ سے یا کسی اور بیماری سے فوت ہو گئے تھے اور آپ لوگ ہمارے جنازہ میں شریک تھے اور آپ لوگوں نے ہی ہمیں دفن کیا تھا یا پھونک دیا تھا۔ پھر بعد اسکے آپ صاحبوں نے اس بزرگ نبی کو، جو ہمارے صدر نشینی کی کرسی کو زیب دے رہا ہے، نہایت تحقیر سے رد کیا اور اس کو جھوٹا خیال کیا اور اس سے چاہا کہ معجزہ کے طور پر چند مردے زندہ ہوں، تب اسکی دعا سے ہم زندہ ہو گئے، جو اس وقت آپ صاحبوں کے سامنے کھڑے ہیں۔ صاحبان، آنکھ کھول کر دیکھ لو کہ ہم وہی ہیں اور ہم سے ہمارے پورے قصے پوچھ لو، زندہ ہو کر ہم چشم دید گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص درحقیقت سچا ہے اور ہم اسکے نہ ماننے کی وجہ سے دوزخ میں جلتے ہوئے آئے ہیں۔ سو ہماری گواہی چشم دید گواہی ہے، اسکو قبول کرو، تا تم دوزخ سے بچ جاؤ۔ اب کیا کوئی کانشنس کوئی ضمیر کوئی نورِ قلب قبول کرتا ہے کہ ایسا لیکچر کسی مردہ نے زندہ ہو کر دیا اور پھر لوگوں نے قبول نہیں کیا۔

پس جو شخص اب بھی نہیں سمجھتا کہ نشان کس حد تک ظاہر ہوتے ہیں، وہ خود مردہ ہے۔ اگر نشانوں میں ایسے لیکچر مُردوں کی طرف سے ضروری ہیں، تو پھر ایمان کا کچھ فائدہ نہیں، کیونکہ ایمان اس حد تک

ایمان کہلاتا ہے کہ ایک بات من وجہ ظاہر ہو اور من وجہ پوشیدہ بھی ہو۔یعنی ایک باریک نظر سے اس کا ثبوت ملتا ہو اور ایک باریک نظر سے نہ دیکھا جائے تو سرسری طور پر حقیقت پوشیدہ رہ سکتی ہے۔لیکن جب سارا پردہ ہی کھل گیا، تو کون ہے کہ ایسی کھلی بات کو قبول نہیں کرے گا۔

درحقیقت معجزات کی مثال ایسی ہے جیسے چاندنی رات کی روشنی، جس کے کسی حصہ میں کچھ بادل بھی ہو۔مگر وہ شخص، جو شب کور ہو، جو رات کو نہیں دیکھ سکتا، اس کے لئے یہ چاندنی کچھ مفید نہیں۔ایسا تو ہرگز نہیں ہوسکتا اور نہ کبھی ہوا کہ اس دنیا کے معجزات اسی رنگ سے ظاہر ہوں، جس رنگ سے قیامت میں ظہور ہوگا۔اگر ایسے معجزات ظاہر ہوتے، تو دنیا دنیا نہ رہتی اور تمام پردے کھل جاتے اور ایمان لانے کا ایک ذرہ بھی ثواب باقی نہ رہتا۔

یادرہے کہ معجزہ صرف حق اور باطل میں فرق دکھلانے کے لئے اہل حق کو دیا جاتا ہے۔اور معجزہ کی اصل غرض صرف اس قدر ہے کہ عقلمندوں اور منصفوں کے نزدیک سچے اور جھوٹے میں ایک مابہ الامتیاز قائم کرنے کے لئے کافی ہو۔اور یہ اندازہ ہر ایک زمانہ کی حاجت کے مناسب حال ہوتا ہے اور نیز نوعیت معجزہ بھی حسب حال زمانہ ہی ہوتی ہے۔یہ بات ہرگز نہیں ہے کہ ہر ایک متعصب اور جاہل اور بدطبع کو کیسا ہی مصلحت الٰہیہ کے برخلاف اور قدر ضرورت سے بڑھ کر کوئی معجزہ مانگے، تو وہ بہر حال دکھلانا ہی پڑے۔یہ طریق جیسا کہ حکمت الٰہیہ کے برخلاف ہے، ایسا ہی انسان کی ایمانی حالت کو بھی مضر ہے۔ کیونکہ اگر معجزات کا حلقہ ایسا وسیع کر دیا جائے کہ جو کچھ قیامت کے وقت پر موقوف رکھا گیا ہے، وہ سب دنیا میں بذریعہ معجزہ ظاہر ہو سکے، تو پھر قیامت اور دنیا میں کوئی فرق نہ ہوگا۔حالانکہ اس فرق کی وجہ سے جن اعمال صالحہ اور عقائد صحیحہ کا، جو دنیا میں اختیار کئے جائیں ثواب ملتا ہے، وہی عقائد اور اعمال قیامت کو اختیار کئے جائیں، تو ایک رتی بھی ثواب نہیں ملے گا، جیسا کہ تمام نبیوں کی کتابوں اور قرآن شریف میں بھی بیان فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے دن کسی بات کا قبول کرنا یا کوئی عمل کرنا نفع نہیں دے گا اور اس وقت ایمان لانا محض بیکار ہوگا، کیونکہ ایمان اس حد تک ایمان کہلاتا ہے، جب کہ کسی مخفی بات کو ماننا پڑے۔لیکن جبکہ پردہ کھل گیا اور روحانی عالم کا دن چڑھ گیا اور ایسے امور قطعی طور پر ظاہر ہوگئے کہ خدا پر اور روز جزا پر شک کرنے کی کوئی بھی وجہ نہ رہی، تو پھر کسی بات کو اس وقت ماننا، جس کو دوسرے لفظوں میں ایمان کہتے ہیں، محض تحصیل حاصل ہوگا۔غرض نشان اس وجہ سے کھلی کھلی چیز نہیں ہے، جس کے ماننے کے لئے تمام دنیا بغیر اختلاف اور بغیر عذر اور بغیر چوں و چرا کے مجبور ہو جائے اور کسی طبیعت کے انسان کو اس کے نشان ہونے میں کلام نہ رہے اور کسی غبی سے غبی انسان پر بھی وہ امر مشتبہ نہ رہے۔

غرض نشان اور معجزہ ہر ایک طبیعت کے لئے ایک بدیہی امر نہیں، جو دیکھتے ہی ضروری التسلیم ہو۔ بلکہ نشانوں سے وہی عقلمند اور منصف اور راستباز اور راست طبع فائدہ اٹھاتے ہیں، جو اپنی فراست اور دور بینی اور باریک نظر اور انصاف پسندی اور خدا ترسی اور تقویٰ شعاری سے دیکھ لیتے ہیں کہ وہ ایسے امور ہیں، جو دنیا کی معمولی باتوں میں سے نہیں ہیں اور نہ ایک کاذب ان کے دکھلانے پر قادر ہوسکتا ہے اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ امور انسانی بناوٹ سے بہت دور ہیں اور بشری دسترس سے برتر ہیں۔ اور ایک ان میں خصوصیت اور امتیازی علامت ہے، جس پر انسان کی معمولی طاقتیں اور پرتکلف منصوبے قدرت نہیں پاسکتے اور وہ اپنے لطیف فہم اور فراست سے اس تہہ تک پہنچ جاتے ہیں کہ ان کے اندر ایک نور ہے اور خدا کے ہاتھ کی ایک خوشبو ہے، جس پر مکر اور فریب یا کسی چالاکی کا شبہ نہیں ہوسکتا۔ پس جس طرح سورج کی روشنی پر یقین لانے کے لئے صرف سورج ہی کافی نہیں، بلکہ آنکھ کے نور کی بھی ضرورت ہے تا اس روشنی کو دیکھ سکے۔ اسی طرح معجزہ کی روشنی پر یقین لانے کے لئے فقط معجزہ ہی کافی نہیں ہے، بلکہ نور فراست کی بھی ضرورت ہے۔ اور جب تک معجزہ دیکھنے والے کی سرشت میں فراست صحیحہ اور عقل سلیم کی روشنی نہ ہو، تب تک اس کا قبول کرنا غیر ممکن ہے۔ مگر بدبخت انسان، جس کو یہ نور فراست عطا نہیں ہوا، وہ ایسے معجزات سے، جو صرف امتیازی حد تک ہیں، تسلی نہیں پاتا اور بار بار یہی سوال کرتا ہے کہ بجز ایسے کے میں کسی معجزہ کو قبول نہیں کرسکتا کہ جو نمونہ قیامت ہو جائے مثلاً کوئی شخص میرے روبرو آسمان پر چڑھ جائے اور پھر سب کے سامنے اترے اور اپنے ساتھ کوئی ایسی کتاب لائے، جو اترنے کے وقت اس کے ہاتھ میں ہو اور صرف اسی پر کفایت نہیں، بلکہ تب مانیں گے کہ ہم اس کتاب کو ہاتھ میں لے کر دیکھ لیں یا پڑھ لیں یا چاند کا ٹکڑا یا سورج کا ٹکڑا اپنے ساتھ لائے، جو زمین کو روشن کرسکے، یا اس کے ساتھ آسمان سے اتریں، جو فرشتوں کی طرح خارق عادت کام کر کے دکھلائیں، یا دس بیس مردے اس کی دعا سے زندہ ہو جائیں اور وہ شناخت کئے جائیں کہ فلاں فلاں شخص کے باپ دادا ہیں، جو فلاں تاریخ کو مر گئے تھے۔ اور صرف اسی قدر کافی نہیں، بلکہ ساتھ اس کے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ تمام شہروں میں مجلس منعقد کر کے لیکچر دیں اور بلند آواز سے کہہ دیں کہ درحقیقت ہم مردے ہیں، جو دوبارہ زندہ ہو کر دنیا میں آئے ہیں اور ہم اس لئے آئے ہیں کہ تا گواہی دیں کہ فلاں مذہب سچا ہے یا فلاں شخص، جو دعویٰ کرتا ہے کہ میں خداتعالیٰ کی طرف سے ہوں، وہ سچ کہتا ہے اور ہم خداتعالیٰ کے منہ سے سن کر آئے ہیں کہ وہ سچا ہے۔ یہ وہ خود تراشیدہ معجزات ہیں، جو اکثر جاہل لوگ، جو ایمان کی حقیقت سے بکلی بے خبر ہیں، مانگا کرتے ہیں یا ایسے ہی اور بیہودہ خوارق، جو خداتعالیٰ کی اصل منشا سے بہت دور ہیں، طلب کیا کرتے ہیں۔

معجزہ کی اصل حقیقت یہ ہے کہ معجزہ ایسے خارق عادت امر کو کہتے ہیں کہ فریق مخالف اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز آ جائے، خواہ وہ امر بظاہر نظر انسانی طاقتوں کے اندر ہی معلوم ہو، جیسا کہ قرآن شریف کا معجزہ، جو ملک عرب کے تمام باشندوں کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ پس وہ اگرچہ بنظر سرسری انسانی طاقتوں کے اندر معلوم ہوتا تھا، لیکن اس کی نظیر پیش کرنے سے عرب کے تمام باشندے عاجز آ گئے۔ پس معجزہ کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے قرآن شریف کا کلام نہایت روشن مثال ہے کہ بظاہر وہ بھی ایک کلام ہے، جیسا کہ انسان کا کلام ہوتا ہے، لیکن وہ اپنی فصیح تقریر کے لحاظ سے اور نہایت لذیذ اور مصفیٰ اور رنگین عبارت کے لحاظ سے، جو ہر جگہ حق اور حکمت کی پابندی کا التزام رکھتی ہے، اور نیز روشن دلائل کے لحاظ سے جو تمام دنیا کے مخالفانہ دلائل پر غالب آ گئیں اور نیز زبردست پیشگوئیوں کے لحاظ سے ایک ایسا لاجواب معجزہ ہے، جو باوجود گزرنے تیرہ سو برس کے اب تک کوئی مخالف اس کا مقابلہ نہیں کر سکا اور نہ کسی کو طاقت ہے جو کرے۔ قرآن شریف کو تمام دنیا کی کتابوں سے یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ معجزانہ پیشگوئیوں کو بھی معجزانہ عبارت میں، جو اعلیٰ درجہ کی بلاغت اور فصاحت سے پُر اور حق اور حکمت سے بھری ہوئی ہیں، بیان فرماتا ہے۔ غرض اصلی اور بھاری مقصد معجزہ سے حق اور باطل یا صادق اور کاذب میں ایک امتیاز دکھلانا ہے۔ اور ایسے امتیازی امر کا نام معجزہ یا دوسرے لفظوں میں نشان ہے۔ نشان ایک ایسا ضروری امر ہے کہ اس کے بغیر خداتعالیٰ کے وجود پر بھی یقین کرنا ممکن نہیں اور نہ وہ ثمرہ حاصل ہونا ممکن ہے کہ جو پورے یقین سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مذہب کی اصلی سچائی خداتعالیٰ کی ہستی کی شناخت سے وابستہ ہے۔ سچے امر کے ضروری اور اہم لوازم میں سے یہ امر ہے کہ اس میں ایسے نشان پائے جائیں کہ جو خداتعالیٰ کی ہستی پر قطعی اور یقینی دلالت کریں۔ (ماخوذ)

ظہور معجزات وکرامات وخارق عادت امور کی وجہ

جس طرح ایک مذہب کے لئے صرف ظلی طور پر اپنی عمدگی دکھلانا کافی نہیں ہے، ایسا ہی ایک ظاہری راست باز کے لئے صرف یہ دعویٰ کافی نہیں ہے کہ وہ خداتعالیٰ کے احکام پر چلتا ہے۔ بلکہ اس کے لئے ایک امتیازی نشان چاہیئے جو اس کی راست بازی پر گواہ ہو، کیونکہ ایسا دعویٰ تو قریباً ہر ایک آدمی کر سکتا ہے کہ وہ خداتعالیٰ سے محبت رکھتا ہے اور اس کا دامن تمام اقسام فسق و فجور سے پاک ہے۔ مگر ایسے دعویٰ پر تسلی کیونکر ہو کہ فی الحقیقت ایسا ہی امر واقع ہے۔ اگر کسی میں مادہ سخاوت ہے، تو ناموری کی غرض سے بھی ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی عابد زاہد ہے، تو ریاکاری بھی اس کا موجب ہو سکتی ہے۔ اور اگر فسق و فجور سے کوئی بچ گیا ہے، تو تہی دستی بھی اس کا باعث ہو سکتی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے لعن

طعن کے خوف سے کوئی پارسا طبع بن بیٹھے اور عظمت الٰہی کا کچھ بھی اس کے دل پر اثر نہ ہو۔ پس ظاہر ہے کہ عمدہ چال چلن اگر ہو بھی تاہم حقیقی پاکیزگی پر کامل ثبوت نہیں ہوسکتا۔ شاید در پردہ کوئی اور اعمال ہوں۔ لہٰذا حقیقی رستبازی کے لئے خدا تعالیٰ کی شہادت ضروری ہے، جو عالم الغیب ہے اور اگر ایسا نہ ہو، تو دنیا میں پاک ناپاک کے حالات مشتبہ ہو جاتے ہیں اور امان اٹھ جاتا ہے۔ اس لئے مابہ الامتیاز کا خلعت عطا نہیں فرمایا۔ یقیناً سمجھو کہ وہ مذہب ٹھیک نہیں ہے اور نور سے بالکل خالی ہے۔ خدا کی طرف سے جو کتاب ہو، وہ آپ بھی اپنے اندر مابہ الامتیاز رکھتی ہے اور اپنے پیرو کو بھی امتیازی نشان بخشتی ہے۔

غرض بغیر امتیازی نشان کے نہ مذہبِ حق اور مذہبِ باطل میں کوئی کھلا کھلا تفرقہ پیدا ہوسکتا ہے اور نہ ایک راست باز اور مکار کے درمیان کوئی فرق بیّن ظاہر ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ایک شخص درصل بدچلن اور فاسق اور فاجر ہو، لیکن اس کی بدچلنیاں ظاہر نہ ہوں۔ پس اگر ایسی صورت میں وہ بھی راست بازی کا دعویٰ کرے، جیسا کہ ایسے دعوے ہمیشہ دنیا میں پائے جاتے ہیں، تو پھر خدا تعالیٰ کی طرف سے حقیقی راست باز کے لئے کونسا ایک چمکتا ہوا نشان ہے، جس سے وہ ایسے مکاروں سے الگ کا الگ دکھائی دے اور روز روشن کی طرح شناخت کرلیا جائے۔ حالانکہ قدیم سے، اور جب سے کہ دنیا کی بنیاد ڈالی گئی ہے، سنت اللہ اسی طرح پر جاری ہے اور یہی قانون قدرت ہے کہ تمام عمدہ اور خراب چیزوں میں ایک امتیازی نشان رکھا گیا ہے۔ جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ بظاہر سونا اور پیتل ہم شکل ہیں، یہاں تک کہ بعض جاہل اس سے دھوکہ بھی کھا لیتے ہیں، لیکن حکیم مطلق نے سونے میں ایک امتیازی نشان رکھا ہے، جس کو صراف فی الفور شناخت کر لیتے ہیں۔ اور بہترے سفید اور چمکتے ہوئے پتھر ایسے ہیں کہ جو ہیرے سے بہت ہی مشابہ ہیں اور بعض نادان ان کو ہیرا سمجھ کر ہزار ہا روپیہ کا نقصان اٹھا لیتے ہیں۔ لیکن صانع عالم نے ہیرے کے لئے ایک امتیازی نشان رکھا ہوا ہے، جس کو ایک دانشمند جوہری شناخت کر سکتا ہے۔ ایسا ہی دنیا کے کل جواہرات اور عمدہ چیزوں کو دیکھ لو کہ اگرچہ بظاہری نظر کئی ردی اور ادنیٰ درجہ کی چیزیں ان سے شکل میں مل جاتی ہیں، مگر ہر ایک پاک اور قابل قدر جوہر اپنے امتیازی نشان سے اپنی خصوصیت کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو دنیا میں اندھیر پڑ جاتا۔ اور خود انسان کو دیکھو کہ اگرچہ وہ صورت میں بہت سے حیوانات سے مشابہت رکھتا ہے، جیسا کہ بندر سے، تاہم اس میں ایک امتیازی نشان ہے، جس کی وجہ سے ہم کسی بندر کو انسان نہیں کہہ سکتے۔ پھر جب کہ اس مادی دنیا میں جو ناپائیدار اور بے ثبات ہے اور جس کا نقصان بھی بمقابل آخرت کے کچھ چیز نہیں ہے، ہر ایک عمدہ اور نفیس جوہر کے لئے حکیم مطلق نے امتیازی نشان قائم کر دیا ہے، جس کی وجہ سے وہ جوہر بسہولت شناخت کیا جاتا ہے، تو پھر مذہب،

جس کی غلطی جہنم تک پہنچاتی ہے، اور ایسا ہی ایک راست باز اور اہل اللہ کا وجود، جس کا انکار شقاوت ابدی کے گڑھے میں ڈالتا ہے، کیونکر یقین کیا جائے کہ اس کی شناخت کے لئے کوئی بھی یقینی اور قطعی نشان نہیں۔ پس ایسے شخص سے زیادہ کون احمق اور نادان ہے کہ جو خیال کرتا ہے کہ سچے مذہب اور سچے راست باز کے لئے کوئی امتیازی نشان خدا نے قائم نہیں کیا، حالانکہ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں آپ فرماتا ہے کہ کتاب اللہ، جو مذہب کی بنیاد ہے، امتیازی نشان اپنے اندر رکھتی ہے، جس کی نظیر کوئی پیش نہیں کرسکتا۔ اور نیز فرمایا کہ ہر ایک مومن کو فرقان عطا ہوتا ہے، یعنی امتیازی نشان، جس سے وہ شناخت کیا جاتا ہے۔ پس یقیناً سمجھو کہ سچا مذہب اور حقیقی راست باز ضرور اپنے ساتھ امتیازی نشان رکھتا ہے اور اس کا نام دوسرے لفظوں میں معجزہ اور کرامت اور خارق عادت امر ہے۔ ہمارے اسقدر بیان سے ثابت ہو گیا کہ سچا مذہب ضرور اسبات کا حاجتمند ہے کہ اسمیں کوئی ایسی معجزانہ خاصیت ہو کہ جو دوسرے مذہب میں وہ نہ پائی جائے اور سچا راست باز ضرور اس بات کا حاجت مند ہے کہ کچھ ایسی معجزانہ تائیدات الٰہیہ اسکے شامل حال ہوں کہ جنکی نظیر غیروں میں ہرگز نہ مل سکے، تا انسان ضعیف البنیان، جو ادنیٰ ادنیٰ شبہ سے ٹھوکر کھاتا ہے، دولت قبول سے محروم نہ رہے۔ سوچ کر دیکھو کہ جس حالت میں انسانوں کی غفلت اور وہم پرستی کی یہ حالت ہے کہ باوجودیکہ خدا کے سچے مامورین سے صدہا نشان ظاہر ہوتے ہیں اور ہر ایک پہلو سے خدا انکی مدد فرماتا ہے پھر بھی وہ اپنی بدبختی سے شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور ہزارہا نشانوں سے کچھ بھی فائدہ نہ اٹھا کر طرح طرح کی بدگمانیوں میں پڑ جاتے ہیں اور پھر اس صورت حال میں انکا کیا حال ہوتا کہ ایک مامور من اللہ کیلئے آسمان سے کوئی امتیازی نشان نہ ملتا اور صرف خشک زاہد اور ظاہری عبادت کے دکھلانے پر مدار ہوتا اور اس طرح بدگمانیوں کا دروازہ بھی کھلا ہوتا۔ پس خدا، جو کریم و رحیم ہے، اسنے نہ چاہا کہ اسکے ایک مقبول مذہب یا ایک مقبول بندہ سے انکار کر کے دنیا ساری ہلاک ہو جائے۔ پس اسنے سچے مذہب پر دائمی نشانوں کی مہر لگا دی اور سچے راست باز کو اپنے خارق عادت کاموں کے ساتھ قبولیت کا نشان عطا فرمایا۔ (ماخوذ)

تورات وانجیل سے افضلیت قرآن کی وجہ

سوال ۔ اگر کوئی مخالفین اسلام میں سے یہ اعتراض کرے کہ قرآن شریف کو سب الہامی کتابوں سے افضل اور اعلیٰ قرار دینے میں یہ لازم آتا ہے کہ دوسری الہامی کتابیں ادنیٰ درجہ کی ہوں، حالانکہ وہ سب ایک خدا کا کلام ہے۔ اس میں ادنیٰ و اعلیٰ کیونکر تجویز ہوسکتا ہے؟

جواب ۔ بیشک باعتبار الہام کے سب کتابیں مساوی ہیں۔ مگر باعتبار زیادت بیان امور

مکملات دین کے بعض کو بعض پر فضیلت ہے۔ پس اسی جہت سے قرآن شریف کو سب کتابوں پر فضیلت حاصل ہے، کیونکہ جس قدر قرآن شریف میں امور تکمیل دین کے جیسے مسائل توحید اور ممانعت انواع واقسام شرک اور معالجات امراض روحانی اور دلائل ابطال مذاہب باطلہ اور براہین اثبات عقائد حقہ وغیرہ بکمال شدومد بیان فرمائے گئے ہیں، وہ دوسری کتابوں میں درج نہیں۔

قرآن شریف کا جامع کمالات ہونیکی وجہ

سوال ۔اگر یہ شبہ ہو کہ خدا تعالیٰ نے حقائق اور معارف دینی کو اپنی ساری کتابوں میں برابر کیوں درج نہ فرمایا اور قرآن شریف کو سب سے زیادہ جامع کمالات کیوں رکھا؟

جواب ۔واضح ہو کہ ایسا شبہ صرف اس شخص کے دل میں گزرے گا کہ جو وحی کی حقیقت کو نہیں مانتا اور اسباب پر اطلاع نہیں رکھتا کہ کن تحریکات سے اور کس طرح وحی نازل ہوتی ہے۔سو ایسے شخص پر واضح رہے کہ اصل حقیقت وحی کی یہ ہے کہ نزول وحی بغیر کسی موجب کے، جو مستدعی وحی ہو، ہرگز نہیں ہوتا بلکہ ضرورت کے پیش آ جانے کے بعد ہوتا ہے۔اور جیسی جیسی ضرورتیں پیش آتی ہیں بمطابق ان کے وحی بھی نازل ہوتی ہے۔کیونکہ وحی کے باب میں یہی عادت اللہ جاری ہے کہ جب تک باعث محرک وحی پیدا نہ ہولے، تب تک وحی نازل نہیں ہوتی۔اور خود ظاہر بھی ہے جو بغیر موجودگی کسی باعث کے، جو تحریک وحی کرتا ہو، یوں ہی بلا موجب وحی کا نازل ہو جانا ایک بے فائدہ کام ہے، جو خداوند تعالیٰ کی طرف، جو حکیم مطلق ہے اور ہر ایک کام برعایت حکمت اور مصلحت اور مقتضائے وقت کے کرتا ہے، منسوب نہیں ہو سکتا۔پس سمجھنا چاہئے کہ جو قرآن شریف میں تعلیم حقانی کامل اور مفصل طور پر بیان کی گئی اور دوسری کتابوں میں بیان نہ ہوئی یا جو جو امور تکمیل دین کے اس میں لکھے گئے اور دوسری کتابوں میں نہ لکھے گے،تو اس کا یہی باعث ہے کہ پہلی کتابوں کو وہ تمام وجوہ محرک وحی کے پیش نہ آئے اور قرآن شریف کو پیش آ گئے۔اور خود ظاہر ہو جانا ان تمام وجوہ محرکہ وحی کا کسی پہلے عہد میں قبل عہد قرآن شریف کے ایک امر محال تھا۔(ماخوذ)

سب انبیاء سے افضلیت حضرت محمدؐ رسول اللہ کی وجہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب انبیاء سے افضل ہونا اس وجہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کو تمام عالم کا مقابلہ کرنا پڑا۔اور جو کام حضرت ممدوح کے سپرد ہوا وہ حقیقت میں ہزار دو ہزار نبی کا کام تھا۔لیکن چونکہ خدا تعالیٰ کو منظور تھا کہ بنی آدم ایک ہی قوم اور ایک ہی قبیلے کی طرح ہو جائیں اور غیریت

اور بیگانگی جاتی رہے اور جیسے یہ سلسلہ وحدت سے شروع ہوا ہے وحدت پر ہی ختم ہو، اس لئے اس نے آخری ہدایت کو تمام دنیا کے لئے مشترک بھیجا اور اس وقت زمانہ بھی وہ آ پہنچا تھا کہ بباعث کھل جانے راستوں کے اور مطلع ہونے ایک قوم کے دوسری قوم سے اور ایک ملک سے دوسرے ملک سے اتحاد سلسلہ نوعی کی کاروائی شروع ہوگئی تھی اور بوجہ میل ملاپ دائمی کے خیالات بعض ملکوں کے بعض ملکوں میں اثر کرنے لگے تھے، چنانچہ یہ کاروائی اب تک ترقی پر ہے اور سارے سامان جیسے ریل، تار و جہاز وغیرہ ایسے ہی دن بدن نکلتے آتے ہیں کہ جن سے یقیناً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قادر مطلق کا یہی ارادہ ہے کہ کسی دن تمام دنیا کو ایک قوم کی طرح بنا دے۔ بہر حال پہلے نبیوں کی محدود کوشش تھی، کیونکہ ان کی رسالت بھی ایک قوم میں محدود ہوتی تھی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر محدود اور وسیع کوشش تھی، کیونکہ ان کی رسالت عام تھی۔ یہی وجہ ہے جو فرقان مجید میں دنیا کے تمام مذاہب باطلہ کا رد موجود ہے اور انجیل میں صرف یہودیوں کی بدچلنیوں کا ذکر ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرے نبیوں سے افضل ہونا ایسی غیر محدود کوشش سے ثابت ہے۔ ماسوا اسکے یہ بات اجلی بدیہات سے ہے کہ شرک اور مخلوق پرستی کو دور کرنا اور وحدانیت اور جلال الٰہی کو دلوں پر جمانا سب نیکیوں سے افضل اور اعلیٰ نیکی ہے۔ پس کیا کوئی اس سے انکار کرسکتا ہے کہ یہ نیکی جیسی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور میں آئی کسی اور نبی سے ظہور میں نہ آئی۔ آج دنیا میں بجز فرقان مجید کے اور کونسی کتاب ہے کہ جس نے کروڑ ہا مخلوق کو توحید پر قائم رکھا ہے اور ظاہر ہے کہ جس کے ہاتھ سے بڑی اصلاح ہوئی، وہی سب سے بزرگ، افضل اور وہی سب سے بڑا ہے۔ (ماخوذ)

خدا تعالیٰ کا غیر اللہ کی قسم کھانے کی وجہ

سوال ۔خدا تعالیٰ نے سورۃ والطارق وغیرہ میں غیر اللہ کی قسم کیوں کھائی، حالانکہ وہ آپ ہی فرماتا ہے کہ بجز اس کے کسی دوسرے کی قسم نہ کھائی جائے۔ نہ انسان کی، نہ زمین کی، نہ کسی اور کی اور نہ کسی ستارے، نہ کسی پہاڑ کی۔ خدا تعالیٰ کو کیا ضرورت آ پڑی، جو اپنی پیدا کردہ اشیاء کی قسم کھاتا ہے؟

جواب ۔قسم کے بارے میں خوب یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ جلشانہٗ کی قسموں کا انسانوں کی قسموں پر قیاس کر لینا قیاس مع الفارق ہے۔ خدا تعالیٰ نے، جو انسانوں کو غیر اللہ کی قسم کھانے سے منع کیا ہے، تو اس کا سبب یہ ہے کہ انسان جب قسم کھاتا ہے، تو اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کی قسم کھائی ہے، اس کو ایک ایسے گواہ کا قائم مقام ٹھہرائے کہ وہ اپنے ذاتی علم سے اس کے بیان کی تصدیق یا تکذیب کرسکتا ہے۔ کیونکہ اگر سوچ کر دیکھو، تو قسم کا اصل مفہوم شہادت ہی ہے۔ جب انسان معمولی شاہدوں کے پیش

کرنے سے عاجز آتا ہے، تو پھر قسم کا محتاج ہوتا ہے، تا اس سے وہ فائدہ اٹھائے، جو ایک شاہد رویت کی شہادت سے اٹھانا چاہئے۔ لیکن یہ تجویز کرنا یا اعتقاد رکھنا کہ بجز خدا تعالیٰ کے اور بھی کوئی حاضر و ناظر ہے اور تصدیق یا تکذیب یا سزا دہی یا کسی اور امر پر قادر ہے، صریح کلمہ کفر ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ کی تمام کتابوں میں انسان کے لئے یہی تعلیم ہے کہ غیر اللہ کی ہرگز قسم نہ کھائے۔ اب ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی قسموں کا انسان کی قسموں کے ساتھ قیاس درست نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کو انسان کی طرح کوئی ایسی مشکل پیش نہیں آتی کہ جو انسان کو قسم کے وقت پیش آتی ہے۔ بلکہ اس کا قسم کھانا ایک اور رنگ کا ہے، جو اس کی شان کے لائق اور اس کے قانون قدرت کے مطابق ہے۔ اور غرض اس سے یہ ہے کہ تا صحیفہ قدرت کے بدیہات کو شریعت کے اسرار دقیقہ کے حل کرنے کے لئے بطور شاہد کے پیش کرے۔ اور چونکہ اس مدعا کو قسم سے ایک مناسبت تھی اور وہ یہ کہ جیسا ایک قسم کھانیوالا جب مثلاً خدا تعالیٰ کی قسم کھاتا ہے، تو اسکی غرض یہ ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ میرے اس واقعہ پر گواہ ہے۔ اس طرح خدا تعالیٰ کے بعض کھلے کھلے افعال بعض چھپے ہوئے افعال پر گواہ ہیں۔ اس لئے اس نے قسم کے رنگ میں اپنے افعال بدیہی کو اپنے افعال نظریہ کے ثبوت میں جا بجا قرآن کریم میں پیش کیا اور اس کی نسبت یہ نہیں کہہ سکتے کہ غیر اللہ کی قسم کھائی۔ کیونکہ درحقیقت اپنے افعال کی قسم کھاتا ہے نہ کسی غیر کی۔ اور اس کے افعال اس کے غیر نہیں ہیں۔ مثلاً اس کا آسمان یا ستارہ کی قسم کھانا اس قصد سے نہیں ہے کہ وہ کسی غیر کی قسم ہے، بلکہ اس نیت سے ہے کہ جو کچھ اس کے ہاتھوں کی صنعت اور حکمت آسمان اور ستاروں میں موجود ہے، اس کی شہادت بعض اپنے افعال مخفیہ کے سمجھانے کے لئے پیش کرے۔ سو درحقیقت خدا تعالیٰ کی اس قسم کی قسمیں، جو قرآن شریف میں موجود ہیں، بہت سے اسرار معرفت سے بھری ہوئی ہیں۔ اور جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں قسم کی طرز پر ان اسرار کا بیان کرنا محض اس غرض سے ہے کہ قسم درحقیقت ایک قسم کی شہادت ہے، جو شاہد رویت کے قائم مقام ہو جاتی ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کے بعض افعال بھی بعض دوسرے افعال کے لئے بطور شاہد کے واقع ہوئے ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ قسم کے لباس میں اپنے قانون قدرت کے بدیہات کی شہادت اپنی شریعت کے بعض دقائق حل کرنے کے لئے پیش کرتا ہے، تا قانون قدرت، جو خدا تعالیٰ کی ایک فعلی کتاب ہے، اس کی قولی کتاب پر شاہد ہو جائے، اور تا اس کے قول اور فعل کے باہم مطابق ہو کر طالب صادق کے لئے مزید معرفت اور سکینت اور یقین کا موجب ہو اور یہ ایک عام طریق اللہ جل شانہٗ کا قرآن کریم میں ہے کہ اپنے افعال قدرتیہ کو، جو اس کی مخلوقات میں با قاعدہ منضبط اور مترتب پائے جاتے ہیں، اقوال شرعیہ کے حل کرنے کے لئے جا بجا پیش کرتا ہے، تا اس بات کی

طرف لوگوں کوتوجہ دلا دے کہ یہ شریعت اور یہ تعلیم اس کی ذات واحدہٗ لاشریک کی طرف سے ہے۔ جس کے ایسے افعال موجود ہیں، جو اس کے افعال سے مطابقت کلی رکھتے ہیں، کیونکہ اقوال کا افعال سے مطابق آ جانا اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ جس کے یہ افعال ہیں اسی کے یہ اقوال ہیں۔

اب ہم نمونہ کے طور پر ایک آیت کی تفسیر لکھتے ہیں، جو قرآن کریم میں وارد ہے اور جس میں خداتعالیٰ قسم کھاتا ہے۔ **والسماء والطارق و ما ادراک ما الطارق النجم الثاقب ان کل نفس لما علیھا حافظ** ۔اس آیت میں اصل مدعا اور مقصد یہ ہے کہ ہر ایک نفس کی روحانی حفاظت کے لئے ملائک مقرر ہیں، جو ہر دم اور ہر وقت ساتھ رہتے ہیں اور جو حفاظت کا طالب ہو، اس کی حفاظت کرتے ہیں۔لیکن یہ بیان ایک باریک اور نظری ہے۔فرشتوں کا وجود خود ہی غیر مرئی ہے۔ پھر ان کی حفاظت پر کیونکر یقین آئے۔اس لئے خداوند کریم نے اپنے قانون قدرت کو، جو اجرام سماوی میں پایا جاتا ہے، اس جگہ قسم کے پیرایہ میں بطور شاہد پیش کیا۔اور وہ یہ ہے کہ قانون قدرت خداتعالیٰ کا صاف اور صریح طور پر نظر آتا ہے کہ آسمان اور جو کچھ کواکب اور شمس اور قمر اور جو اس کے پول میں ہوا وغیرہ موجود ہے، یہ سب انسان کے لئے جسمانی خدمات میں لگتے ہوئے ہیں اور طرح طرح کے جسمانی نقصانوں اور حرجوں اور تکلیفوں اور تنگیوں سے بچاتے ہیں اور اس کے جسم اور جسمانی قویٰ کی کل مایحتاج کو تیار کرتے ہیں۔ خاص کر رات کے وقت جو ستارے پیدا ہوتے ہیں جنگلوں اور بیابانوں میں چلنے والے اور سمندروں کی سیر کرنے والے ان چمکدار ستاروں سے بڑا ہی فائدہ اٹھاتے ہیں اور اندھیری رات کے وقت میں ہر ایک کی نجم ثاقب راہنمائی کر کے جان کی حفاظت کرتا ہے۔اور اگر یہ محافظ نہ ہوں، جو اپنے اپنے وقت میں شرط حفاظت بجا لا رہے ہیں، تو انسان ایک طرفۃ العین کے لئے بھی زندہ نہ رہ سکے۔سوچ کر بیان دینا چاہئے کہ کیا ہم بغیر ان کے زندہ رہ سکتے ہیں؟ کوئی ہمارے لئے حرارت مطلوبہ تیار رکھتا ہے اور کوئی اناج اور پھل پکاتا ہے اور کوئی ہمارے پینے کے لئے پانیوں کو برساتا ہے اور کوئی ہمیں روشنی بخشتا ہے اور کوئی ہمارے تنفس کے سلسلہ کو قائم رکھتا ہے اور کوئی ہماری قوت شنوائی کو مدد دیتا ہے اور کوئی ہماری حرارت غریزی پر صحت کا اثر ڈالتا ہے تب ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔اب اس سے انسان سمجھ سکتا ہے کہ جس خداوند کریم و حکیم نے یہ ہزارہا اجرام سماوی و عناصر وغیرہ ہمارے اجسام کی درستی و قائمی کے لئے پیدا کئے اور دن رات بلکہ ہر دم اس کو خدمت میں لگا دیا ہے، کیا وہ ہماری روحانی حفاظت کے انتظام سے غافل رہ سکتا تھا اور کیونکر ہم اس کریم و رحیم کی نسبت ظن کر سکتے ہیں کہ ہمارے جسم کی حفاظت کے لئے تو اس نے اس قدر سامان پیدا کر دیا کہ ایک جہان ہمارے لئے خادم بنا دیا لیکن ہماری

روحانی حفاظت کے لئے کچھ بندوبست نہ فرمایا۔

اب اگر ہم انصاف سے سوچنے والے ہوں، تو اسی سے ایک محکم دلیل مل سکتی ہے کہ بیشک روحانی حفاظت کے لئے بھی حکیم مطلق نے کوئی ایسا انتظام مقرر کیا ہوگا کہ جو جسمانی انتظام سے مشابہ ہو گا۔ سو وہ ملائک کا حفاظت کے لئے مقرر کرنا ہے۔ سو اسی غرض سے خدا تعالیٰ نے یہ قسم آسمان اور ستاروں کی کھائی تا ملائک کی حفاظت کے مسئلہ کو، جو ایک مخفی اور نظری مسئلہ ہے، نجوم وغیرہ کی حفاظت کے انتظام سے، جو ایک بدیہی امر ہے، بخوبی کھول دے۔ اور ملائک کے وجود کے ماننے والے کے لئے غور کرنے والوں کے آگے اپنے ظاہر انتظام کو رکھ دے، جو جسمانی انتظام ہے۔ تا عقل سلیم جسمانی انتظام کو دیکھ کر اسی نمونہ پر روحانی انتظام کو بھی سمجھ لے۔

پیدائش عالم کی وجہ

زمین سے لے کر آسمان تک جس چیز پر سوائے انسان کے نظر پڑتی ہے، وہ انسان کے لئے کارآمد نظر آتی ہے، پر انسان ان میں سے کسی کے کام کا نظر نہیں آتا۔ دیکھئے زمین، پانی، ہوا، آگ، چاند، سورج، ستارے اگر نہ ہوں، تو ہم کو جینا محال یا دشوار ہو جائے۔ اور ہم نہ ہوں، تو اشیائے مذکورہ میں سے کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ علی ہذا القیاس، درخت، جانور وغیرہ مخلوقات اگر نہ ہوتے، تو ہمارا کچھ نہ کچھ حرج ضرور تھا، کیونکہ اور کچھ بھی نہیں تو یہ اشیاء کبھی نہ کبھی کسی مرض ہی کی دوا ہو جاتی ہیں، پر ہم کو دیکھئے کہ ہم ان کے حق میں کسی مرض کی دوا نہیں ہیں۔ مگر جب ہم مخلوقات میں سے کسی کے کام کے نہیں ہیں، تو بالضرور اپنے خالق کے کام کے ہوں گے، ورنہ ہماری پیدائش محض فضول اور بیہودہ ہو جائے، جس سے خالق پر بیہودہ کاری کا الزام عاید ہو اور ہم پر نکما ہونے کا عیب راجع ہو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ایسی ہیں کہ کوئی عاقل ان کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اور کیونکر تسلیم کرے بدلالت آثار و کاروبار انسانی، انسان کی افضلیت اور مخلوقات پر خصوصاً جمادات، نباتات، حیوانات وغیرہ اشیائے معلومہ محسوسہ پر ایسی طرح روشن ہے، جیسے خوبصورتوں کا بدصورتوں پر صورت میں افضل ہونا ظاہر و باہر ہے۔ پھر کیونکر ہو سکتا ہے کہ اور سب چیزیں تو کام کی ہوں، مگر انسان نکما ہو۔ اور اشیاء اگر انسان کے کام آتی ہیں، تو انسان بیشک خدا کے کام کا ہوگا۔ الغرض زمین سے آسمان تک جس چیز پر نظر پڑتی ہے انسان کے لئے کارآمد نظر آتی ہے، پر انسان ان چیزوں میں سے کسی کے کام کا نہ ہو۔ اعتبار نہ ہو، تو دیکھ لیجئے زمین اگر نہ ہوتی، تو کاہے پر تھمتے اور کاہے پر بیٹھتے اور کاہے پر سوتے، کاہے پر چلتے پھرتے، کاہے پر کھیتی کرتے، کاہے پر مکان بناتے، کاہے پر باغ لگاتے۔ غرض زمین نہ ہوتی، تو انسان کو جینا محال تھا۔ اور انسان نہ ہوتا، تو زمین کا

کچھ نقصان نہ تھا۔ پانی نہ ہوتا، تو کیا پیتے اور نہ پیتے تو کیونکر جیتے، کاہے سے آٹا گوندھتے اور کاہے سے سالن وغیرہ پکاتے، کاہے سے کپڑے وغیرہ دھوتے، کاہے سے نہاتے۔ غرض پانی نہ ہوتا، تو انسان کی زندگی محال تھی۔ اور انسان نہ ہوتا، تو پانی کا کیا نقصان تھا۔ ہوا نہ ہوتی، تو سانس کیونکر چلتا، کھیتی باڑی وغیرہ کا کام کیونکر نکلتا۔ یہ ٹھنڈی ہوائیں روح افزا کہاں سے آتیں۔ غرض ہوا نہ ہوتی، تو جان ہوا ہو جاتی۔ ہم نہ ہوتے تو ہوا کو کیا دقت پیش آتی۔ اسی طرح اوپر چلے چلو۔ سورج، چاند، ستارے اگر نہ ہوتے، تو دیکھنا بھالنا چلنا پھرنا ایک امر محال تھا۔ انسان نہ ہوتا، تو نہ سورج کا نقصان تھا، نہ چاندوسورج کو کوئی دشواری پیش آتی۔ آسمان اور اس کی گردشیں نہ ہوتیں، تو سائبانی کون کرتا۔ اور یہ گرمی کے موسم اور جاڑے کے ایام کیونکر آتے۔ اور انسان نہ ہوتا، تو آسمان کا نقصان نہ تھا، نہ گردشوں میں کوئی دقت تھی۔ الغرض انسان کو دیکھئے تو زمین آسمان میں سے کسی کے کام کا نہیں۔ پھر سوا اس کے جو چیز ہے، سب انسان کے کام کی ہے۔ اس صورت میں اگر انسان خدا کے کام کا بھی نہ ہو، تو یوں کہو کہ انسان سے زیادہ کوئی نکما ہی نہیں۔ مگر انسان کے اس حسن و جمال دانش وکمال اور افضلیت مسلمہ اور مشہورہ پر چار و نا چار یہی کہنا پڑیگا کہ انسان خالق جہاں کے کام کا ہے۔ کیونکہ آگ جلایا ہی کرتی ہے بجھاتی نہیں۔ اور پانی بجھایا کرتا ہے جلاتا نہیں۔ حکیم علی الاطلاق حکمت ہی کے کام کرتا ہے، کوئی بیہودہ کام نہیں کرتا۔ پھر کیونکہ ہوسکتا ہے کہ خدا نے انسان کو محض فضول بنایا ہو۔ جب یہ بات ٹھہری کہ پیدائش انسانی حکمت سے خالی نہیں، تو اس کے یہی معنے ہوں گے کہ اس کو کسی کام کے لئے بنایا ہے۔ سُوسِوا خدا کے اور تو یہ کسی کے کام کا نہیں ہوسکتا۔ ایسی خوبی اور اس اسلوبی پر ایسے بڑے کام کے لئے ہوگا۔ مگر ظاہر ہے کہ خداوند عالم کسی بات میں کسی کا محتاج نہیں۔ پھر انسان جیسے محتاج کا تو کیا محتاج ہوگا، جس کی سب سے زیادہ محتاجگی اسی سے ظاہر ہے کہ زمین سے لیکر آسمان تک تمام عالم کی اس کو ضرورت ہے۔ اس لئے یہی کہنا پڑیگا کہ اس کو بندگی اور عجز و نیاز کے لئے بنایا ہے۔ کیونکہ یہی ایک ایسی چیز ہے، جو خدا کے خزانہ میں نہیں۔ مگر چونکہ یہ عجز و نیاز خدا کے مقابلہ میں ایسا ہوگا، جیسا طبیب کے سامنے بیمار کی منت سماجت۔ تو جیسے بیمار کی منت سماجت کا ثمرہ ہوتا ہے کہ طبیب اس کے حال زار پر مہربان ہوکر چارہ گری اختیار کرتا ہے۔ ایسے ہی انسان کی بندگی یعنی عجز و نیاز کی بدولت خداوند عالم اس پر مہربان ہوکر چارہ گری کیونکر نہ کریگا۔ بہر حال تمام عالم انسان کے لئے ہے اور انسان عبادت الٰہی کے لئے ہے۔ چنانچہ ایسا ہی قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **و ما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون** ۔ اس لئے جیسے بایں وجہ گھوڑا سواری کے لئے اور گھاس و دانہ گھوڑے کے لئے ہے، تو گھاس و دانے کو بھی سواری ہی کے لئے سمجھتے

ہیں۔ایسے ہی بایں وجہ کہ انسان عبادت کے لئے ہے اور تمام دنیا انسان کے لئے ہے، تمام عالم کو بھی عبادت ہی کے لئے سمجھئے۔غرض مقصود اصلی پیدائش عالم سے عبادت ہے، جو سامان راحت روائی بنی آدم ہے اپنی حاجت روائی مقصود نہیں۔

حدوث عالم پر دلائل

(۱) یہ بات ظاہر ہے کہ عالم مرکب ہے اور ترکیب کے واسطے حدوث لازم ہے۔اس صورت میں قدم عالم (یعنی اس کا قدیم سے ہونا) بالبداہت باطل ہے۔

(۲) حرکت کے لئے ابتداء ضرور ہے، کیونکہ حدوث اور پیدائش کی بنا جب حرکت پر ٹھہری اور حدوث زمانہ اور پیدائش کے لئے ابتداء ضرور ہوئی، تو حرکت کے لئے ابتداء پہلے ہوگی۔ وہ پہلی حرکت، جس کو زمانہ کہئے، بیشک ماضی کی جانب متناہی اور محدود ہوگی۔اور کیوں نہ ہو، وجہ ضرورت ابتداء کی وہ حدوث تھا، جو سب میں پہلے حرکت میں ہوتا ہے۔اور حوادث باقیہ کا حدوث اسی کا ثمرہ ہے۔اگر ابتداء نہ مانی جائے، تو پھر حدوث کی کوئی صورت نہیں، کیونکہ حدوث کے لئے اول عدم ضرور ہے۔اس کے بعد وجود لاحق ہوتا ہے، کیونکہ زمانہ تو حرکت اولیٰ کا نام ہے جو سوا حرکت فی الوجود اور کسی حرکت کو نہیں کہہ سکتے، کیونکہ وجود سے پہلے کائنات کو کوئی حرکت میسر نہیں آسکتی اور وہی حرکت بایں وجہ کہ ہر کسی کی ذات کے اندر موجود ہے ہر کسی کو یکساں محسوس ہوتی ہے۔اور اسی کی کم بیشی کو دیر اور سویر کہہ سکتے ہیں اور اسی حرکت کو میزان اور مقیاس اور پیمانہ دیگر حرکات کا بنا رکھا ہے۔

حضرت محی الدین ابن عربی المعروف شیخ اکبر اپنی کتاب "فتوحات مکیہ" کے باب ۳۹۰ میں پیدائش عالم کے متعلق ایک مضمون لکھتے ہیں، جس کا خلاصہ ترجمہ اردو ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

"ایک بار میں نے نیم خوابی کی حالت میں دیکھا کہ میں کچھ لوگوں کے ساتھ، جنہیں میں نہیں پہچانتا، خانہ کعبہ کا طواف کر رہا ہوں۔ان میں سے ایک نے دو بیت پڑھے۔ایک تو مجھے بھول گیا ہے اور جو یاد رہا، وہ یہ ہے۔

لقد طفنا کما طفتم سنیناً　　بھذا البیت طراً اجمعیناً

ترجمہ۔سالہائے دراز ہم سب اس گھر کا طواف کرتے رہے، جیسا کہ تم طواف کرتے ہو۔

ایک نے مجھے ایک ایسے نام سے پکارا، جس کو میں نہیں پہچانتا۔ پھر اس نے مجھے کہا کہ میں تمہارے اجداد قدیم میں سے ہوں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کو مرے ہوئے کتنی مدت ہوئی ہے۔اس نے کہا چالیس ہزار دوسواسی برس۔ میں نے کہا حضرت آدم علیہ السلام کو اتنی مدت نہیں ہوئی۔اس نے

کہا۔تم کس آدم کی بات کرتے ہو۔ یہ آدم جوتم سے قریب گزرے ہیں یا دوسرے آدم کی۔اس پر مجھے وہ حدیث یاد آئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے۔**ان اللہ خلق مائة الف آدم** ۔ترجمہ۔ یعنی خدا تعالیٰ نے ایک لاکھ آدم پیدا کئے ہیں۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ یہ شخص انہیں اجداد میں سے ہوگا۔اس بارے میں تاریخ کا بالکل پتہ نہیں چلتا، باوجودیکہ عالم کے حادث (Recent) ہونے میں ہمارے نزدیک کوئی شک نہیں ہے۔

باب ۳۶۷ میں لکھتے ہیں کہ میں ایک بار خواب میں حضرت ادریسؑ سے ملا۔اور میں نے کہا کہ ایک شخص کو میں نے طواف کعبہ میں اس طرح پر دیکھا اور اسکے بعد سارا قصہ سنایا۔حضرت ادریسؑ نے فرمایا کہ اس شخص نے سچ کہا۔ میں پیغمبر ہوں اور میں یہ نہیں جانتا کہ عالم کی ابتداء کب ہوئی۔مخلوقات کی اجل مدتوں کے ختم ہونے پر انتہائے خلق کیلئے ہے۔اور خلق کا تجدد انفاس کیساتھ ہوتا رہتا ہے۔اللہ تعالیٰ یونہی خالق چلا آتا ہے اور یونہی دنیا وآخرت رہے گی۔ میں نے کہا، اے پیغمبر خدا مجھ کو قیامت کی کوئی علامت بتائیے۔فرمایا تم میں سے جو حضرت آدمؑ گزرے ہیں، انہیں کا پیدا ہونا علامت قیامت ہے۔ میں نے کہا۔دنیا سے پہلے بھی کوئی مکان تھا۔فرمایا۔مکان کا وجود ایک ہے اور دنیا تم سے دنیا ہوتی ہے۔

ہر نفس نومی شود دنیا و ماء — بیخبر از نو شدن اندر بقاء

عمر ہمچوں جوئے نو نو مے رسد — مستمرے می نمائد در جسد

آں ز تیزی مستمر شکل آمد است — چوں شرر کش تیز جنبانی بدست

شاخ آتش را بجنبانی دراز — در نظر آتش نمائد بس دراز

ایں درازی آمد از تیزی صنع — می نماید سرعت انگیزی صنع

اسی کتاب کے ساتویں باب میں کہتے ہیں کہ خدا کو جمادات ونباتات وحیوانات میں جو پیدا کرنا تھا عالم طبعی پیدا کرنے کے ۷۱ ہزار ختم ہونے پر ان سب کی آفرینش کی تکمیل کی۔اس کے بعد لکھتے ہیں کہ جب عالم طبعی پیدا ہو چکا اور اس کو ۵۴ ہزار برس کا زمانہ گزرا، تب خدا تعالیٰ نے اس دنیا کو پیدا کیا اور ۶۳ ہزار برس گزرنے کے بعد آخرت کو پیدا کیا، جس سے مراد جنت و دوزخ ہے۔ دنیا وآخرت کی پیدائش کے درمیان ۹ ہزار برس کا فصل ہے۔اس وجہ سے آخرت کو آخرت کہتے ہیں، کیونکہ دنیا کی اتنی مدت کے بعد وہ آخرت میں پیدا ہوئی۔اسی طرح دنیا کو اولیٰ کہتے ہیں، کیونکہ وہ اول پیدا ہوئی۔اللہ تعالیٰ نے آخرت کی بقا ختم ہونے کے لئے کوئی مدت نہیں بتائی ہے۔اس کو بقائے جاوید حاصل ہے۔ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس وقت پیدا کیا، جب دنیا کے ۱۷ ہزار برس اور آخرت کی، جس کے

دوام کی انتہا نہیں، ۸ ہزار برس عمر گذر چکی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہم کو معلوم نہیں ہے کہ کوئی شخص پیدائش کی حد دریافت کر سکا ہو۔ خدا تعالیٰ ہمیشہ سے خالق تھا اور دنیا و آخرت بھی یونہی رہیں گے۔ تمہارے ان آخری آدمؑ کا پیدا ہونا ہی قیامت کی علامت ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک عمارت (اہرام مصر) کے کتبہ سے ہمیں معلوم ہوا کہ وہ تیس لاکھ برس قبل بنائی گئی تھی۔ ماہرین طبقات الارض کی تحقیقات کے بموجب زمین تیس کروڑ سال سے بنی ہوئی ہے۔

چونکہ خدا تعالیٰ قدیم سے خالق ہے، اس لئے ہم مانتے ہیں اور ایمان لاتے ہیں کہ دنیا اپنی نوع کے اعتبار سے قدیم ہے۔ لیکن اپنے شخص کے اعتبار سے قدیم نہیں۔ قرآن شریف نے ہمیں سکھایا ہے کہ خدا ہمیشہ سے خالق ہے۔ اگر چاہے تو کروڑوں مرتبہ زمین و آسمان کو فنا کر کے پھر ایسے بنا دے۔

پھر یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ دائمی طور پر تعطل صفات الٰہیہ کبھی نہیں ہوتا۔ اور بجز خدا کے کسی چیز کے لئے قدرت شخصی تو نہیں مگر قدرت نوعی ضروری ہے۔ اور خدا کی کسی صفت کے لئے تعطل دائمی نہیں، مگر تعطل میعادی کو ہونا ضروری ہے۔ اور چونکہ صفت ایجاد اور صفت فنا باہم متضاد ہیں، اس لئے جب فنا کی صفت کا ایک کامل دور آجاتا ہے، تو صفت ایجاد ایک میعاد تک معطل رہتی ہے۔

غرض ابتداء میں خدا کی صفت وحدت کا دور تھا اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس دور نے کتنی دفعہ ظہور کیا، بلکہ یہ دور قدیم اور غیر متناہی ہے۔ بہر حال صفت وحدت کے دور کو دوسری صفات پر تقدم زمانی ہے۔ پس اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں خدا اکیلا تھا اور اس کے ساتھ کوئی نہ تھا اور پھر خدا نے زمین و آسمان کو اور جو کچھ اس میں ہے پیدا کیا اور تعلق کی وجہ سے اس نے اپنے اسماء ظاہر کئے کہ وہ کریم اور رحیم ہے اور غفور اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔

الغرض قدیم سے سلسلہ مخلوق کا خدا تعالیٰ کے ساتھ چلا آیا ہے۔ مگر کسی چیز کو اس کے مقابل پر قدامت شخصی نہیں، ہاں قدامت نوعی ہے اور وہ بھی خدا کی صفت خلق کے لئے ایک لازمی امر نہیں، کیونکہ جیسا کہ خلق یعنی پیدا کرنا اس کی صفات میں سے ہے، ایسا ہی کبھی اور کسی زمانہ میں تجلی وحدت اور تجرد اس کی صفات میں سے ہے۔ اور کسی صفت کیلئے تعطل دائمی جائز نہیں، ہاں تعطل میعادی جائز ہے۔

ہر دور دنیا سات ہزار سال مقرر ہونے کی حکمت

خدا تعالیٰ نے انسانوں کے لئے سات دن مقرر کئے اور ان دنوں کے مقابل پر خدا تعالیٰ کا ہر دن ہزار سال کا ہے، چنانچہ وہ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ **ان یوماً عند ربّک کالف سنة مما تعدون** ۔ یعنی خدا کا ایک دن ایسا ہے، جیسے تم ہزار برس کا شمار کرتے ہو۔ اس کی رو سے استنباط کیا گیا

ہے کہ موجودہ نسلوں کے مورث اعلیٰ یعنی آدم سے لے کر دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے۔

چونکہ دن سات ہیں، اسلئے اس آیت میں دنیا کی عمر سات ہزار سال قرار دی گئی ہے۔ لیکن یہ عمر اس آدم کے زمانہ سے ہے، جس کی ہم اولاد ہیں۔ خدا تعالیٰ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی دنیا تھی، مگر ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کون لوگ تھے اور کس قسم کے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سات ہزار سال میں دنیا کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ دنیا پر اس طرح کے کتنے دور آئے اور کتنے آدم اپنے اپنے وقت میں آ چکے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ہمیں قرآن کریم میں خبر دی ہے کہ وہ آدم، جو پہلی امتوں میں آیا، وہ تم سب کا باپ تھا۔ اس کے دنیا میں آنے کے وقت سے یہ سلسلہ انسانی شروع ہوا ہے اور اس سلسلہ کی عمر کا پورا دور سات ہزار برس تک ہے۔ یہ سات ہزار خدا تعالیٰ کے نزدیک ایسے ہیں، جیسے انسانوں کے سات دن۔ قانون الٰہی نے مقرر کیا ہے کہ ہر ایک امت کے لئے سات ہزار برس کا دور ہوتا ہے۔ اس دور کی طرف اشارہ کرنے کے لئے انسانوں میں سات دن مقرر کئے گئے ہیں۔ غرض بنی آدم کی عمر کا دور سات ہزار مقرر ہے اور ہمارے جد امجد ابوالبشر آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ سے چھ ہزار برس گزر چکے ہیں۔

قیام قیامت کی خفیہ گھڑی کا راز

یہ جو کہا گیا کہ قیامت کی گھڑی کا کسی کو علم نہیں، اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی وجہ سے بھی علم نہیں۔ اگر یہی بات ہے، تو پھر آثار قیامت جو قرآن شریف اور حدیث صحیحہ میں بیان ہوئے ہیں، وہ بھی قابل قبول نہیں ہوں گے۔ کیونکہ ان کے ذریعہ سے بھی قرب قیامت کا ایک علم حاصل ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ آخری زمانہ میں نہریں بکثرت جاری ہوں گی۔ اور ایسا ہی اور امور کے ذکر ہے، جو قرب قیامت پر دلالت کرتے ہیں۔ پس مطلب یہ ہے کہ اس خاص گھڑی کی کسی کو خبر نہیں۔ خدا قادر ہے کہ ہزار سال گزرنے کے بعد چند صدیاں اور بھی زیادہ کر دے، کیونکہ کسر شمار میں نہیں آتی۔

خدا تعالیٰ نے زمینوں و آسمانوں کو سات میں کیوں محدود کیا

درحقیقت آسمانوں کو سات میں محدود کرنے میں تاثیرات مختلفہ کی طرف اشارہ ہے، جو مختلف طبقات سماوی سے مختلف ستارے اپنے اندر جذب کرتے ہیں اور پھر زمین پر ان تاثیرات کو ڈالتے ہیں۔ چنانچہ اسی کی تصریح اس آیت میں موجود ہے۔ **اللہ الذی خلق سبع سمٰوات و من الارض**

مثلھن یتنزل الامر بینھن لتعلموا ان اللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر و ان اللہ قد احاط بکل شیء علمًا ۔ترجمہ۔یعنی خدانے آسمانوں کوسات پیدا کیا اور ایسا ہی زمینیں بھی سات ہی پیدا کیں اور ان سات آسمانوں کا اثر، جو بامرالٰہی ان میں پیدا ہوتا ہے، سات زمینوں میں ڈالا، تاکہ تم لوگ معلوم کر لو کہ خدا تعالیٰ ہر ایک چیز کے بنانے پر اور ہر ایک انتظام کے کرنے پر اور رنگا رنگ کے پیرائیوں میں اپنے کام دکھانے پر قدرت تامہ رکھتا ہے اور تا تمہارے علم وسیع ہو جائیں اور علوم وفنون میں تم ترقی کرو اور ہیئت اور طبعی اور طبابت اور جغرافیہ وغیرہ علوم تم میں پیدا ہو کر خدا تعالیٰ کی عظمتوں کی طرف تم کو متوجہ کریں اور تم سمجھ لو کہ کیسے خدا تعالیٰ کا علم اور اس کی قدرت کاملہ ہر ایک شئی پر محیط ہو رہی ہے۔اور کیسی ترکیب ابلغ اور محکم کے ساتھ آسمان اور جو کچھ اس میں ہے اپنا رشتہ زمین سے رکھتا ہے اور کیسے خدا تعالیٰ نے زمین کو قوت قابلہ عطا کر رکھی ہے اور آسمانوں اور ان کے اجرام کو قوت مؤثرہ مرحمت فرمائی ہے۔یاد رہے کہ جس طرح تنزل امر جسمانی اور روحانی دونوں طور پر آسمانوں سے ہوتا ہے اور ملائک کی توجہات اجرام سماوی کی تاثیرات کے ساتھ مخلوط ہو کر زمین پر گرتے ہیں، ایسا ہی زمین اور زمین والوں میں بھی جسمانی اور روحانی دونوں قوتیں قابلیت کی عطا کی گئی ہیں تا قوابل اور مؤثرات میں بکلی مساوات ہو۔

اور سات زمینوں سے مراد زمین کی آبادی کے سات طبقے ہیں، جو نسبتی طور پر بعض بعض کے تحت واقع ہیں اور کچھ بیجا نہ ہوگا اگر ہم دوسرے لفظوں میں ان طبقات سبعہ کو ہفت اقلیم کے نام سے موسوم کر دیں۔لیکن ناظرین اس دھوکہ میں نہ پڑیں کہ جو کچھ ہفت اقلیم کی تقسیم اُن یونانی علوم کے رو سے ہو چکی ہے، جس کو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں حکمائے اسلام نے یونانی کتب سے لیا تھا، وہ بکلی صحیح اور کامل ہے، کیونکہ اس جگہ تقسیم سے مراد ہماری ایک صحیح تقسیم مراد ہے، جس سے کوئی معمورہ باہر نہ رہے اور زمین کی ہر ایک جز و کسی حصہ میں داخل ہو جائے۔ہمیں اس سے کچھ غرض نہیں کہ اب تک یہ صحیح اور کامل تقسیم معرض ظہور میں آئی بھی ہے یا نہیں، بلکہ صرف یہ غرض ہے کہ جو خیال اکثر انسانوں کا اس طرف رجوع کر گیا ہے کہ زمین کو سات حصہ میں تقسیم کیا جائے، یہ خیال بھی گویا ایک الہامی تحریک تھی، جو الٰہی تقسیم کے لئے بطور شاہد ہے۔(ماخوذ)

خدا تعالیٰ کا زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنے کی حکمت

سوال۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ **ان ربکم الذی خلق السمٰوٰت و الارض فی ستۃ ایام ثم استویٰ علی العرش** ۔یعنی خدانے، جو تمہارا رب ہے، زمین اور آسمان کو چھ دن میں بنایا اور پھر عرش پر ٹھہرا۔یہ چھ دن کی تخصیص کیوں ہے؟

جواب ۔قرآن کریم سے معلوم ہوا ہے کہ خدا کے دن انسانوں کے دنوں کے برابر نہیں۔ایک جگہ پر قرآن شریف میں لکھا ہے کہ خدا کا دن ایسا ہے، جیسا کہ تمہارے ہزار برس۔اور ایک جگہ پر خدا کا دن پچاس ہزار برس لکھا ہے۔

اس جگہ اس آیت میں دن یا یوم کے معنی بارہ گھنٹے کے نہیں ہیں۔یوم عربی میں مطلق وقت کو کہتے ہیں۔اس ستة ایام کے یہ معنی ہوں گے، چھ وقت۔اب وقت کو تم چاہو، تو ایک آن **کلمح البصر** لو اور چاہو، تو وہ ایک ایک یوم لاکھوں کروڑوں برس کا ہو۔

یوم عربی زبان میں اس وقت اور زمانہ کو بھی کہتے ہیں، جس میں کوئی واقعہ گزرا ہو، خواہ وہ واقعہ کتنے بڑے وقت میں گزرا ہو۔دیکھو یوم بعاث، یوم حنین، یوم بکر، یوم بسوس، یوم عار وغیرہ۔اس زمین و آسمان وغیرہ کی پیدائش کے زمانہ کو اس محاورہ میں یوم کہا گیا ہے۔

زمین اور آسمان کی درمیانی چیزیں تین ہیں اور ان کی بناوٹ دو طرح پر ہے۔اول۔ان اشیاء کی بناوٹ۔دوم۔ان کی ترتیب۔پس یہ چھ چیزیں ہوئیں، جو چھ یوم میں پیدا ہوئیں۔

علم طبقات الارض سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ زمین کسی زمانہ میں آتشیں گیس تھی۔بلکہ یوں کہئے کہ ایک روشن ستارہ تھی۔جب قدرتی اسباب سے اللہ تعالیٰ نے اس میں کسی قدر کثافت پیدا کر دی، تو یہ زمین ایک سیال مادہ بن گئی، جس کو عربی میں **الماء** کہتے ہیں۔اور اس پر ہوا چلا کرتی تھی، جیسا کہ توریت شریف کی کتاب پیدائش کی پہلی آیتوں میں لکھا ہے۔پھر جب وہ **الماء** زیادہ کثیف ہو گیا، تو اس پر وہ حالت آ گئی، جس کے باعث اس پر زمین کا لفظ بولا گیا۔پس ایک دن اس پر وہ تھا کہ زمین سیال ہو گئی اور دوسرا دن وہ آیا کہ کثیف ہو گئی۔

طبقات الارض سے یہ امر بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ جس قدر زمین کے نیچے مرکز کی طرف کھودا جائے، زمین کی گرمی بہ نسبت بالائی سطح کے نیچے کو بڑھتی جاتی ہے۔حتیٰ کہ اب بھی چھتیس میل کی دوری پر ایسا گرم مادہ موجود ہے، جس کی گرمی تصور سے باہر ہے۔اس زمانہ سے بہت عرصہ پہلے جب اس کا بالائی حصہ کثیف ہونا شروع ہی تھا، ایک دن اس ہمارے آرامگاہ پر وہ بھی گزرا تھا کہ اس زمین کی بالائی نہایت پتلی سطح کو توڑ توڑ کر بڑے راکس اور بڑے بڑے حجری قطعات باہر نکلتے تھے اور پہاڑوں کا سلسلہ پیدا ہوتا جاتا تھا۔اور ظاہر ہے کہ اس وقت بڑے بڑے زلزلے اور بھونچال ہوتے تھے۔جب بڑے بڑے پہاڑ پیدا ہو گئے اور زمین کا بالائی حصہ زیادہ موٹا ہو گیا، پھر تیسرا اور چوتھا دن یا تیسرا اور چوتھا وقت اس کرہ ارضی پر وہ آیا کہ نباتات، جمادات، پھل پھول وغیرہ اشیاء انسانی آرام اور آسائش کے

سامان مہیا ہوئے۔ایک دن ان اشیاء کی پیدائش کا اور دوسرا دن ان اشیاء کی ترتیب کا۔غرض دو دن پہلے اور دو دن یہ کل چار دن زمین کی درستی کے ہوئے۔اسی طرح زمین کی بالائی فضا اور زمین کی سقف اور زمین کی بنا۔آسمان کو اللہ تعالیٰ نے دو روز میں بنایا اور ان میں امر الٰہی کی وحی ہوئی اور وہ وقت آ گیا کہ انسان زمین پر آباد ہوں۔کیونکہ قرآن کریم نے فرمایا ہے۔ سـوا لـلسـائـلیـن ۔یعنی انسان کی تمام ضرورتیں اور اس کے لئے جو مایحتاج تھا پورا ہو گیا۔یہ چھ دن ہوئے۔

اور وجہ اس امر کی کہ تکوین زمین و آسمان میں چھ یوم کی تخصیص کیوں ہے؟ سو واضح ہو کہ یہ چھ دن کا ذکر درحقیقت مراتب تکوین کی طرف اشارہ ہے،یعنی ہر ایک چیز جو بطور خلق صادر ہوئی ہے اور جسم اور جسمانی ہے،خواہ وہ مجموعہ عالم ہے اور خواہ ایک فرد از اراد عالم اور خواہ وہ عالم کبیر ہے، جو زمین و آسمان و مافیھا سے مراد ہے،اور خواہ وہ عالم صغیر، جو انسان سے مراد ہے،وہ بحکمت وقدرت باری تعالیٰ پیدائش کے چھ مرتبے طے کر کے اپنے کمال خلقت کو پہنچتی ہے۔اور یہ عالم قانون قدرت ہے کہ ابتدائی زمانہ سے خاص نہیں۔چنانچہ اللہ جل شانہٗ ہر ایک انسان کی پیدائش کی نسبت بھی انہیں مراتب ستہ کا ذکر فرماتا ہے،جیسا کہ قرآن کریم کے اٹھارہویں سپارے سورہ مومنون میں یہ آیت ہے۔ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قرارٍ مَكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلقنَا الْعَلَقَةَ مضغةً فَخَلَقْنَا الْمَضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَانَاهُ خلقًا آخر فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْن ۔یعنی پہلے تو ہم نے انسان کو اس مٹی سے پیدا کیا، جو زمین کے تمام انواع اور قسام کا لب لباب تھا اور اس کی تمام قوتیں اپنے اندر رکھتا تھا،تا وہ باعتبار جسم بھی عالم صغیر ٹھہرے اور زمین کی تمام چیزوں کی اس میں قوت اور خاصیت ہو،جیسا کہ وہ برطبق آیت وَ اِذَا سَوَّيْتُهُ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُوْحِي باعتبار روح عالم صغیر ہے اور بلحاظ شیون وصفات کاملہ وظلیت تام روح الٰہی کا مظہر تام ہے۔پھر بعد اس کے انسان کو ہم نے دوسرے طور پر پیدا کرنے کے لئے یہ طریق جاری کیا، جو انسان کے اند نطفہ پیدا کیا اور اس نطفہ کو ہم نے ایک مضبوط تھیلی میں، جو ساتھ ہی رحم میں بنتی جاتی ہے،جگہ دی قَرَارٍ مَكِيْنٍ کا لفظ اس لئے اختیار کیا گیا تا رحم او تھیلی دونوں پر اطلاق پا سکے۔اور پھر ہم نے نطفہ سے علقہ بنایا اور علقہ سے مضغہ اور مضغہ کے بعض حصوں میں ہم نے ہڈیاں اور ہڈیوں سے پوست پیدا کیا۔پھر اس کو ایک اور پیدائش دی یعنی روح اس میں ڈال دی۔پس کیا ہی مبارک ہے وہ خدا، جو اپنی صنعت کاری میں تمام صناعوں سے بلحاظ حسن صنعت وکمال عجائبات خلقت بڑھا ہوا ہے۔

اب دیکھو کہ خدا تعالیٰ نے اس جگہ بھی اپنا قانون قدرت یہی بیان فرمایا کہ انسان چھ طور کی

خلقت کے مدارج طے کر کے اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔اور یہ تو ظاہر ہے کہ عالم صغیر اور عالم کبیر میں نہایت شدید مشابہت ہے۔اور قرآن کریم سے انسان کا عالم صغیر ہونا ثابت ہے اور آیت اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْم اسکی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ تقویم عالم کئی متفرق خوبیوں اور حسنوں کا ایک ایک حصہ انسان کو دے کر بوجہ جامعیت جمیع شمائل وشیون عالم اسکو احسن ٹھہرا گیا ہے۔پس اب بوجہ تشابہ عالمین اور نیز بوجہ ضرورت تناسب افعال صانع واحد ماننا پڑتا ہے کہ جو عالم صغیر میں مراتب تکوین موجود ہیں، وہی مراتب تکوین عالم کبیر میں بھی ملحوظ ہوں۔اور ہم صریح اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ یہ عالم صغیر جو انسان کے اسم سے موسوم ہے، اپنی پیدائش میں چھ طریق رکھتا ہے۔اور کچھ شک نہیں کہ یہ عالم عالم کبیر کے کوائف مخفیہ کی شناخت کیلئے ایک آئینہ کا حکم رکھتا ہے۔پس جبکہ اسکی پیدائش کے چھ مرتبے ثابت ہوئے ،تو قطعی طور پر یہ حکم دے سکتے ہیں کہ عالم کبیر کے بھی مراتب تکوین چھ ہی ہیں، جو بلحاظ مؤثرات ستہّ یعنی تجلیات ستہّ ، جنکے آثار باقیہ نجوم ستہّ میں محفوظ رہ گئے ہیں ،معقولی طور پر متحقق ہو سکتے ہیں۔چونکہ عالم صغیر میں، جو انسان ہے،سنت اللہ یہی ثابت ہوئی ہے کہ اس کے وجود کی تکمیل چھ مرتبوں کے طے کرنے کے بعد ہوتی ہے،تو اس قانون قدرت کی رہبری سے ہمیں معقولی طور پر یہ راہ ملتی ہے کہ دنیا کی ابتداء میں جو اللہ جل جلالہٗ نے عالم کبیر کو پیدا کیا،تو اسکی طرز پیدائش میں بھی یہی مراتب ستہ ملحوظ رکھے ہوں گے۔اور ہر یک مرتبہ کو تفریق اور تقسیم کی غرض سے ایک دن یا ایک وقت سے مخصوص کیا جیسا کہ انسان کی پیدائش کے مراتب ستہ چھ وقتوں سے خاص ہیں۔جب کہ عالم کبیر وصغیر چھ مراتب طے کرنے کے بعد کمال کو پہنچے،تو اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز اس کے درمیان کے چھ مراتب تدریجی طے کرنے کے بعد اپنے کمال کو پہنچتی ہے۔

خدا نے زمین وآسمان کو فی الفور کیوں نہ بنایا

سوال ۔قرآن کریم میں جو خدا تعالیٰ نے کئی بار فرمایا ہے کہ ہم نے چھ دن میں زمین وآسمان کو پیدا کیا،تو یہ امر ضعف پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ معاً اس کے ارادہ کے ساتھ ہی سب کو ہو جانا لازم ہے، جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔**انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول له کن فیکون** ۔یعنی جب خدا تعالیٰ ایک چیز کے ہونے کا ارادہ فرماتا ہے،تو اس کا امر ایسی قوت اور قدرت اپنے اندر رکھتا ہے کہ وہ اس چیز کو، جو اس کے علم میں ایک عملی وجود رکھتی ہے، فقط یہ کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

جواب ۔اسکا جواب یہ ہے کہ قدرت اور طاقت کا مفہوم اس بات کو مستلزم نہیں کہ وہ چیز خواہ نخواہ بلا توقف ہو جائے۔اور نہ ارادہ کے مفہوم میں ضروری طور پر یہ بات داخل ہے کہ جس چیز کا ارادہ کیا

جائے، وہ اسی وقت ہو جائے۔ بلکہ اسی حالت میں ایک قدرت اور ایک ارادہ کو کامل قدرت اور کامل ارادہ کہا جائیگا جبکہ وہ فاعل کے اصل منشاء کے موافق جلد یا دیر کے ساتھ، جیسا کہ منشاء ہو، ظہور میں آئے۔ مثلاً چلنے کی کامل قدرت وہ شخص نہیں رکھتا، جو جلد جلد تو چل سکتا ہے، مگر آہستہ چلنے سے عاجز ہے۔ کامل القدرت اس شخص کو کہیں گے کہ جو جلد اور آہستہ چلنے پر قدرت رکھتا ہو۔ یا مثلاً ایک شخص اپنے ہاتھ کو لمبا کر سکتا ہے، مگر اسکو باندھ نہیں سکتا۔ یا کھڑا رہتا ہے، مگر بیٹھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ ان سب صورتوں میں ہم اسکو ان افعال پر کامل قدرت رکھنے والا نہیں بلکہ بیمار اور لاچار کہیں گے۔ اگر صرف ایک شق پر قدرت حاصل ہو، مگر دوسری شق پر نہیں، تو یہ قدرت نہیں، بلکہ عجز اور ناتوانائی ہے۔ خدا تعالیٰ کے قانون قدرت میں قضا و قدر کا جلد نازل کرنا بھی ہے اور دیر سے بھی۔ ہاں یہ بھی ثابت ہے کہ صفات قہریہ اکثر جلدی ظہور پذیر ہوتے ہیں اور صفات لطیفہ دیر اور توقف کے ساتھ۔ مثلاً انسان نو مہینے پیٹ میں رہ کر اپنے کمال وجود کو پہنچتا ہے اور مرنے کیلئے کچھ بھی دیر نہیں لگتی۔ انسان اپنے مرنے کے وقت صرف ہیضہ کے ایک دست یا تھوڑی سی قے سے راہی ملک بقا ہو جاتا ہے۔ اور وہ بدن جسکی سال ہائے دراز میں ظاہری اور باطنی تکمیل ہوئی تھی، وہ ایک دم میں اسکو چھوڑ کر رخصت ہو جاتا ہے۔

کُنْ کا مطلب ہے کہ "ہو جا" یا "ہو پڑے" یعنی جیسے اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کا ہونا چاہا، اسی طرح پر وہ چیز ہو گئی۔ جس چیز کا وجود تدریجاً اور آہستگی سے چاہا، وہ چیز بتدریج اور آہستگی سے پیدا ہوئی اور جس چیز کا وجود دفعۃً چاہا، تو وہ دفعۃً پیدا ہو گئی۔ مثلاً چنے کا پودا چالیس روز میں پک کر تیار ہوتا ہے۔ اس لئے چنے کے لئے کن کہنے والے کا یہی منشاء تھا۔ جوان آدمی پچیس برس میں جوان بنتا ہے اور بڑ کا درخت ایک صدی میں کمال کو پہنچتا ہے۔ ان کے لئے کن کہنے والے کا یہی منشاء تھا کہ اتنی مدت میں بنے۔ غرض ہر چیز کے تیار ہونے میں اللہ تعالیٰ نے جدا جدا اوقات مقرر کر رکھے ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **و لقد خلقنا السمٰوٰت و الارض فی ستة ایام**۔ اور ایک جگہ فرماتا ہے۔ **افعیینا بالخلق الاول بل هم فی لبس من جدید** ۔ یعنی بیشک ہم نے آسمانوں اور زمینوں کو اور جو کچھ اس کے درمیان ہے چھ دن میں بنایا اور کسی قسم کی تکلیف نے ہمیں نہیں چھوا۔ کیا ہم پہلی پیدائش سے تھک گئے ہیں۔ نہیں یہ لوگ نئی پیدائش سے شبہ میں ہیں۔ تورات میں لکھا ہے کہ خدا نے چھ دن میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔ سو یہ لفظ آرام بطور استعارہ کے استعمال ہوا ہے۔ اس دھوکہ کو دور کرنے کے لئے اس موقعہ پر قرآن شریف نے ایک اور لفظ اختیار کیا ہے اور وہ یہ ہے۔ **و ما مسنا من لغوب** یعنی ہم نے چھ دن میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور ہم اس سے نہیں تھکے۔ یہ لفظ گویا اس بات

کا رد ہے کہ خدا نے ساتویں دن آرام کیا۔ کیونکہ اگر ظاہری معنے لئے جائیں، تو اس سے خدا کا تھکنا ہی پایا جاتا ہے۔ آرام وہی کرتا ہے، جو تھکتا ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ تھکنے سے پاک ہے۔ کوئی نقص اس کی طرف منسوب نہیں ہوسکتا۔

زمین کا آسمان کے درمیان معلق ہونے کی حکمت

تجاذب اجسام، یعنی تمام اجسام ایک دوسرے کو اپنی جانب کھینچ رہے ہیں اور اسی کشش کے مقابلہ باہمی سے تمام سیارات اور اجسام اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ اس مسئلہ کی نسبت یورپ بلکہ تمام دنیا کا خیال ہے کہ یہ مسئلہ نیوٹن کی ایجاد ہے۔ لیکن لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ سینکڑوں برس پہلے یہ خیال مولانا روم نے ظاہر کیا تھا۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

جملہ اجزائے جہاں زاں حکم پیش — جفت جفت و عاشقان جفت خویش
ہست ہر جزوے بعالم جفت خواہ — راست ہمچو کہر باؤ برگ کاہ
آسمان گوید زمین را مرحبا — با توام چوں آہن و آہن ربا

اس بناء پر زمین کے معلق رہنے کی وجہ ایک حکیم کی زبان سے اس طرح بیان ہوئی۔

گفت سائل چوں بمانداایں خاکداں — درمیاں ایں محیط آسماں
ہمچو قندیلے معلق در ہوا — نے بر اسفل می رود نے بر علا
آں حکیمش گفت کز جذب سما — از جہات شش بماند در ہوا
چوں ز مقناطیس قبہ ریختہ — درمیاں ماند آہنے آویختہ

یعنی چونکہ اجرام فلکی ہر طرف سے کشش کر رہے ہیں، اس لئے زمین بیچ میں معلق ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر مقناطیس کا ایک گنبد بنایا جائے اور لوہے کا کوئی ٹکڑا اس طرح ٹھیک وسط میں رکھا جائے کہ ہر طرف سے مقناطیس کی کشش برابر پڑے، تو ادھر میں لٹکا رہ جائے گا۔ یہی حالت زمین کی ہے۔

قرآن کریم نے صاف لفظوں میں ظاہر کیا ہے کہ تمام اجرام فلکیہ فضاء میں تیرتے ہیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ کل فی فلک یسبحون ۔ یعنی تمام اجرام سماویہ اپنے اپنے مقررہ محور پر تیر رہے ہیں۔

حقیقت موت انسان

آدمی کے دو مادے ہیں۔ ایک بالذات جونسمہ ہے اور دوسرا بالعرض، وہ یہ زمینی بدن ہے۔ جب آدمی مرتا ہے تو اس مادہ زمینی کے زوال سے اس کو کوئی مضرت نہیں ہوتی۔ وہ بدستور اپنے مادہ نسمہ میں حلول کئے ہوئے رہتا ہے۔ وہ اس کاتب کی طرح ہوتا ہے کہ جب اسکے دونوں ہاتھ قطع کر دیئے جائیں، تب بھی وہ اپنی کتابت میں محو رہتا ہے۔ اس میں کتابت کا ملکہ بحالہا قائم رہتا ہے یا جیسے کوئی چلنے کا شائق ہو اور اسکے دونوں پاؤں قطع کر دیئے جائیں یا سمیع وبصیر جب وہ گنگ یا نابینا ہو جائے۔

قالب آدم چالیس دن میں خمیر ہونے کی حکمت

حدیث نبوی میں آیا ہے۔ **ان احدکم یجمع فی بطن امه اربعین یوماً**۔ اور دوسری حدیث قدسی میں خدا تعالیٰ کا کلام ہے۔ **خمرت طینه آدم بیدی اربعین صباحاً**۔ ترجمہ۔ تحقیق تمہارے ہر ایک بنی نوع کا قالب اپنی ماں کے شکم میں چالیس روز کے اندر تیار ہو جاتا ہے۔ ہر ایک بنی آدم کی مٹی کا خمیر چالیس روز میں اپنے دست قدرت سے تیار کرتا ہوں۔ اور یہ امر جملہ اطباء و حکماء و ڈاکٹروں کے نزدیک مسلم ہے کہ ہر ایک آدمی کا جسمی قالب رحم مادر میں چالیس روز میں تیار ہو جاتا ہے۔ طبی علوم تشریح کا فن انسانی فزیالوجی یعنی علم افعال الاعضاء اس امر کے گواہ ہیں۔ تمام آدمیوں کے قالب کی بناوٹ کی نسبت حکماء و ڈاکٹروں کا گروہ یک زبان ہو کر حدیث نبوی کی تصدیق کرتے ہیں کہ ہر ایک آدمی کا قالب چالیس روز میں تیار ہوتا ہے۔ تو اس روزمرہ کے مشاہدہ اور تجربہ سے یقین پڑتا ہے کہ سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قالب عنصری بھی، جو اسی جنس کے مورث اور باپ کا قالب ہے، ضرور چالیس روز میں تیار ہوا ہوگا۔ جس سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ انسانی شکل اور اس کے تمام خط و خال کا کھلا خاکہ رحم مادر میں چالیس روز تک پورا ہو جاتا ہے۔ گویا تمام اولاد آدم اپنے مورث اعلیٰ کے چالیس روز میں بننے کی شہادت دیتی ہے اور حدیث **خمرت طینة آدم** کی تصدیق کرتی ہے۔ حدیث بالا (**ان احدکم یجمع فی بطن امه اربعین یوماً**) بخاری کی کتاب القدر میں موجود ہے۔

آدم کی پسلی سے پیدائش حوا کی حقیقت

قرآن شریف میں اس بارے میں یہ آیت ہے۔ **خلقکم من نفسٍ واحدة ثم جعل منها زوجها یخلقکم فی بطون امهاتکم خلقا من بعد خلق فی ظلمات ثلاثٍ** (سورة الزمر) ترجمہ۔ خدا نے تم لوگوں کو ایک وجود سے پیدا کیا۔ پھر اسی وجود سے اس کا جوڑا بنایا۔ وہی تم کو تین اندھیروں میں تمہاری ماؤں کے پیٹ میں پیدا کرتا ہے۔ ایک قسم کی پیدائش کے بعد دوسری پیدائش۔

اس آیت میں تو کہیں پسلی اور ہڈی وغیرہ کا ذکر نہیں۔صرف اسی قدر لکھا ہے کہ ایک انسان سے دوسرے انسان کو پیدا کیا۔ ہاں یہ ذکر پایا جاتا ہے کہ خدا نے اپنا پہلا قانون بدل دیا۔ کیونکہ پہلا انسان نطفہ سے پیدا نہیں ہوا تھا، بلکہ ایک وجود سے دوسرا وجود پیدا کیا گیا تھا تا نوعیت میں فرق نہ آئے۔ پھر بعد میں یہ دوسرا قانون قدرت شروع ہوا کہ انسان نطفہ سے پیدا ہونے لگے۔اور یہ محل اعتراض نہیں کہ خدا نے پہلا قانون قدرت کیوں منسوخ کر دیا، کیونکہ خدا اپنے قانونوں کو اس لئے منسوخ کرتا ہے کہ تا اس کے انواع واقسام کی قدرتیں ظاہر ہوں۔اس جگہ یہ ثبوت ملتا ہے کہ خدا کا قانون قدرت ہے کہ بعض امور کو منسوخ کر کے دوسرے امور پیدا کرتا ہے۔پس جو لوگ تنسیخ کے منکر ہیں،ان کو غور کرنا چاہئے۔

ممدوحہ بالا آیت کے ایک یہ بھی معنی ہیں کہ کئی قسم کی پیدائش کے بعد رحم کے اندر پورا انسان بنتا ہے۔اور تین اندھیروں میں اس کی پیدائش ہوتی ہے۔(۱) پیٹ (۲) رحم (۳) جھلی،جس کے اندر بچہ پیدا ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ پسلی اور ہڈی سے خدا کی کتابوں میں قریبی رشتے بھی مراد لئے گئے ہیں۔جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ آدم اور حوا کا رشتہ قریب کا تھا یا آدم کی پسلی سے حوا پیدا ہوگئی ہو۔خدا کا کلام اس جگہ نہایت وسیع معنوں پر مشتمل ہے۔آیت کے معنی وسیع طور پر یہ ہیں کہ ایک سے ہم نے دوسرے کو پیدا کیا۔اگر کسی کو اعتراض ہو کہ پسلی سے پیدا کرنا قانون قدرت کے خلاف ہے،تو اس کا جواب یہ ہے کہ نطفہ سے پیدا ہونا بھی اس قانون قدرت کے برخلاف ہے، جو بموجب اصول معترض کے پہلے ظہور میں آیا۔پس جس نے ایک قانون قدرت کو بدل کر دوسرا قانون قدرت پیدائش کے لئے مقرر کیا،تو پھر کیا اس کی شان سے کچھ تعجب ہے کہ پہلی پیدائش میں ایک انسان کی پسلی سے دوسرا انسان پیدا کر دیا ہو۔ کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

حقیقت جنت حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "تاویل الاحادیث" کے صفحہ ۱۱ پر لکھا ہے۔ **ان آدمؑ احاطت بہٖ قوی الارواح و تخیلات الملاء الاعلیٰ و توجہ الیہ و تخیل العرش فصار فی الجنۃ و ھو فی مکانہ من الارض فانسحبت علیہ احکام الجنۃ**۔ترجمہ۔یعنی آدم علیہ السلام کو قوائ ارواح اور ملاء اعلیٰ نے گھیر لیا اور عرش کا خیال ان کی طرف متوجہ ہوا،تو وہ جنت میں ہو گئے۔ حالانکہ وہ زمین پر اپنے گھر میں تھے۔پس ان پر احکام جنت جاری ہوئے۔

جملہ محققین کے نزدیک وہ جنت، جس میں حضرت آدم علیہ السلام داخل ہوئے تھے، وہ زمین پر تھی، کیونکہ اخروی جنت کے متعلق خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ **لَا یَمَسُّهُمْ فِیهَا نَصَبٌ وَ لَا عَذَابٌ** ۔یعنی اخروی جنت میں اہل جنت کو کوئی دکھ اور عذاب نہ پہنچے گا، مگر جس جنت میں آدم علیہ السلام تھے، اس میں ان کو تکلیف پہنچی۔ اخروی جنت کو خدا تعالیٰ نے دار القرار کہا ہے، مگر جس جنت میں آدم علیہ السلام تھے، وہ ان کے لئے دار الزوال ثابت ہوئی، جس میں سے وہ نکالے گئے۔ اخروی جنت کے متعلق خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ **لَا لَغْوٌ فِیهَا وَ لَا تَأْثِیمٌ** ۔یعنی جنت میں کوئی بیہودہ کلام اور گناہ کا کام نہ ہوگا۔ مگر جس جنت میں آدم علیہ السلام تھے، اس میں شیطان نے بیہودہ کلام اور گناہ کا کام کیا۔ اخروی جنت کے متعلق خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **وَ مَا هُمْ عَنْهَا بِمُخْرَجِیْن** ۔ترجمہ۔یعنی اہل جنت بہشت سے نہیں نکالے جائیں گے۔ مگر آدم علیہ اسلام جس جنت میں تھے اس میں سے نکالے گئے۔ اخروی جنت میں اہل جنت پر کوئی شریعت نہ ہوگی۔ مگر جس جنت میں آدم علیہ السلام تھے، اس میں ان پر شریعت قائم تھی۔

عربی تورات کے باب ثانی آیت سات میں لکھا ہے۔ **و جبل الرب الا له جنة فی عدن شرقاً و وضع هناک آدم الذی جبله.** ترجمہ۔عدن کے مشرق میں خدا تعالیٰ نے ایک باغ پیدا کیا اور اس میں آدم کو رکھا۔

قرآن کریم میں حضرت آدمؑ اور ان کی اولاد کے متعلق آیا ہے۔ **اهبطوا منها** ۔یعنی جنت سے اتر جاؤ۔ یعنی جنت سے نکل جاؤ۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں اسرائیلیوں کے بارے میں آیا ہے۔ **اهبطوا مصراً** ۔یعنی مصر سے نکل جاؤ۔

منشی الہ داد صاحب پوسٹ ماسٹر چکدرہ نے مندرجہ ذیل سوالات لکھ کر ہمیں بھیجے ہیں، جن کے جوابات بعد اندراج سوالات لکھے جاتے ہیں۔

(۱) آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام جب جنت سے خارج ہوئے اور زمین پر آباد ہونے کا حکم ہوا، تو وہ پہلے کس قطعہ زمین پر وارد ہوئے؟

جواب۔ جس جنت میں آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام بسائے گئے تھے، وہ اسی زمین عدن کے مشرق میں تھی، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔

(۲) کیا ولی اہل قبور لوگوں کے واسطے، جو ان سے ملتجی ہوں، خدا کی جناب میں دعا کر سکتے ہیں اور ان کی دعا کو درجہ قبولیت عطا ہوتا ہے؟

جواب۔اس سوال کا جواب بالتفصیل "اسرار شریعت" جلد اول میں ملاحظہ ہو۔

(۳) جب قبر میں مردہ سے سوال و جواب ہوں گے، تو اس کے قالب عنصری میں روح ڈالی جائے گی اور سوال و جواب کس روش سے ہوں گے یا ایسے ہی پرتو روح قالب عنصری پر پڑے گا۔اور عذاب قالب کو ہے یا روح کو؟

جواب۔اس سوال کا جواب "عذاب وثواب قبر" کے عنوان کے تحت ملاحظہ کریں۔

(۴) جو شخص دنیا سے سفر کر کے پنجشنبہ کے روز قبر میں مدفون ہو، تو کیا اس سے عذاب قبر اور سوال و جواب کی درشتی میں رعایت ہوتی ہے؟ عام رواج ہے کہ اگر کوئی شخص مثلاً اتوار کو مر کر دفنایا جائے، تو اس کی قبر پر قرآن خوان بٹھائے جاتے ہیں جو یکے بعد دیگرے تمام رات اور دن قرآن خوانی کرتے ہیں۔ پھر عین جمعرات کے روز قبر سے اٹھ جاتے ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ ہم نے مردہ کو جمعرات تک پہنچا دیا ہے۔اب عذاب قبر تا قیامت نہ ہوگا۔

جواب۔ یوں تو احادیث صحیحہ سے مرنے والے کے پاس قرآن شریف کا پڑھنا ثابت ہے، مگر قبر پر جمعرات تک قرآن خوانوں کو بٹھانا مجھے کسی کتاب میں کہیں نظر نہیں آیا کہ ایسا کام صدر اول یا ثانی یا سوم میں کسی نے کیا ہو۔

حضرت آدم کی خلافت کس قوم پر تھی؟

سوال۔حضرت آدم علیہ السلام، جب خلیفہ بن کر آئے تھے، تو کیا اس وقت کوئی قوم موجود تھی؟ اگر قوم موجود تھی، تو حوا کی پیدائش کی ضرورت نہ تھی۔اسی موجودہ قوم میں نکاح کر سکتے تھے۔

جواب۔قرآن شریف میں جو فرمایا گیا ہے۔ **انی جاعل فی الارض خلیفة** ۔(میں تمہیں زمین پر خلیفہ بناتا ہوں) اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ اس وقت پہلے سے کوئی قوم موجود تھی۔دوسری جگہ پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔**والجان خلقناه من قبل من نار السموم** ۔(قوم جان کو ہم نے اس سے قبل جلا دینے والی آگ سے پیدا کیا تھا) گویا ایک قوم بنامی جان موجود تھی۔ایسا ہی بخاری میں ایک حدیث ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے خالق ہے اور حق بھی یہی ہے، کیونکہ اگر اس کو ہمیشہ سے خالق نہ مانیں، تو پھر نعوذ باللہ اس کی ذات پر حرف آتا ہے اور یہ ماننا پڑے گا کہ آدم سے پہلے وہ معطل تھا۔اور قرآن شریف میں جو ترکیب ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے استمرار پر دلالت کرتی ہے۔ اگر آدم سے پہلے خلق نہ ہوتی، تو یہ ترکیب نہ ہوتی۔ پس آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے ضرور مخلوق موجود تھی۔

اخبار الدول و آثار الدول کی چوتھی فصل میں لکھا ہے۔**روی مجاهدعن ابن عباس رضی اللہ عنه قال کان فی الارض قبل الجن خلق یقال لهم الجن و البن والطم و الرم او ذکر غیره ان اول من سکنا الارض امة یقال لهم الجن و البن ثم سکنها الجن قاموا یعبدون اللہ زمانا فطال علیهم الامر ففسدوا فارسل اللہ علیهم نبیاً لقوله تعالیٰ یا معشر الجن و الانس الم یاتکم رسل منکم و قیل ملکا منذراً یقال له یوسف فلم یطیعوه و قاتلوا فارسل علهم الملائکة فاجلتهم الی البحار** ۔ترجمہ۔مجاہدابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جن سے پہلے زمین پر ایک قسم کے لوگ رہتے تھے،جنہیں جن۔بن۔طم۔رم کہتے تھےاور وہ سب نا پید ہو گئے۔اور ایک شخص کا قول ہے کہ زمین کے باشندے ایک قوم تھی،جنہیں جن اور بن کہتے تھے۔ پھر اس پر جن آباد ہوئے۔ کچھ دنوں تو اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے بنے رہے۔ پھر شرارتیں کرنے لگے،تو اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ان کی طرف ایک نبی بھیجا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔اے گروہ جن وانس کیا تم میں سے تمہاری طرف رسول نہیں آئے۔ کہتے ہیں کہ ڈرانے والے بادشاہ کا نام یوسف تھا۔انہوں نے اس کا کہانہ مانااور اس سے لڑنے کو کھڑے ہوئے۔تب اللہ تعالیٰ نے ان پر فرشتوں کو بھیجا،جنہوں نے ان باغیوں کو سمندر کی طرف نکال دیا۔

ممکن ہے کہ جس مقام پر حضرت آدمؑ کی پیدائش ہوئی ہو،وہاں کے لوگ کسی عذاب الٰہی سے ایسے تباہ ہو گئے ہوں کہ کوئی آدمی نہ بچا ہو۔دنیا میں اس قسم کا سلسلہ دیکھا جاتا ہے کہ کوئی مقام بالکل تباہ ہو جاتا ہےاور دوسرا آباد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ اب تک قطب شمالی میں کسی آبادی کی تلاش کر رہے ہیں تا یہ معلوم کریں کہ اول کون سے قطعات زمین آباد تھے۔مگر ایسی مشکلات میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ایمان لانا چاہئے کہ خدارب رحمان رحیم مالک یوم الدین ہےاور ہمیشہ سے جانداروں کی پیدائش ایک تکون سے ہوتی ہےاور ایک تکون سے ممکن ہے کہ آدم کے وقت اور مخلوق ہو اور اس کی جنس سے نہ ہو یا اگر ہو تو اس میں کیا حرج ہے کہ قدرت نمائی کے لئے آدم کی پسلی سے حوا کو پیدا کر دیا۔اللہ تعالیٰ کی قدرتوں پر ایمان لانا چاہئے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے کہ ایک قوم موجود ہو اور وہ اس کے ہوتے ہوئے ایک اور قوم پیدا کر دے یا اسے ہلاک کر کے دوسری قوم پیدا کرے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں بھی ایک جگہ ایسا واقعہ بیان ہوا ہے۔

یہ بھی یاد رکھو کہ خلیفہ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ ایک قوم ضرور پہلے سے موجود ہو۔ایسا ہو سکتا ہے کہ اور قوم کو پیدا کر کے پہلی قوم کا اسے خلیفہ بنایا جائے اور آدم علیہ السلام اس کے مورث اعلیٰ ہوں۔

انسان چونکہ ازلی ابدی نہیں ہے۔اس پر تغیرات آتے رہتے ہیں۔مگر خدا پر تغیرات نہیں آتے ۔اس کا راز یہ ہے کہ جب روحانیت پر موت آجاتی ہے اوراصل انسانیت فوت ہو جاتی ہے تو خدا تعالیٰ ایک شخص کو بطور آدم پیدا کرتا ہے۔اوراس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ بعض قوموں کو ہلاک کر دیتا ہے، جیسے حضرت نوحؑ کے وقت میں کیا اور پھر ایک نئی پیدائش کی۔اگر یہ سلسلہ ہلاک نہ ہوتا،تو زمین پر اس قدر آبادی ہوتی کہ رہنا محال ہو جاتا۔انکی قبروں نے ہی پردہ پوشی کی ہے۔

کیا کوئی چیز نیست سے ہست ہوسکتی ہے؟

آریوں کی بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی بے انتہا قدرتوں اور بے انتہا اسرار کو اپنے نہایت محدود علم کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔اور جو باتیں انسان کے لئے غیر ممکن ہیں،وہ خدا کے نزدیک بھی غیر ممکن ٹھہراتے ہیں۔اسی بنا پر ان کا اعتراض ہے کہ روحیں کہاں سے پیدا ہوئی ۔ مادہ کہاں سے پیدا ہوا۔تعجب کہ وہ پہلے اس سوال کو حل نہیں کرتے کہ خدا کہاں سے اور کس طرح پیدا ہوا۔جب کہ اس بات کو ماننا پڑتا ہے کہ خدا کی قدرتیں ناپیدا کنار ہیں اور اس کے اسرار وراء الوراء ہیں ۔ اور ہمارے مشاہدات گواہ ہیں،تو پھر یہ بے ہودہ منطق خدا تعالیٰ کی قدرت کی نسبت کیوں استعمال کی جاتی ہے۔
جس حالت میں دنیا کے لوگ اپنی عجیب در عجیب ایجادوں کے ساتھ لوگوں کو حیران کر دیتے ہیں اور ایسے عمیق اسرار سائنس کے نکلتے آتے ہیں کہ ہزاروں فلاسفر اس زمانہ سے پہلے ایسے گزرے ہیں کہ ان خواص کو از قبیل محالات سمجھتے تھے۔تو پھر خدا تعالیٰ کے عمیق اسرار پر کیوں اعتراض کئے جاتے ہیں ۔ جو کچھ ہمارے مشاہدہ میں ہر روز آتا ہے کیا ہم اپنے عقلی ہتھیاروں کے ذریعہ سے اسکی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں۔زمین میں مثلاً ایک کنک کا دانہ بویا جاتا ہے۔پھر اس سے سبزہ نکلتا ہے اور ٹہنیاں پیدا ہوتی ہیں اور خوشہ لگتا ہے اور ایک دانہ سے کئی دانے ہو جاتے ہیں۔کیا کوئی سمجھ سکتا ہے کہ اتنی چیزیں صرف ایک دانہ سے کیونکر پیدا ہو جاتی ہیں۔اگر صرف ہست سے ہست مانا جائے،تو ایک دانہ کے عوض میں صرف بقدر ایک دانہ پیدا ہونا چاہئے۔باقی سب نیست سے ہست قبول کرنے پڑتے ہیں۔
ایسا ہی اگر آم کا ایک پھل زمین میں بویا جاوے تو اس سے ایک بڑا درخت آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے اور بہت سی شاخیں نکالتا ہے اور پھول لاتا ہے اور آخر ہزاروں آم اس پر لگتے ہیں۔کیا کوئی سمجھ سکتا ہے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔آم جو بویا گیا،وہ تو صرف ایک تھا۔پس یہ انبار لکڑیوں اور پتوں اور پھولوں کا کہاں سے پیدا ہو گیا۔کیا اگر یہ نیستی سے ہستی نہیں تو اور کیا ہے۔پس سچ تو یہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ اناج اور پھلوں کے پیدا کرنے میں نیستی سے ہستی نہ کرتا اور ایک دانہ کے عوض میں صرف ایک دانہ پیدا ہوتا،تو

تھوڑے ہی دنوں میں سب لوگ مر جاتے۔ عقلی طور پر تو صرف یہ ماننا پڑتا ہے کہ ایک دانہ کی جگہ صرف ایک ہی دانہ پیدا ہو۔ باقی جو کچھ خدا تعالیٰ پیدا کر کے دکھاتا ہے وہ سب عقل سے برتر اور نیستی سے ہستی ہے۔

قرآن شریف میں خدا تعالیٰ ایک جگہ مثال کے طور پر فرماتا ہے۔ **کمثل حبة انبتت سبع سنابل فی کل سنبلة مائة حبة** ۔ترجمہ۔ یعنی خدا کی راہ میں جو لوگ مال خرچ کرتے ہیں ان کے مالوں میں خدا اس طرح برکت دیتا ہے کہ جیسے ایک دانہ جب بویا جاتا ہے تو گو وہ ایک ہی ہوتا ہے۔ مگر خدا اس میں سے خوشے نکال سکتا ہے اور ہر ایک خوشہ میں سو دانے پیدا کر سکتا ہے یعنی اصل چیز سے زیادہ کر دینا خدا کی قدرت میں داخل ہے اور درحقیقت ہم تمام لوگ خدا کی اسی قدرت سے ہی زندہ ہیں اور اگر خدا تعالیٰ اپنی طرف سے کسی چیز کو زیادہ کرنے پر قادر نہ ہوتا تو تمام دنیا ہلاک ہو جاتی اور ایک جاندار بھی روئے زمین پر باقی نہ رہتا۔ پس خدا کی اس قدرت نے، جو نیست سے ہست کرتا ہے، تمام دنیا کو بچا رکھا ہے۔ انسان کی سخت بدذاتی ہے، جو اس کو اپنی قدرت نمائی میں عاجز سمجھے۔ اور اس کو نیست سے ہست کرنے پر قادر خیال نہ کرے۔ ہم دیکھتے ہیں مثلاً فونوگراف میں جو آواز بند کی جاتی ہے اور وہ اس انسان کے ٹھیک ٹھیک لہجہ پر، جس کی آواز بند کی گئی ہے، نکلتی ہے۔ کیا اس ایجاد سے پہلے کسی کو سمجھ آ سکتا تھا کہ آواز میں بھی یہ خاصیت موجود ہے کہ وہ خاص قسم کے ظروف میں بند ہو سکتی ہے اور پھر اصل آواز کی طرح پیدا ہو کر سنائی دیتی ہے اور سالہا سال اور مدتہائے دراز تک بند رہ سکتی ہے اور پھر جب اس آواز کا سنانا منظور ہو تو ایسے طور سے نکلتی ہے کہ گویا وہ انسان، جس کی آواز بندھ گئی ہے، بول رہا ہے۔ کیا یہ نیست سے ہست نہیں۔ اگر کسی طبعی راز کا کسی کو علم نہیں، تو وہ ایسی آواز سے ڈرے گا اور خیال کرے گا کہ شاید اس میں کوئی جن بول رہا ہے۔

اسی طرح اس زمانہ میں ہزارہا سائنس کے اسرار کا پردہ کھلتا جاتا ہے، جو کسی زمانہ میں نیست کے طور پر سمجھے جاتے تھے۔ اور وہ عمیق در عمیق علم طبعی کے خواص نئی ایجادوں کے ذریعے سے ظاہر ہوتے جاتے ہیں کہ انسان کی عقل حیران رہ جاتی ہے۔ پھر تعجب آتا ہے کہ ایسے زمانہ میں وہ نادان ہیں کہ جو خدا تعالیٰ کے اسرار قدرت پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ روح نیست سے کیونکر ہست ہو جاتی ہے۔ اور دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہزاروں چیزیں نیست سے ہست ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک دھات جو بالکل نیست ہو جاتی ہے اور مر جاتی ہے وہ شہد اور سہاگہ اور گھی میں جوش دینے سے پھر زندہ ہو جاتی ہے۔ کسی نے پنجابی میں کہا ہے۔ "شہد سہاگہ گھی موئی دھات دا ایہو جی" یعنی شہد سہاگہ اور گھی جو ہے مری ہوئی

دھات کی یہی جان ہے۔اور اسرار قدرت الٰہی میں سے ایک امر بدیہی دیکھا گیا ہے کہ جب ایک گلہری کو پتھر یا سوٹے سے مارا جائے، تو وہ بظاہر بالکل مر جائے، مگر ابھی تازہ ہو، تو اگر اس کے سر کو گوبر میں دبایا جائے، تو چند منٹ میں وہ زندہ ہو کر بھاگ جاتی ہے۔مکھی اگر پانی میں مر جائے تو وہ بھی زندہ ہو کر پرواز کر جاتی ہے۔اور بعض جانور جیسے زنبور اور دوسرے حشرات الارض سخت سردی کے ایام میں مر جاتے ہیں اور زمین میں یا دیواروں کے سوراخوں میں چمٹے رہتے ہیں اور جب گرمی کو موسم آتا ہے، تو پھر زندہ ہو جاتے ہیں۔ان اسرار کو بجز خدا تعالیٰ کون سمجھ سکتا ہے۔

ایسا ہی بعض نباتی اور معدنی چیزیں علیحدہ علیحدہ ہونے کی حالت میں تو کچھ خاصیت نہیں رکھتیں مگر ترکیب کے بعد ان میں ایک نئی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔مثلاً شورہ اور گندھک اور کوئلہ ایک خاص ترکیب سے بارود بن جاتا ہے اور اگر چاہیں کہ صرف شورہ یا صرف گندھک یا صرف کوئلہ سے بارود بنایا جائے، تو یہ غیر ممکن ہوتا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ترکیب سے ایک نئی چیز پیدا ہو سکتی ہے اور شاید اسی بناء پر کیمیا کے طالب سونا اور چاندی بنانے کے سودا میں لگے رہتے ہیں۔مگر کوئی کیمیا ایسا نہیں جیسا خدا کی محبت اور خدا کی طرف جھکنا جیسا کہ شیر خوار بچہ اپنی ماں کی طرف جھکتا ہے۔طبعی تحقیقاتوں سے ثابت ہے کہ زمین کی ہر ایک چیز میں ایک جاندار کیڑے کا مادہ موجود ہے، یہاں تک کہ زنگ خوردہ لوہے میں بھی کیڑا پیدا ہو جاتا ہے۔اور عجیب تر یہ کہ بعض پتھروں میں بھی کیڑا دیکھا گیا ہے۔اور ہر ایک قسم کے اناج اور ہر ایک قسم کے پھل، جب بہت مدت تک رکھے جائیں، تو ان میں بھی کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جب انسان موت کے بعد دفن کیا جاتا ہے، تو رفتہ رفتہ تمام بدن اس کا کیڑوں سے بھر جاتا ہے اور سب سے عجیب تر یہ کہ ایک مشہور درخت ہے جس کو گولر کہتے ہیں۔اس کا پھل جب تک سبز ہوتا ہے اس میں کیڑا نہیں ہوتا اور جیسے جیسے پکتا جاتا ہے اسی کے مادہ میں سے کیڑے پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اور جب اس پھل کو چیرا جائے تو وہ کیڑے پرواز بھی کر جاتے ہیں۔اور بعض وقت ایک انڈے میں، جو مرغی اور بطخ وغیرہ کا ہو، جب سڑ جائے تو بجائے ایک بچہ کے صدہا کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام امور دلالت کر رہے ہیں کہ قدرت الٰہی کا یہ وہی راز ہے جسکی نسبت ہم کہتے ہیں کہ نیستی سے ہستی ہوئی۔ مثلاً گولر کا ایک پھل چیر کر دیکھو، اس میں کوئی کیڑا نہیں ہوتا اور ہندو مسلمان سب اس کو کھاتے ہیں۔اور پھر جب پک جاتا ہے تو وہی مادہ کیڑے بن جاتے ہیں۔اب اس کو نیستی سے ہستی نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔ اسی طرح ہم نیستی سے ہستی مانتے ہیں، جس پر مشاہدہ گواہ ہے۔یہی قانون قدرت ہے۔(ماخوذ)

حقیقت روح اور اس کی پیدائش کا زمانہ

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روح کی ماں جسم ہی ہے۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ میں روح کبھی اوپر سے نہیں گرتی، بلکہ وہ ایک نور ہے، جو نطفہ میں پوشیدہ طور پر مخفی ہوتا ہے اور جسم کی نشو ونما کے ساتھ چمکتا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کا کلام ہمیں سمجھاتا ہے کہ روح اس قالب میں سے ہی ظہور پذیر ہوجاتی ہے، جو نطفہ سے رحم میں تیار ہوتا ہے، جیسا کہ وہ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ **ثم انشاناہ خلقاً آخر فتبارک اللہ احسن الخالقین** ۔ترجمہ۔یعنی پھر ہم اس جسم کو، جو رحم میں تیار ہوا تھا، ایک اور پیدائش کے رنگ میں لاتے ہیں اور ایک اور خلقت اس کی ظاہر کرتے ہیں، جو روح کے نام سے موسوم ہے۔اور خدا بہت برکتوں والا ہے اور ایسا خالق ہے کہ کوئی اس کے برابر نہیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ ہم اسی جسم میں سے ایک اور پیدائش ظاہر کرتے ہیں یہ ایک گہرا راز ہے، جو روح کی حقیقت دکھلا رہا ہے اور ان نہایت مستحکم تعلقات کی طرف اشارہ کررہا ہے، جو روح اور جسم کے درمیان واقع ہیں، اور یہ اشارہ ہمیں اس بات کی بھی تعلیم دیتا ہے کہ انسان کے جسمانی اعمال اور اقوال اور تمام طبعی افعال جب خدا تعالیٰ کے لئے اور اس کی راہ میں ظاہر ہونے شروع ہوں، تو ان سے بھی یہی الٰہی فلاسفی متعلق ہے۔یعنی انسان کے مخلصانہ اعمال میں بھی ابتداء ہی سے ایک روح مخفی ہوتی ہے جیسا کہ نطفہ میں مخفی تھی۔اور جیسے جیسے ان اعمال کا قالب تیار ہوتا جائے وہ روح چمکتی جاتی ہے۔اور جب وہ قالب پورا ہو چکتا ہے، تو یک دفعہ وہ روح اپنی کامل تجلّی کے ساتھ چمک اٹھتی ہے اور اپنی روحی حیثیت سے اپنے وجود کو دکھا دیتی ہے۔اور زندگی کی صریح حرکت شروع ہو جاتی ہے جیسے کہ جب اعمال کا پورا قالب تیار ہو جاتا ہے، تو معاً بجلی کی طرح ایک چیز اندر سے اپنی کھلی کھلی چمک دکھلانا شروع کردیتی ہے۔ یہ وہی زمانہ ہوتا ہے، جس کی نسبت اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں مثالی طور سے فرماتا ہے۔**فاذا سویتہ و نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین** ۔ترجمہ۔یعنی جب میں نے اس کا قالب بنالیا اور تجلیات کے تمام مظاہر درست کر لئے اور اپنی روح اس میں پھونک دی، تو تم سب لوگ اس کے لئے زمین پر سجدہ کرتے ہوئے گر جاؤ۔سو اس آیت میں بھی اشارہ ہے کہ جب اعمال کا پورا قالب تیار ہو جاتا ہے، تو اس قالب میں وہ روح چمک اٹھتی ہے، جس کو خدا تعالیٰ اپنی ذات کی طرف منسوب کرتا ہے، کیونکہ دنیوی زندگی کے فنا کے بعد وہ قالب تیار ہوتا ہے۔اس لئے الٰہی روشنی، جو پہلے دھیمی تھی، یکدفعہ بھڑک اٹھتی ہے اور واجب ہوتا ہے کہ خدا کی ایسی شان کو دیکھ کر ہر ایک سجدہ کرے اور اس کی طرف کھینچا جائے۔سو ہر ایک اس نور کر دیکھ کر سجدہ کرتا ہے اور طبعاً اس طرف آتا ہے بجز ابلیس کے، جو تاریکی سے دوستی رکھتا ہے۔

پیدائش روح نطفہ کے ساتھ ہوتی ہے

پھر میں پہلی بات کی طرف رجوع کر کے بیان کرتا ہوں کہ یہ بات نہایت درست اور صحیح ہے کہ روح ایک لطیف نور ہے، جو جسم کے اندر ہی سے پیدا ہو جاتا ہے جو رحم میں پرورش پاتا ہے۔ پیدا ہونے سے مراد یہ ہے کہ اول مخفی اور غیر محسوس ہوتا ہے، پھر نمایاں ہو جاتا ہے۔اور ابتداً اس کا خمیر نطفہ میں موجود ہوتا ہے۔ بیشک وہ آسمان کے ارادہ سے اور اس کے اذن سے اور اسکی مشیت سے ایک مجہول الکنہ علاقہ کے ساتھ نطفہ سے تعلق رکھتا ہے۔اور نطفہ کا وہ ایک روشن اور نورانی جوہر ہے۔نہیں کہہ سکتے کہ وہ نطفہ کی ایسی جزو ہے جیسا کہ جسم جسم کا جز ہوتا ہے۔مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ باہر سے آتا ہے یا زمین پر گر کر نطفہ کے مادہ سے آمیزش پاتا ہے۔ بلکہ وہ ایسا نطفہ میں مخفی ہوتا ہے، جیسا کہ آگ پتھر کے اندر ہوتی ہے۔خدا کی کتاب کا یہ منشا نہیں ہے کہ روح الگ طور پر آسمان سے نازل ہوتی ہے یا فضا سے زمین پر گرتی ہے اور پھر کسی اتفاق سے نطفہ سے مل کر رحم کے اندر چلی جاتی ہے۔ بلکہ یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں ٹھہر سکتا۔اگر ہم ایسا خیال کریں،تو قانون قدرت ہمیں باطل ٹھہراتا ہے۔ہم روز مشاہدہ کرتے ہیں کہ گندے اور باسی کھانوں میں اور گندے زخموں میں ہزار ہا کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ میلے کچیلے کپڑوں میں صدہا جوئیں پڑ جاتی ہیں۔انسان کے پیٹ کے اندر بھی کدو دانے وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں۔اب کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ باہر سے آتے ہیں یا آسمان سے اترتے کسی کو دکھائی دیتے ہیں۔سو صحیح بات یہ ہے کہ روح جسم سے ہی نکلتی ہے۔اور اس دلیل سے اس کا مخلوق ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

انسانی روح کے پیدا ہونے کے لئے خدا تعالیٰ کا قانون قدرت یہ ہے کہ دو نطفوں کے ملنے کے بعد جب آہستہ آہستہ قالب تیار ہو جاتا ہے،تو جیسے چند ادویہ کے ملنے سے اس مجموعہ میں ایک خاص مزاج پیدا ہو جاتی ہے کہ جو ان دواؤں میں فرد فرد کے طور پر پیدا نہیں ہوتی۔اسی طرح اس قالب میں، جو خون اور دو نطفوں کا مجموعہ ہے،ایک خاص جوہر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ایک فاسفورس کے رنگ میں ہوتا ہے۔اور جب تجلی الٰہی کی ہوا کُــنْ کے امر کے ساتھ اس پر چلتی ہے تو یک دفعہ وہ افروختہ ہو کر اپنی اس قالب کے تمام حصوں میں پھیلا دیتا ہے،تب وہ جنین زندہ ہو جاتا ہے۔پس یہی افروختہ چیز جو جنین کے اندر تجلی ربی سے پیدا ہو جاتی ہے،اس کا نام روح ہے اور وہی کلمۃ اللہ ہے اور اس کو امر ربی سے اسلئے کہا جاتا ہے کہ جیسے ایک حاملہ عورت کی طبیعت مدبرہ بحکم قادر مطلق تمام اعضاء کو پیدا کرتی ہے اور عنکبوت کے جالی کی طرح قالب بناتی ہے،اس روح میں اس طبیعت مدبرہ کو کچھ دخل نہیں۔ بلکہ روح محض خاص امر الٰہی سے پیدا ہوتی ہے۔اور گو روح کا فاسفورس اس مادہ سے ہی پیدا ہوتا ہے،مگر وہ روحانی آگ،

جس کا نام روح ہے، وہ بجز مَس نسیم آسمانی کے پیدا نہیں ہوسکتی۔ یہ سچا علم ہے، جو قرآن شریف نے ہمیں بتلایا ہے۔ تمام فلاسفروں کی عقلیں اس علم تک پہنچنے سے بیکار ہیں۔ (ماخوذ)

تمام اشیاء کلمات اللہ ہیں، جو ایک مالا یدرک کنہ کے رو سے مجسم ہو کر ہمیں نظر آ رہے ہیں۔ اگر کوئی نادان سوال کرے کہ خدا کے کلمے کیونکر مجسم ہوئے؟ اور کیا خدا ان کے علیحدہ ہونے سے کم ہو گیا؟ اس کو سوچنا چاہئے کہ آفتاب سے جو ایک آتشی شیشی آگ حاصل کرتی ہے، وہ آگ کچھ آفتاب میں سے کم نہیں کرتی۔ ایسا ہی جو کچھ چاند کی تاثیر سے پھلوں میں فربہی آتی ہے وہ چاند کو دبلا نہیں کر دیتی۔ یہی خدا کی معرفت کا ایک بھید اور تمام نظام روحانی کا مرکز ہے کہ خدا کے کلمات سے ہی دنیا کی پیدائش ہے۔ اسی امر کی طرف حضرت محی الدین ابن عربی المعروف شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "فتوحات مکیہ" میں نظم ذیل میں اشارہ فرماتے ہیں۔

اِنَّ الْکَلَامَ عِبَارَاتٌ وَ اَلْفَاظٌ   وَ قَدْ تَنُوْبُ اِشَارَاتٌ وَ اِیْمَاءٌ
لَوْ لَا الْکَلَامُ لَکُنَّا الْیَوْم فِیْ عَدَمٍ   وَ لَمْ تَکُنْ ثُمَّ اَحْکَامٌ وَ اَنْبَاءٌ
فِیْهِ بَدَتْ صُوَرَالْاَشْخَاصِ بَارِزَۃٌ   مَعْنًی وَ حِسًّا وَ ذَاکَ الْبَدُو اِنْشَاءٌ
فَانْظُرْ تَرَی الْحِکْمَۃَ الْغَرَّاء قَائِمَۃٌ   فِیْهَا الْعَیْن اللَّبِیب الْقَلْبِ اَشْیَاءٌ

ترجمہ۔ کلام عبارتوں اور الفاظ سے بنتا ہے اور کبھی اشارے اور کنائے کلام کے قائم مقام ہو جاتے ہیں۔ اگر کلام نہ ہوتا تو آج ہم عدم میں ہوتے اور دنیا میں احکام اور خبروں کا ظہور نہ ہوتا۔ کلام سے ہی اشخاص کی صورتیں ظاہر و باہر ہوتی ہیں۔ اور یہ بات معنیً وحساً ثابت ہو چکی ہے کہ کلام سے ہی پیدائش کی ابتداء ہوتی ہے۔ دیکھو کہ یہ عالم کارخانہ حکمت الٰہی کلام الٰہی کے ساتھ قائم ہے اور اس میں دانا دل کے لئے عبرت کی باتیں ہیں۔

حقیقت پیدائش روح و ذرات و مادہ

یاد رہے کہ صحیح معرفت حضرت جل شانہٗ کی کئی نشانیوں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کی قدرت و توحید اور علم اور ہر ایک خوبی اور صفت پر کوئی داغ نقص کا نہ لگایا جائے، کیونکہ جس ذات کا ذرہ ذرہ پر حکم ہے اور جس کے تصرف میں تمام فوجیں تمام روحوں کی اور تمام ہیکل زمین و آسمان کی ہے، وہ اگر اپنی قدرتوں اور حکمتوں اور قوتوں میں ناقص ہو، تو اس عالم جسمانی اور روحانی کا کام چل ہی نہیں سکتا۔ اگر نعوذ باللہ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ ذرات اور ان کی تمام طاقتیں اور ارواح اور انکی تمام فوجیں خود بخود ہیں، تو ماننا پڑیگا کہ خدا تعالیٰ کا علم اور توحید اور قدرت تینوں ناقص ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اگر تمام ارواح اور ذرات خدا تعالیٰ کے ہاتھ سے پیدا شدہ نہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمیں اس بات کا یقین ہو کہ خدا تعالیٰ کو

ان کے اندرونی حالات کا علم ہے۔اور جب کہ اس کے علم پر کوئی دلیل قائم نہیں، بلکہ اس کے برخلاف دلیل قائم ہے، تو اس سے لازم آتا ہے کہ ہماری طرح خدا تعالیٰ بھی ان چیزوں کی اصل کنہ سے بے خبر ہے اور اس کا علم ان کے پوشیدہ در پوشیدہ اسرار پر محیط نہیں ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جیسے مثلاً ایک دوا اپنے ہاتھ سے تیار کی جاتی ہے یا اپنی نظر کے سامنے ایک شربت یا گولیاں یا چند دواؤں کا عرق تیار کیا جاتا ہے، تو بوجہ اس کے کہ ہم خود اس نسخہ کے بنانے والے ہیں، ہمیں ان تمام دواؤں کا پورا علم ہوتا ہے اور ہم بخوبی جانتے ہیں کہ یہ فلاں فلاں دوا ہے اور فلاں فلاں وزن کے ساتھ اس مقصد کے لئے بنائی گئی ہے۔ لیکن اگر کوئی عرق یا گولیاں یا شربت ایسا مجہول الکنہ ہو، جس کو ہم نے نہیں بنایا اور نہ ہم ان اجزا کو جدا جدا کر سکتے ہیں، تو ہم ضرور ان دواؤں سے بے خبر ہوں گے۔ اور یہ بات تو بدیہی ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کو ذرات اور ارواح کا بنانے والا مان لیا جائے، تو ساتھ ہی ماننا پڑیگا کہ بالضرور خدا تعالیٰ کو ان تمام ذرات اور ارواح کی پوشیدہ قوتوں اور طاقتوں کا علم بھی ہے۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ وہ خود ان قوتوں اور طاقتوں کا بنانیوالا ہے، اور بنانیوالا اپنی بنائی ہوئی چیز سے بے خبر نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یہ صورت ہو کہ وہ ان قوتوں اور طاقتوں کا بنانے والا نہیں ہے، تو کوئی برہان اس پر قائم نہیں ہوسکتی کہ اس کو ان تمام قوتوں اور طاقتوں کا علم بھی ہے۔ اگر تم بغیر دلیل کے کہہ دو کہ اس کو علم ہے تو یہ ایک تحکم ہے اور محض ایک دعویٰ ہے۔ اور جیسا کہ یہ دلیل ہمارے ہاتھ میں ہے کہ بنانیوالا ضرور اپنی بنائی ہوئی چیز کا علم رکھتا ہے، اس کے مقابل پر کونسی دلیل آریوں کے ہاتھ میں ہے کہ جو چیزیں اپنے ہاتھ سے خدا تعالیٰ نے بنائی نہیں اس کو ان کی تمام پوشیدہ قوتوں اور طاقتوں کا علم ہے، کیونکہ وہ چیزیں خدا تعالیٰ کے وجود کا عین تو نہیں تا جیسا کہ اپنے وجود پر اطلاع ہوتی ہے ان پر بھی اطلاع ہو۔ بلکہ وہ تمام چیزیں آریہ سماج کے اعتقاد کے رو سے اپنے اپنے وجود کی آپ ہی خدا ہیں اور آپ ہی انادی اور قدیم ہیں اور بوجہ غیر مخلوق ہونے کے پرمیشر سے ایسی بے تعلق ہیں کہ اگر پرمیشر کا مرنا بھی فرض کر لیں تو ان چیزوں کا کچھ بھی حرج نہیں، کیونکہ جس حالت میں پرمیشر ان قوتوں اور طاقتوں کا پیدا کرنیوالا نہیں، تو وہ چیزیں اپنی بقاء میں بھی پرمیشر کی محتاج نہیں، جیسا کہ اپنے پیدا ہونے میں محتاج نہیں۔

خدا تعالیٰ کے دو نام ہیں۔ ایک حی۔ دوسرا قیوم۔ حی کے یہ معنے ہیں خود بخود زندہ اور دوسری چیزوں کو زندگی بخشنے والا۔ اور قیوم کے یہ معنی ہیں کہ اپنی ذات میں آپ قائم اور اپنی پیدا کردہ چیزوں کو اپنے سہارے سے باقی رکھنے والا۔ پس خدا تعالیٰ کے نام قیوم سے وہ چیز فائدہ اٹھا سکتی ہے، جو پہلے اس کے نام حی سے فائدہ اٹھا چکی ہو۔ کیونکہ خدا تعالیٰ اپنی پیدا کردہ چیزوں کو سہارا دیتا ہے، نہ ایسی چیزوں کو

جن کے وجود اور ہستی کو اس کے ہاتھ نے چھوا ہی نہیں۔ پس جو شخص خدا تعالیٰ کو حی یعنی پیدا کرنیوالا مانتا ہے، اس کا حق ہے کہ اس کو قیوم بھی مانے، یعنی اپنی پیدا کردہ کو اپنی ذات سے سہارا دینے والا۔ لیکن جو شخص خدا تعالیٰ کو حی یعنی پیدا کرنیوالا نہیں جانتا، اس کا حق نہیں ہے کہ اس کی نسبت یہ اعتقاد رکھے کہ وہ ان چیزوں کو ان کے رہنے میں سہارا والا ہے۔ کیونکہ سہارا دینے کے یہ معنی ہیں کہ اگر اس کا سہارا نہ ہو تو وہ چیزیں معدوم ہو جائیں۔ اور ظاہر ہے کہ جن چیزوں کا اس کی طرف سے وجود نہیں، وہ چیزیں اپنے بقائے وجود میں اس کی محتاج بھی نہیں ہوسکتیں۔ اور اگر وہ بقائے وجود میں محتاج ہیں، تو اس وجود کی پیدائش میں بھی محتاج ہیں۔ غرض خدا تعالیٰ کے یہ دونوں اسم حی و قیوم اپنی تاثیر میں ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں، کبھی علیحدہ علیحدہ نہیں ہو سکتے۔

پس جن لوگوں کا یہ مذہب ہے کہ خدا روحوں اور ذرات کا پیدا کرنیوالا نہیں، وہ اگر عقل اور سمجھ سے کام لیں، تو ان کو اقرار کرنا پڑیگا کہ خدا تعالیٰ ان چیزوں کا قیوم بھی نہیں۔ بلکہ خدا تعالیٰ کے سہارے کی محتاج وہ چیزیں ہیں، جو اس کی پیدا کردہ ہیں۔ غیر کو، جو اپنے وجود میں آنے میں اس کی محتاج نہیں، ان کو اس کے سہارے کی بھلا کیا حاجت؟ یہ دعویٰ بے دلیل ہے اور ہم ابھی لکھ چکے ہیں کہ اگر ذرات اور ارواح کو قدیم سے انادی اور خود بخود مانا جائے، تو اس بات پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوسکتی کہ خدا تعالیٰ کو ان کے پوشیدہ خواص اور دقیق در دقیق طاقتوں اور قوتوں کا علم ہے۔ اور یہ کہنا کہ چونکہ وہ ان کا پرمیشر ہے، اس لئے اس کو ان کے پوشیدہ خواص اور طاقتوں کا علم ہے، یہ صرف دعویٰ ہے، جس پر کوئی دلیل قائم نہیں کی گئی اور کوئی برہان پیش نہیں کی گئی اور نہ کوئی رشتہ عبودیت اور الوہیت کا ثابت کیا گیا، بلکہ وہ ان کا پرمیشر ہی نہیں۔ بھلا جس کا کوئی رشتہ خالق ہونے کا ذرات اور روحوں سے نہیں، وہ ان کا پرمیشر کاہے کو ہوا۔ اور کن معنوں میں کہہ سکتے ہیں کہ خدا روحوں اور ذرات کا پرمیشر ہے۔ یہ اضافت کس بنا پر ہوسکتی ہے۔ اضافت تو مِلک کی ہوتی ہے، جیسے کہا جائے کہ غلامِ زید یعنی زید کا غلام۔ سو مملوک ہونے کی کوئی وجوہ چاہئیں اور کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ کیوں آزاد چیزوں کو، جو اپنے قویٰ قدیم سے رکھتی ہیں، ان کو بلا وجہ پرمیشر کی مِلک قرار دیا جائے۔ دوسری وجہ اضافت کسی رشتہ کے سبب ہوتی ہے، جیسا کہ کہا جائے پسرِ زید۔ لیکن جب کہ ارواح اور ذرات کا پرمیشر کے ساتھ کوئی رشتہ عبودیت اور ربوبیت کا نہیں، تو یہ اضافت بھی ناجائز ہے۔ اور اس حالت میں یہ بات بالکل سچ ہے کہ ایسے بے تعلق روحوں کے لئے نہ تو پرمیشر کا وجود کچھ مفید ہے اور نہ اس کا عدم مضر ہے، بلکہ ایسی حالت میں نجات، جس کو آریہ سماج والے مکتی کہتے ہیں، بالکل غیر ممکن اور ممتنع امر ہے، کیونکہ نجات کا تمام مدار خدا تعالیٰ کی محبت ذاتیہ پر ہے اور محبت

ذاتیہ اس محبت کا نام ہے، جو روحوں کی فطرت میں خدا تعالیٰ کی طرف سے رکھی گئی ہے۔ پھر جس حالت میں ارواح پرمیشر کی مخلوق ہی نہیں، تو پھر ان کی فطرتی محبت پرمیشر سے کیوں کر ہوسکتی ہے اور کب اور کس وقت پرمیشر نے ان کی فطرت کے اندر ہاتھ ڈال کر یہ محبت اس میں رکھ دی۔ یہ چیز غیر ممکن ہے۔ وجہ یہ کہ فطرتی محبت اس محبت کا نام ہے، جو فطرت کے ساتھ ہمیشہ سے لگی ہوئی ہو اور بعد میں نہ لاحق ہو، جیسا کہ اس کی طرف اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں اشارہ فرماتا ہے، جیسا کہ اس کا یہ قول ہے۔ **الست بربکم قالوا بلیٰ** ۔یعنی میں نے روحوں سے سوال کیا کہ کیا میں تمہارا پیدا کنندہ نہیں ہوں۔تو روحوں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں۔ اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ انسانی روح کی فطرت میں یہ شہادت موجود ہے کہ اس کا پیدا کنندہ خدا ہے۔ پس روح کو اپنے پیدا کنندہ سے طبعاً وفطرتاً محبت ہے، اس لئے کہ وہ اسی کی پیدائش ہے۔ اسی طرف اس دوسری آیت میں اشارہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔**فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا** ۔یعنی ارواح کا خدا وحدہ لاشریک کا طلبگار رہنا اور بغیر خدا کے وصال کے کسی چیز سے سچی خوشحالی نہ پانا، یہ انسانی فطرت میں داخل ہے، یعنی خدا نے اس خواہش کو انسانی روح میں پیدا کر رکھا ہے، جس کے سبب انسانی روح کسی چیز سے تسلی اور سکینت بجز وصال الٰہی کے نہیں پاسکتی۔ پس اگر انسانی روح میں یہ خواہش موجود ہے، تو ضرور ماننا پڑتا ہے کہ روح خدا کی پیدا کردہ ہے، جس نے اس میں یہ خواہش ڈال دی ہے۔

بموجب آریہ سماج کے اصول کے ان کا پرمیشر اپنی ازلیت ابدیت میں وحدہ لاشریک نہیں اور اس صفت میں تمام روحیں اس کی شریک ہیں۔ اور نیز وہ ارواح اور ذرات عالم کا پیدا کرنے والا نہیں اور نہ اس میں صفت رحمانیت پائی جاتی ہے اور نہ صفت رحیمیت۔ اور نہ وہ مالکوں کی طرح جزا و سزا دینے پر قادر ہے۔ لہٰذا وہ کسی قسم کی عبادت کا مستحق نہیں اور نہ اس میں کوئی خوبی ہے۔ آریہ کے اصول کے بموجب ثابت نہیں ہوتا کہ پرمیشر موجود بھی ہے۔ کیونکہ جب وہ پیدا کرنیوالا ہی نہیں، تو کس دلیل سے اس کا موجود ہونا شناخت کیا جائے۔

کیا روح کے حال سے کوئی واقف ہوسکتا ہے؟

یہ جو بحوالہ ایک قرآنی آیت کریمہ کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ روح کے حال سے کوئی واقف نہیں ہوسکتا، اس کا جواب ہم ذیل میں عرض کرتے ہیں۔ آیت یہ ہے۔ **وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الرُّوۡحِ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ وَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا** ۔ترجمہ۔اے نبی تجھ سے (یہودی) روح کا حال پوچھتے ہیں، تو کہہ دے کہ روح میرے پروردگار کے امر کی چیز ہے اور تم کو صرف

تھوڑا علم دیا گیا ہے۔حضرت عبداللہ ابن مسعود کی روایت سے اعمش نے وَ مَا اُوتُوا مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا پڑھا ہے، یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں یہودیوں سے خطاب ہے، جنہوں نے روح کا حال دریافت کیا تھا۔اس آیت میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ امت مرحومہ میں سے کوئی روح کا حال جانتا ہی نہیں، جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے اور یہ بھی ضرور نہیں کہ شرع نے جس چیز کا کوئی حکم بیان نہ کیا ہو، وہ معلوم ہی نہ ہو سکے۔ بلکہ شرع میں اکثر اس وجہ سے سکوت اختیار کیا جاتا ہے کہ اشکال کی وجہ سے عام لوگ اس کے برتاؤ کے قابل نہیں ہوا کرتے ، اگر چہ بعض اس کو سمجھ سکتے ہیں۔

جاننا چاہئے کہ روح کے متعلق اولاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حیوان میں زندگی کا باعث ہوا کرتی ہے۔ جب حیوان میں روح ڈال دی جائے ،تو وہ زندہ ہو جاتا ہے اور جب نکال لی جاتی ہے،تو وہ مر جاتا ہے۔اس کے بعد غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بدن میں ایک لطیف بھاپ ہے، جو اخلاط کے خلاصہ سے پیدا ہوتی ہے، جیسے حس کرنے کی یا حرکت کرنے کی۔اس میں وہ سب قوتیں ہوتی ہیں، جو تدابیر غذا کے متعلق ہیں۔طب کے احکام کو اس بھاپ سے بڑا تعلق ہے۔ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بھاپ کے رقیق ہونے کا اور غلیظ ہونے کا، صاف اور مکدر ہونے کا بدنی قوتوں پر اور ان افعال پر، جو ان قوتوں سے پیدا ہوتے ہیں، بڑا اثر پڑتا ہے۔اگر اس عضو پر یا اس بھاپ کے پیدا ہونے پر، جس کو عضو سے تعلق ہے، کوئی آفت پہنچتی ہے،تو وہ بھاپ بگڑ جاتی ہے اور اس کے کام مختل اور پریشان ہو جاتے ہیں۔اس بھاپ کی موجودگی سے زندگی باقی رہتی ہے اور اس کے تحلیل ہو جانے سے موت ہو جاتی ہے۔ بادی النظر میں روح اسی کا نام ہے، مگر بغور نظر معلوم ہوتا ہے کہ یہ روح کا ادنیٰ طبقہ ہے۔ بدن میں اس کی مثال ایسی ہے، جیسے گلاب میں خوشبو اور کوئلہ میں آگ۔

پھر جب زیادہ غور کیا جاتا ہے،تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ روح روح حقیقی کا مرکب ہے۔اور روح حقیقی کے بدن سے متعلق ہونے کا مادہ ہے۔ حقیقی روح ایک جداگانہ چیز ہے۔ وہ ایک نورانی نقطہ ہے۔ اور جو روح ہوائی بدن سے مرکب ہے، وہ عالم قدس کا ایک روزن ہے۔ جب ہوائی روح میں قابلیت اور استعداد پیدا ہو جاتی ہے،تو اس سے روح حقیقی مل جاتی ہے۔

انسان وحیوانات کی روحوں میں فرق

انسانی روح انسان کے مرنے کے بعد باقی رہتی ہے، جبکہ حیوانات کی روحیں انکے مرنے کے بعد باقی نہیں رہتی ہیں۔انسان کی عقل وتمیز اور اسکی بناوٹ، اسکی خوراک ولباس، اسکی ہر ایک طرز وروش، اسکی بود و باش و مشیت اور اس کے لئے نزول شریعت اور اس کا کسی نہ کسی رنگ واعتقاد کا پیرو و پابند ہونا

اوراس کا اپنی زندگی میں ہی اپنے مرنے کے بعد کیلئے اپنی اولاد واحفاد کے باقی وزندہ رہنے کا خیال اور آرزو کافی شہادتیں ہیں اس امر پر کہ انسان کی روح دوسرے حیوانات کی روح سے اعلیٰ وافضل ہے اور انسان کے مرنے کے بعد باقی رہنے والی ہے اور عذاب وثواب کی مستحق وسزاوار ہے۔ حیوانات کی طرز زندگی اور انکی خوراک اور انکی ہیئت اوران پر شریعت کا عدم نزول اور انکا غیر مکلّف ہونا اور انکے اجسام کی ترکیب کافی شہادت اس امر پر ہیں کہ حیوانات کی روحیں انکے مرنے کے بعد باقی نہیں رہتیں۔

انسان کے مرنے کے بعد اس کی روح کے باقی رہنے کا راز

سوال ۔جبکہ روح مخلوق ہے اور ہر مخلوق وحادث فنا پذیر ہے، پس انسان کے مرنے کے بعد اس کی روح کے باقی رہنے پر کیا دلیل ہے؟

جواب ۔واضح ہو کہ موت روح حیوانی کے بدن سے جدا ہونے کا نام نہیں ہے۔ جب مضعف امراض سے روح ہوائی تحلیل ہو جاتی ہے، تو یہ حکمت الٰہی کا اقتضا ہے کہ روح ہوائی اس قدر باقی رہ جائے کہ روح قدسی کا اس سے تعلق رہ سکے، جیسا کہ تم شیشے سے ہوا کو چوس لیتے ہو، تو حتی الامکان اس میں **تخلخل** (vacuum) پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر تم اس کے بعد ہوا کو نکال نہیں سکتے، یہاں تک کہ آخیر میں شیشہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ صرف اس راز کی وجہ سے ہے، جو خدا نے ہوا کی طبیعت اور سرشت میں رکھا ہے۔ ایسے ہی روح ہوائی ایک راز اور اندازہ ہے کہ اس سے تجاوز نہیں ہو سکتا۔

مرنے کے بعد روح ہوائی کو از سر نو زندگی ہوتی ہے اور روح الٰہی کے فیضان سے ان امور میں، جو حس مشترک کے ذریعہ سے اس میں باقی رہ گئے تھے، ایک طاقت جدید پیدا ہوتی ہے اور عالم مثال یعنی اس قوت کے ذریعہ سے، جو کہ مجرد اور محسوس کے مابین ہے اور افلاک میں پھیلی ہوئی ہے، اس کی امداد سے وہ روح ہوائی نورانی یا تاریک لباس پہن لیتی ہے اور اس طرح عالم برزخ کے عجائبات نمودار ہو جاتے ہیں۔ پھر جب ان میں روح ڈالی جائیگی، ویسا ہی فیضان پھر ہوگا، جیسا کہ ابتداء میں ہوا تھا جب روحیں بدنوں میں ڈالی گئیں تھیں اور عالم موالید کی بنیاد قائم کی گئی تھی۔ عالم آخرت میں روح قدسی کے فیضان سے روح ایک جسمانی لباس یا ایسا لباس، جو عالم مثال اور جسم کے بین بین ہوگا، پہن لے گی اور جو کچھ صادق مصدوق علیہ افضل الصلوٰت والتحیات نے خبریں بیان کی ہیں، سب معرض میں آئیں گی۔

خدا تعالیٰ کی مبارک زبان عربی میں بالخصوص قرآن کریم میں انسان کی موت کے لئے لفظ **توفی** استعمال ہوا ہے۔ اوراس میں بھید یہ ہے کہ یہ لفظ ان لوگوں کے خیالات کی تردید کرنے کے لئے الٰہی کلام میں وارد ہوا ہے، جو انسان کے مرنے کے بعد اس کی روح کے باقی رہنے کے قائل نہیں ہیں،

کیونکہ لفظ **توفی** **استیفاء** سے نکلا ہے اور اس میں اس امر کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد کچھ اس میں سے لیا جائے۔ اور لیا جانا باقی رہنے پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ جو چیز نیست و نابود ہو جائے، وہ نہ لی جاتی ہے اور نہ پکڑی جاتی ہے۔ یہ بات قرآن کریم کے علوم غامضہ میں سے ہے، کیونکہ قرآن نے اہل عرب کو اپنی مبارک الہامی زبان کی طرف توجہ دلا کر بتا دیا کہ انسان کے مرنے کے بعد اس کی روح باقی رہتی ہے اور قیامت کی جزا و سزا ضرور ہوگی، تا کہ وہ دہریت اور طبعی اعتقاد سے بچے رہیں۔

جبکہ روح مخلوق ہے، تو پھر اس کے نہ مرنے کی کیا وجہ ہے؟

قرآن شریف نے ہمیں سکھایا ہے کہ جیسا خدا نے ارواح کو پیدا کیا، ایسا ہی وہ ان کے معدوم کرنے پر بھی قادر ہے۔ اور انسانی روح اس کی موہبت اور فضل سے ابدی حیات پاتی ہے، نہ اپنی ذاتی قوت سے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اپنے خدا کی پوری محبت اور پوری اطاعت اختیار کرتے ہیں اور پورے صدق اور وفاداری سے اس کے آستانہ پر جھکتے ہیں، اس کو خاص طور پر ایک کامل زندگی بخشی جاتی ہے اور ان کے فطرتی حواس کو بھی بہت تیزی عطا کی جاتی ہے۔ اور ان کی فطرت کو ایک نور بخشا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ایک فوق العادت روحانیت ان میں جوش مارتی ہے۔ اور تمام روحانی طاقتیں، جو وہ دنیا میں رکھتے تھے، موت کے بعد اور بھی وسیع کی جاتی ہیں۔ اور وہ اپنی خداداد مناسبت کی وجہ سے، جو وہ حضرت عزت میں رکھتے ہیں، آسمان پر اٹھائے جاتے ہیں، جس کو شریعت کی اصطلاح میں رفع کہتے ہیں۔ لیکن جو مومن نہیں اور خدا تعالیٰ سے صاف تعلقات نہیں رکھتے، ان کو یہ زندگی نہیں ملتی اور نہ یہ صفات ان کو حاصل ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ لوگ مردہ کے حکم میں ہوتے ہیں۔ مرنے کے بعد وہ صرف عذاب اٹھانے کے لئے زندہ ہوں گے۔ اسی بھید کی طرف خدا تعالیٰ کا اشارہ ہے۔ **وَمَنْ يَّأْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى**۔ یعنی جو شخص مجرم بن کر خدا کے پاس آئیگا، اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ وہ اس میں نہ مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔ مگر جو لوگ خدا کے محبّ ہیں، وہ موت سے نہیں مرتے، کیونکہ ان کا پانی اور ان کی روٹی ان کے ساتھ ہوتی ہے۔

ابطال تناسخ

تناسخ کا مسئلہ تب قائم رہ سکتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ کو اس کے مختارانہ کاموں اور ارادی قدرتوں سے اور اختیاری تصرفات سے اور ذاتی طاقتوں سے ازل سے ابد تک معطل اور بیکار اور عاجز اور لاچار سمجھا جائے۔ پس اس سے ظاہر ہے کہ تناسخ کا مسئلہ خدا تعالیٰ کے قانون قدرت کا ضد پڑا ہوا ہے۔ اور

ضد بھی ایسی کہ ایک کے ماننے سے دوسرا قائم نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اگر خدا تعالیٰ کے قادرانہ تصرفات کو دیکھا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ اس نے تمام اجرام علوی اور اجسام سفلی کو پیدا کر کے اجزائے عالم کو باہم انضباط بخشا ہے اور محض اپنی قدرت کاملہ سے اور اپنے ہی ارادہ اور مشیت سے تمام مادی و غیر مادی چیزوں کو ایک پر حکمت سلسلہء نظام میں خود اپنی حکیمانہ مصلحت سے منسلک کیا ہے، تو یہی مان لینا، جس کا نام دوسرے لفظوں میں قانون قدرت ہے، آریہ اصول تناسخ کی بیخ کنی کرتا ہے۔ وجہ یہ کہ آریوں کا مسئلہ تناسخ اس بنا پر کھڑا ہے کہ یہ ترتیب عالم، جو بالفعل موجود ہے، پرمیشر کے ارادے اور قدرت سے نہیں اور نہ اس کی حکمت اور مصلحت سے، بلکہ گنہگاروں کے گناہوں نے یہ مختلف صورتوں کی چیزیں پیدا کر دی ہیں، جس میں خدا کا ذرہ دخل نہیں۔ مثلاً گائے، جو دودھ دیتی ہے، اور گھوڑا، جو سواری کے کام آتا ہے، یا گدھا، جو بوجھ اٹھاتا ہے، یا زمین، جس پر ہم آباد ہیں، یا چاند اور سورج، جو چمکتے ہوئے چراغ اپنی مختلف قوتوں اور خاصیتوں سے انواع اقسام کے فوائد دنیا کو پہنچاتے ہیں، یا گیہوں اور چنے اور چاول وغیرہ ماکولات، جن کو ہم کھاتے ہیں، یہ سب بقول آریوں کے حقیقت میں انسانی روحیں ہیں، جنہوں نے کسی جنم گذشتہ کی شامت سے بطور تناسخ یہ صورتیں اختیار کر لی ہیں۔ اور یہ سارا مجمع مختلف چیزوں کا، جو زمین و آسمان میں نظر آتا ہے، یہ سب حسب اصول آریاں اتفاقی ہے، جس میں پرمیشر کے ارادہ اور قدرت کا سر مو دخل نہیں اور نہ اس کو ان چیزوں کے زیادہ یا کم کرنے یا موجود یا معدوم کرنے میں ایک ذرہ اختیار ہے۔ آریوں کے خیال میں یہ جما ہوا ہے کہ اگر انسانی روحیں مرتکب گناہوں کی نہ ہوتیں، تو یہ چندیں ہزار عالم مخلوقات، جو نظر آ رہا ہے، ان میں سے ایک بھی نہ ہوتا۔ گویا ہر ایک آرام دنیا کا بزعم آریوں کے بدکاریوں سے ہی میسر آتا ہے اور تمام دنیوی نعمتوں کے حاصل کرنے کا اصل موجب بدکاریاں ہی ہیں۔ کوئی شخص گناہ کرے اور گائے کہ جنم میں آئے، تو آریئے دودھ پئیں۔ پھر کسی بدکاری سے گھوڑی کا جنم لے، تو آریوں کو سواری میسر ہو۔ اور پھر کسی معصیت سے گدھے یا خچر یا اونٹ کی جون میں پڑے، تو آپ کی باربرداری کا کام چلے۔ پھر اگر کوئی ایسا برا کام کرے، جس کی سزا میں اس کو عورت کی جون میں ڈالا جائے، تو آپ لوگوں کو جورو نصیب ہو۔ اور اگر کوئی شخص کسی شامت گناہ سے مرے، تب وہی روح اس کی بیٹا یا بیٹی بن کر آپ کو صاحب اولاد بنائے۔ اس لئے کہ بموجب اصول آریوں کے تمام سلسلہ خدائی کا گناہوں کے طفیل چل رہا ہے، اگر گناہ ظہور میں نہ آتے، تو پرمیشر تو کچھ چیز ہی نہ تھا۔

بموجب آریوں کے، جو لوگ نہایت درجہ کے ذلیل گناہ کرتے ہیں، وہ کیڑے مکوڑے اور

حشرات الارض بنتے ہیں۔اورانسان کی جون ان کوملتی ہے،جن کا گناہ کچھ خفیف ہو۔اب ایک عقلمند سوچ سکتا ہے کہ اگر یہ بات صحیح ہوتی،تو اس سے لازم آتا کہ کیڑے مکوڑوں کا کثرت سے پیدا ہونا ہمیشہ کثرت گناہ کے تابع ہو۔حالانکہ یہ بات بداہت نظر سراسر باطل معلوم ہوتی ہے، کیونکہ خداتعالیٰ کا قانون قدرت صاف صاف دیکھا جاتا ہے کہ اکثر کیڑے مکوڑے اور مینڈکیں اور چھوٹے چھوٹے پردار اور دوسرے جانور موسم برسات میں ہی پیدا ہوتے ہیں،تو کیا اب یہ خیال ہوسکتا ہے کہ ہمیشہ خلقت خدا کی برسات کے دنوں میں ہی کثرت سے گناہ کرتی ہے کسی اور دنوں میں نہیں کرتی۔دیکھو یہ عقیدہ کس قدر علم طبعی کے برخلاف ہے۔پاکیزگی کے لحاظ سے تناسخ کا مسئلہ کیا خراب ہے کہ جب کوئی لڑکی پیدا ہوتی ہے،تو کیا اس کے ساتھ کوئی فہرست بھی اندر سے نکلتی ہے،جس سے معلوم ہو کہ یہ لڑکی فلاں مرد کی ماں یا دادی یا ہمشیرہ ہے،اس سے وہ شادی کرنے سے پرہیز کرے۔

آریوں نے تناسخ کو گناہ کا باعث قرار دیا ہے۔پس لازم ہے کہ مجرم کو بوقت ولادت گناہ کی واقفیت ہو،تا کہ آیندہ وہی گناہ کر کے اس کو اسی جون میں نہ جانا پڑے۔حالانکہ جب انسان ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے،تو اسکو جنم کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔تناسخ کے مسئلہ جیسا اور کوئی جھوٹا مسئلہ نہیں، کیونکہ اسکی بنیاد غلط ہے اور آزمائش کے طور پر بھی یہ غلط ثابت ہوتا ہے۔اور انسانی پاکیزگی کے لحاظ سے بھی غلط ٹھہرتا ہے۔اور خدا کی قدرت میں رخنہ انداز ہونیکی وجہ سے بھی عارف کا فرض ہے،جو اسکو غلط سمجھے۔

اس کی بنیاد اس طرح پر غلط ہے کہ ستیارتھ پرکاش میں بتلایا گیا ہے کہ روح عورت کے پیٹ میں اس طرح پر پڑتی ہے کہ شبنم کے ساتھ کسی ساگ پات پر پڑتی ہے اور اس ساگ پات کے کھانے سے روح بھی ساتھ کھائی جاتی ہے۔پس اس سے تو لازم آتا ہے کہ روح دوٹکڑے ہو کر زمین پر پڑتی ہے۔ایک ٹکڑے کو اتفاقاً مرد کھالیتا ہے اور دوسرے ٹکڑے کو عورت کھاتی ہے، کیونکہ یہ ثابت شدہ مسئلہ ہے کہ بچہ کو روحانی قوتیں اور روحانی اخلاق مرد اور عورت دونوں سے ملتے ہیں نہ کہ صرف ایک سے۔ پس دونوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ ایسے ساگ پات کو کھاویں،جس میں روح ہو اور صرف ایک کا کھانا کافی نہیں۔پس ببداہت یہ امر مستلزم تقسیم روح ہے اور تقسیم روح باطل ہے۔اسلئے تناسخ باطل ہے۔

اور آزمائش کے طور پر یہ مسئلہ اس طرح پر غلط ٹھہرتا ہے کہ جس طرح ہر قسم کی روحیں پیدا ہوتی ہیں،ان تمام صورتوں میں ممکن ہی نہیں کہ شبنم کے ساتھ وہ روحیں پیدا ہوتی ہیں۔مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ بالوں میں جوئیں پڑ جاتی ہیں،وہ روحیں کس شبنم کے ساتھ کھائی جاتی ہیں۔ایسا ہی کنک کے کھاتوں میں سُسر پڑ جاتی ہے،وہ کروڑہا روحیں،جو کھاتہ کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں،وہ کس شبنم کے ساتھ کھاتہ کے

اندر اترتی ہیں اور کون ان کو کھاتا ہے۔ ایسا ہی ہم دیکھتے ہیں کہ پیٹ میں کدو دانے پڑ جاتے ہیں اور کبھی کبھی دماغ میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور طبعی علم کے تجربہ سے پانی کے ہر ایک قطرے میں ہزارہا کیڑے ثابت ہوتے ہیں، یہ کس شبنم سے پڑتے ہیں؟ علیٰ ہذا القیاس اور بھی صدہا دلائل تناسخ کے بطلان پر موجود ہیں۔ ہم نے یہاں بطور اختصار ان ہی چند دلائل پر اکتفا کیا ہے۔

آواگون کے پرستار لوٹنے کی ضروریات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ جن اسباب کے ماتحت کسی امر کو سرانجام پانا مقرر ہوتا ہے، اگر وہ پورا نہ ہو اور یہ منظور ہو کہ وہ امر ظہور پذیر ہو، تو ضرور ہے کہ اس کے لئے وہی اسباب پھر مہیا کئے جاویں۔ کیونکہ علت و معلول اور اسباب اور نتائج کا مسئلہ ایک مسئلہ حقہ ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جب انسان کو کمال حقیقی تک پہنچنے کے لئے یہاں بعض اسباب دیئے گئے ہیں، اب اگر مرنے کے وقت وہ کمال حقیقی کو نہیں پہنچا، تو چونکہ آنیوالے عالم میں وہ اسباب نہیں، لہٰذا ضرور ہے کہ ایسا انسان اس عالم میں لوٹایا جاوے اور انہیں اسباب کے ماتحت اپنے نقصوں کو رفع کرے۔ یہ بالکل درست ہے کہ جو اسباب ایک عالم میں خاص نتائج کے حصول کے لئے ہوں گے، وہ بالضرور دوسرے عالم میں مہیا نہیں ہو سکتے۔ لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ آئندہ عالم میں کوئی نئے اسباب اول کمیوں کو پورا کرنے کیلئے موجود ہیں یا نہیں۔ اس میں تو شک نہیں کہ ایک بات، جو اس عالم میں حاصل ہونی چاہئے، اس کے مناسب اور طبعی اسباب اسی عالم میں ہونگے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب ایک نتیجہ کے حصول کے لئے اسکے مقررہ عادیہ اسباب سے کام نہ لیا جاوے، تو دیگر اسباب سے بھی وہ نتیجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ ہاں ایک حد تک تکلیف ضرور اٹھانی پڑتی ہے۔ یہی حالت ہم انسانی شعور کے نشو و نما میں دیکھتے ہیں۔ جو باتیں بچپن میں آسانی سے سیکھی جاتی ہیں، اگر کوئی شخص انہیں عالم طفولیت میں حاصل نہ کرے، تو عالم شباب میں انہیں حاصل تو ضرور کریگا، البتہ محنت اور تکلیف اور خرچ ضرور بڑھ جاویگا۔

اسی طرح ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ عالم جسمانیات میں نظارہ قدرت ہم کو کیا دکھلاتا ہے۔ یہ جو ہر ایک انسان عالم خاک سے لیکر موجودہ عالم تک ہزار در ہزار عالم طے کرتا ہے، اس سفر میں یہ طریق ہے کہ جب تک اس عالم میں انسان اپنی کامل صورت پیدا نہ کر لے، دوسرے عالم میں اسے جگہ نہیں ملتی یا ایسا ہوتا ہے کہ جن حالتوں میں اس نے ایک عالم میں کامل طور پر پختگی حاصل نہیں کی اور خام حالت میں بھی اس نے اس عالم کو چھوڑا ہے، تو اسکی خامی اور نقص دوسرے عالم میں درست ہو جاتے ہیں۔

اب اگر ذرا بھی ان مختلف عالموں پر غور کیا جاوے، تو ان سب عالموں میں ایک لاتبدیل قانون نظر آویگا کہ جس کے رو سے ایک عالم کے نقص اس سے اگلے عالم میں ایک گونہ تکلیف کے ساتھ

رفع کئے جاتے ہیں۔اور یہ کبھی نہیں ہوا کہ جس شئے نے ناقص حالت میں ایک عالم کو چھوڑا ہے، وہ ضرور اپنے نقصوں کے علاج کے لئے پھر اسی چھوڑے ہوئے عالم میں لوٹائی جاوے۔مثلاً جو کچھ آج میں نے کھایا وہ ضرور ہے کہ یا تو نیچر کے ہاتھوں سے پختہ ہو چکا ہو، یا انسانی ہاتھ نے اسے آگ پانی مصالح وغیرہ کے ذریعہ ایک خاص حالت پختگی تک پہنچایا ہوا ہو، تا کہ معدہ کے عالم میں وہ عمدہ طور پر کام کر کے اگلے عالم میں چلا جاوے۔لیکن یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی بداحتیاطی سے بعض چیزیں ایسی حالت میں ہی معدہ میں چلی جاتی ہیں، جس حالت میں کہ وہ وہاں نہیں جانی چاہئیں تھیں۔اب اگر اس نے جزو بدن بننا ہوتا ہے، تو اس خام حالت کے محسوس ہو جانے پر عالم معدہ میں ادویات بھیج کر ایسے اسباب معدہ میں ہی پیدا کر دیئے جاتے ہیں، جہاں اس کا نقص عالم معدہ میں ہی رفع ہو جاوے۔یہ ضروری نہیں کہ وہ چیز معدہ سے واپس کی جاوے۔اسی طرح جب معدہ کے بعد بہت سے عالم طے کر کے ایک خوراک خون میں بدل جاتی ہے، تو ضرور نہیں کہ ہر انسان میں ہمیشہ خون صالح ہی پیدا ہوتا ہے۔جو خوراک عمدہ پختہ حالت میں معدہ میں گئی اور معدہ میں اچھی طرح ہضم ہوئی، تو اس سے تو خون صالح پیدا ہوگا۔لیکن بعض انسانوں میں خون صالح پیدا نہیں ہوتا۔اس کا باعث یہی ہے کہ ہماری خوراک نے عالم خون سے سابقہ جتنے عالم طے کئے ہیں، وہ ناقص حالت میں طے کئے ہیں۔لیکن اس ناقص حالت کی اصلاح عالم خون میں ہی طبیب کر دیا کرتے ہیں۔یہ نہیں کہ ناقص خون کو سابقہ عالموں میں واپس کیا جاوے۔اسی طرح جس انسان کے نطفہ میں نقص ہوتا ہے، اسکا یہی باعث ہے کہ جو خوراک نطفہ کی صورت میں آتی ہے، اس نے پہلے عالموں کو نقص حالت میں طے کیا ہوتا ہے۔لیکن اس کی اصلاح عالم نطفہ میں بھی ہو سکتی ہے۔اسی طرح عمدہ اور مضبوط جنین کے لئے ضروری ہے کہ عورت اور خاوند دونوں کا عمدہ اور مضبوط نطفہ ہو۔لیکن رقیق نطفے بھی رحم میں جا کر قرار پکڑ لیتے ہیں اور ان کا علاج رحم کی حالت میں کر لیا جاتا ہے۔اسی طرح بعض جنینوں کی پرورش رحم میں پورے طور پر نہیں ہوتی۔اور وہ ناقص خلقت ہی لے کر دنیا میں آ جاتے ہیں۔مثلاً ہم نے دیکھا ہے کہ بعض بچوں کے بول و براز کے سوراخ پیدائش کے وقت بند ہوتے ہیں۔کیونکہ عالم نیچر میں نیچر پورا کام نہیں کر سکی۔پھر ایسے بچوں کے سوراخ سرجن چاقو سے کھول دیا کرتے ہیں۔اور وہ بچے اپنی خلقت میں کامل ہو جاتے ہیں یا پھر یہ بھی مانا جا سکتا ہے کہ بعض ایسے بھی ناقص الخلقت پیدا ہوتے ہیں کہ ساری عمر ان کا نقص رفع نہیں ہو سکتا۔لیکن نہ نہیں ہوا کہ وہ ناقص خلقت بچے اس عالم میں داخل ہی نہ ہوں یا رفع نقص کے لئے سابقہ عالم میں لوٹائے جاویں۔سماجک تھیوری تو اس صورت میں درست ہوتی کہ جب نظارہ قدرت ہم کو یہ دکھلاتا کہ ان مذکورہ عالموں

میں کبھی کسی چیز کو عالم مابعد میں نہیں بھیجا گیا، جب تک موجودہ عالم میں وہ کامل نہیں ہوگئی یا اگر وہ ناقص حالت میں چلی بھی گئی، تو فوراً واپس کی گئی۔ مثلاً یا تو دنیا میں کوئی بچہ ناقص الخلقت لے کر پیدا ہی نہ ہو اور اگر ناقص اتفاقاً پیدا ہو جاوے، تو اسے فوراً اسی جگہ واپس کیا جاوے، جہاں سے وہ آیا تھا تاکہ وہ نقص، جو وہ لیکر آیا ہے، وہاں ہی جا کر رفع کرے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ کامل ناقص ہر دو قسم کی چیزیں ایک عالم سے دوسرے عالم میں آ جاتی ہیں اور ایک عالم کے نقص دوسرے عالم میں رفع ہو جاتے ہیں۔ یہ بالکل سچ ہے، جیسے کہ اوپر آ چکا ہے۔ کہ انسان کی ہر حالت کے نشو ونما کے طبعی اسباب ہر عالم میں الگ الگ ہیں۔ اور کامل مکمل نشو ونما کے لئے ضروری ہے کہ ہر ایک عالم سے وہ رخصت اس وقت ہو، جب مکمل ہو جاوے۔ لیکن نظارہء قدرت نے دکھلا دیا ہے کہ آئندہ عالم بھی سابق عالم کے نقصوں کو بیشک رفع کر سکتا ہے۔ ہاں ایسا ہونا بہت ہی تکلیف و درد کا موجب ہوتا ہے۔ جب صحیفہء قدرت ہمارے سامنے یہ نقشہ پیش کرتا ہے اور گذشتہ عالموں میں انسان کا گذرنا اس طرح واقع ہوا ہے، تو اس موجودہ عالم سے مابعد عالم کے متعلق یہ کیوں تسلیم کیا جاوے کہ جو انسان مرنے کے وقت کامل نہیں ہوا، وہ پھر اسی عالم میں جنم لیکر اپنے نقصوں کو رفع کرے۔ یہ کیوں نہ ہم تسلیم کر لیں کہ جس طرح ناقص خوراک کی اصلاح معدہ میں الائچی وغیرہ کر دیا کرتی ہے اور عمدہ غذا ہضم نہ ہونے سے، جو ناقص خون پیدا ہوتا ہے، اس کے لئے مصفیات و مولدات خون استعمال ہو جاتی ہیں۔ اور اگر خون کی اصلاح نہیں ہوئی، تو ناقص خون نے، جو کمزور نطفہ پیدا کیا ہے، اس کے واسطے مغلظات اسباب نیچر نے پیدا کر رکھے ہیں۔ پھر رحم کی اصلاح کے لئے مانع اسقاط ادویات وغیرہ وغیرہ موجود ہیں۔ اور آخرکار جو بچہ خلقی نقص اپنے ہمراہ لاتا ہے، ان نقصوں کو کڑوی ادویات اور تلخ دارو اور قسما قسم کے بد ذائقہ جلاب اور طرح طرح کی سرجنی چیر پھاڑ درست کر دیا کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہماری روح نے اپنے کمال حقیقی کو حاصل نہیں کیا، تو یہ بالکل مذکور بالا مشاہدہء قدرت کے برخلاف ہے کہ وہ روح پھر اسی جسم میں جنم لے۔ ہاں وہ ناقص روح ایک مریض اور کمزور روح ہے، جو عالم بالا میں چلی گئی ہے۔ لیکن وہ عالم بالا کی تندرست زندگی کے لئے کامل سامان اپنے ہمراہ نہیں لے کر گئی۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس عالم میں داخل ہوتے ہی اس عالم کے شفاخانہ میں اسے داخل کیا جاوے اور جس قسم کی روحانی مرض اس کو لگی ہوئی ہو، اس کے مناسب حال اس شفاخانہ کے وارڈوں میں وہ داخل ہو، جہاں وہ طرح طرح کے جلابوں اور پسینہ آور دواؤں کے استعمال سے اور طرح طرح کے نشتروں اور چاقوؤں کے نیچے آ کر قسما قسم کے دکھ اور درد دیکھنے کے بعد پھر اصلاح پذیر ہو کر تندرستی حاصل کرے۔ اور اس طرح عالم بالا کی زندگی کے قابل ہو کر ترقیات کرتا ہوا

اپنے کمال تک پہنچ جاوے۔

پیارے دوستو۔قرآنی دوزخ یہی شفا خانہ ہے (جس پر آپ میں سے بعض لوگ ہنسا کرتے ہیں اور) جس میں بیمار روح نے جا کر اپنی اصلاح کرنی ہے۔جس طرح ہماری غلط کاریاں ہم میں جسمانی امراض پیدا کر کے ہماری یہ زندگی ایک طرح کا دوزخ کر دیتی ہیں، ہو بہو اسی طرح انسان اپنے دوزخ کے اسباب اسی زندگی سے لیجاتا ہے۔وہ دوزخ اسی دنیا میں خود تیار کرتا ہے۔خدا تعالیٰ کی آگ اس پر پڑ کر اور اس کو طرح طرح کی تکالیف میں ڈال کر اس کو پاک صاف کر دیتی ہے۔اس عذاب کی آگ کو خود انسانی روح اپنی صفائی کے لئے کھینچتی ہے۔

اگر ہم ان تمام گناہوں کی جماعت بندی کریں، جو انسانوں سے ظاہر ہوئے یا سرزد ہو رہے ہیں، تو ہم کو صاف صاف نظر آویگا کہ کل کے کل گناہوں کا ظہور یا ان کے مقدمات کا پیدا ہونا ہر ایک انسان کے سات جوارح کے ذریعہ ہوا ہے۔یعنی سر، کان، آنکھ، ناک، منہ، ہاتھ اور پاؤں۔اسی طرح ان تعالیٰ نے انسان کو سات سوراخ عطا کئے ہیں اور قرآن نے تہذیب انسانی کے حاصل کرنے کے لئے ہمیں سات سوراخوں کی حفاظت کے لئے سخت تاکید کی ہے۔کوئی گناہ ایسا نہ ہوگا، جس کی جڑ اور جس کا ظہور ان سات سوراخوں میں سے کسی ایک یا زیادہ سوراخوں کے ناجائز استعمال سے نہ ہو۔

الغرض انسان نے گناہ کر کے اس طرح سات ہی قسم کے مرضوں میں سے ایک یا زیادہ مرض اپنی روح کو لگا دی ہیں۔اب اگر ایک انسانی روح، جو ان سات مرضوں میں سے ایک یا ساری مرضوں کو لے کر دوسرے عالم میں داخل ہوئی ہے اور اپنی مرضوں کے باعث عالم بالا کی صحت والی زندگی کے قابل نہیں، تو اس صحت کے حصول کے لئے بھی ضرور ہے کہ وہ کسی ایسے علاج خانہ میں داخل ہو، جس کے سات ہی وارڈ ہوں۔چنانچہ قرآن کریم نے جس علاج خانہ کا نام دوزخ رکھا ہے، اس کے بھی سات ہی وارڈ یا طبقات بیان کئے گئے ہیں، جہاں گناہگاروں کی روح کو ان کے گناہوں سے پاک کیا جاویگا۔ جہاں ان کو تھور (زقوم) جیسے قے آور دست آور چیز جلاباً دی جاویگی، جہاں ان کے روحانی استفراغ کے لئے کھولتا ہوا پانی پلایا جاویگا، جہاں ان کو آتشین ٹکوریں کی جاویں گی۔ جہاں شداد غلاظ فرشتے آتشیں گرزوں سے ان کی کجیوں کو درست کریں گے۔ جہاں ان کے گندے زخم دور کئے جاویں گے۔ اور انگور کی حالت تک ان کے جسم کی کئی جلدیں بدلیں گی وغیرہ وغیرہ۔اور یہ سب ایک خطرناک رنگ کا عذاب ہوگا۔ایک شخص جو اس دنیا میں زانی زندگی بسر کرتا ہے، آخر کار وہ آتشک جیسی مرض میں مبتلا ہو گا۔اب جو علاج اس کا تجویز کیا جاتا ہے، وہ بھی اپنی تلخی اور تکالیف کے لحاظ سے دوزخ سے کم نہیں ہوتا۔

یہی حالت دوزخ کی ہے۔ایک دوزخ تو وہ ہے، جو ہم اسی دنیا سے خود تیار کر کے لے گئے ہیں۔اور دوسرا اس کا تکلیف دہ علاج ہے جو ہماری طہارت اور پاکیزگی کے لئے ضروری ہے۔ایک گناہگار کا دوزخی بن جانا اس کی اپنی گناہ آلودہ زندگی کا تقاضا ہے۔اور دوزخ تو اس کے لئے شفیق مادر کی طرح ہے، جو اپنے بچہ کے نازک بدن کو زخموں اور پھوڑہ پھنسیوں سے پاک کرنے کے لئے سرجن کے دردناک چاقو کے نیچے رکھ دیتی ہے۔چنانچہ ایک اور موقعہ پر قرآن دوزخ کو ماں کر کے پکارتا ہے، جیسے کہ لکھا ہے۔**وامه هاویه**۔یعنی دوزخ گنہگاروں کی ماں ہے۔

انسان نے جس عالم کو دیکھا نہ ہو، اس کا بیان کرنا یا اس کو سمجھ لینا یا نہ دیکھی ہوئی چیزوں کو ذہن میں لے آنا محالات سے ہوتا ہے۔اسلئے ایسی حالت میں تشبیہات اور تمثیلات اور استعارات سے ہی کام لینا پڑتا ہے۔دوزخ یا بہشت کا عالم ایک آنے والا عالم ہے۔اس کی کیفیات ہمارے ذہن میں آنی مشکلات سے ہیں۔ان کی تشریح بھی اگر ہوسکتی ہے، تو استعارات سے ہی ہوسکتی ہے۔اس لئے قرآن نے دوزخ کا اس طور پر ذکر کیا۔اسلامی دوزخ کا علاج خانہ ہونا اس لئے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایک دن دوزخ پر وہ آوے گا جب اس میں کوئی انسان نہ ہوگا۔یہ وہ دوزخ نہیں، جس میں بقول عیسائیاں ہمیشہ کا رونا اور دانت پیسنا ہوگا۔اگر یہ علاج خانہ ہے، تو ضرور ہے کہ اس پر ایک دن ایسا آوے کہ مریض صحت پا کر اس سے نکلیں۔اسلئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک دن دوزخ پر وہ آویگا کہ جب اس کی آگ سرد ہو جاوے گی اور اس کے دروازے بادنسم سے کھٹکھٹائے جاویں گے، یعنی اس میں کوئی نہ ہوگا۔

قرآن نے عیسائیوں کی طرح دوزخ کو جیل خانہ تجویز نہیں کیا۔قرآن نے اس دنیا میں راستے کھول دیئے ہیں کہ جن پر چل کر انسان ایک کامل مکمل روح لے کر عالم بالا کو جاتا ہے۔انسانی نفس کی اسی حالت کا نام قرآن نے نفس مطمئنہ سے تعبیر کیا ہے۔جن اشخاص میں نفس مطمئنہ کی حالت پیدا ہوگئی ہے، ان پر دوزخ میں جانا حرام ہے۔چنانچہ وہ اس عالم کو چھوڑتے ہی بہشت میں جاوینگے۔قرآن شریف میں آیا ہے۔**یا ایتھا النفس المطمئنة .ارجعی الیٰ ربک راضیة مرضیة. فادخلی فی عبادی و ادخلی جنتی** ۔یعنی اے نفس آرام یافتہ، جو خدا سے آرام پا گیا، اپنے رب کی طرف واپس چلا آ، تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔پس میرے بندوں میں مل جا۔اور میرے بہشت کے اندر آجا۔

اب جس کی حالت نفس مطمئنہ تک نہیں پہنچی، وہ پیش ازیں کہ جنت میں جاوے ضرور ہے کہ اپنے اندر نفس مطمئنہ پیدا کر لے۔اور یہ نفس مطمئنہ پیدا نہیں ہوسکتا، جب تک نفس انسانی سے اس کی

امراض دور نہ ہولیں، جن کے لئے کچھ وقت دوزخ میں جانا ضروریات سے ہے۔ (ماخوذ)

محدود اعمال کے بدلہ میں آخرت میں غیر محدود سکھ و آرام ملنے کی وجہ

آریہ کہتے ہیں کہ چونکہ انسان کے اعمال محدود ہیں، اس لئے مکتی بھی محدود رکھی گئی ہے۔ ایسے لوگ دھوکہ کھاتے اور دھوکا دیتے ہیں، کیونکہ فطرت انسانی میں ہمیشہ کی اطاعت مرکوز ہے۔ نیک آدمی کب کہتے ہیں کہ اتنی مدت کے بعد ہم خدا تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت چھوڑ دیں گے۔ بلکہ اگر بے انتہا مدت تک ان کو عمر دی جائے، تب بھی وہ خدا تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی کرتے رہیں گے۔ اس صورت میں اگر وہ جلد مر جائیں، تو ان کا کیا قصور ہے۔ ان کی نیت میں تو ہمیشہ کی اطاعت ہے نہ کہ کسی حد تک۔ اور تمام مدار نیت پر ہے۔ موت جو انسان پر آتی ہے، یہ خدا کا فعل ہے نہ کہ انسان کا۔

سید الاعمال بالنیات گفت　　　نیت خیرت بسے گلہا شگفت

ابطال تثلیث والوہیت کفارہ مسیح ابن مریمؑ

چونکہ قرآن کریم نے اس گندے اعتقاد و خیال کا باطل ہونا بڑے شدّ ومدّ سے بیان فرمایا ہے، اس لئے ہمیں اس جگہ ابطال تثلیث و کفارہ مسیح علیہ السلام بھی لکھنا ضروری ہے۔

واضح ہو کہ تثلیث کا عقیدہ بھی عجیب عقیدہ ہے۔ کسی نے سنا ہے کہ مستقل طور اور کامل طور پر تین بھی ہوں اور ایک بھی ہو۔ اور ایک بھی کامل خدا اور تین بھی کامل خدا ہوں۔ عیسائی مذہب بھی عجیب مذہب ہے کہ ہر ایک بات میں غلطی اور ہر ایک امر میں لغزش۔

ان کی انجیلیں اس قدر بیہودگیوں کا مجموعہ ہیں، جو ان کا شمار کرنا غیر ممکن ہے۔ مثلاً ایک عاجز انسان کو خدا بنانا اور دوسروں کے گناہوں کی سزا میں اس کے لئے صلیب تجویز کرنا اور تین دن تک اس کو دوزخ میں بھیجنا۔ اور پھر ایک طرف خدا بنانا اور دوسری طرف کمزوری اور دروغ گوئی کی عادت کو اس کی طرف منسوب کرنا۔ چنانچہ انجیلوں میں بہت سے ایسے کلمات پائے جاتے ہیں، جن سے نعوذ باللہ حضرت مسیح علیہ السلام کا دروغ گو ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً وہ ایک چور کو وعدہ دیتے ہیں کہ آج بہشت میں تو میرے ساتھ روزہ کھولے گا۔ دوسری طرف وہ خلاف وعدہ اسی دن دوزخ میں جاتے ہیں اور تین دن دوزخ میں ہی رہتے ہیں۔ ایسا ہی انجیلوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ شیطان آزمائش کے لئے مسیح کو کئی جگہ لئے پھرا۔ یہ عجیب بات ہے کہ مسیح خدا بن کر بھی شیطان کی آزمائش سے بچ نہ سکا۔ اور شیطان کو خدا کی آزمائش کی جرات ہوگئی۔ یہ انجیل کے فلسفہ تمام دنیا سے نرالا ہے۔

اس جگہ ایک محقق انگریز نے یہ تاویل کی ہے کہ شیطان کے آنے سے مراد یہ ہے کہ مسیح کو تین مرتبہ شیطانی الہام ہوا تھا۔ مگر مسیح شیطانی الہام سے متاثر نہیں ہوا۔ ایک شیطانی الہاموں میں سے یہ تھا کہ مسیح کے دل میں شیطان کی طرف سے ڈالا گیا کہ وہ خدا کو چھوڑ دے اور محض شیطان کے تابع ہو جائے۔ مگر تعجب کہ شیطان خدا کے بیٹے پر مسلط ہوا اور دنیا کی طرف اس کو رجوع دیا، حالانکہ وہ خدا کا بیٹا کہلاتا ہے۔ اور پھر خدا ہونے کے برخلاف وہ مرتا ہے۔ کیا خدا بھی مرا کرتا ہے؟ اور اگر محض انسان مرا ہے، تو پھر کیوں یہ دعویٰ ہے کہ ابن اللہ نے انسانوں کے لئے جان دی۔ اور پھر وہ ابن اللہ کہلا کر قیامت کے وقت سے بھی بے خبر ہے، جب کہ سچ کا اقرار انجیل میں موجود ہے کہ وہ باوجود ابن اللہ ہونے کے نہیں جانتا کہ قیامت کب آئے گی۔ باوجود خدا کہلانے کے قیامت کے علم سے بے خبر ہونا کس قدر بیہودہ بات ہے۔ بلکہ قیامت تو دور ہے اس کو تو یہ بھی خبر نہیں کہ جس درخت انجیر کی طرف وہ چلا، اس پر پھل نہیں ہے۔

پھر ایک اور بات پر بھی غور کرو کہ خدا کا قدیم سے قانون قدرت ہے کہ وہ توبہ اور استغفار سے گناہ معاف کرتا ہے اور نیک لوگوں کی شفاعت کے طور پر دعا بھی قبول کرتا ہے۔ مگر ہم نے خدا کے قانون قدرت میں کبھی نہیں دیکھا کہ زید اپنے سر پر پتھر مارے اور اس سے بکر کا درد سر جاتا رہے۔ پھر ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ مسیح کی خودکشی سے دوسروں کی اندرونی بیماری کا دور ہونا کس قانون پر مبنی ہے۔ اور وہ کونسا فلسفہ ہے، جس سے ہم معلوم کرسکیں کہ مسیح کا خون کسی کی اندرونی ناپاکی کو دور کرسکتا ہے۔ بلکہ مشاہدہ اس کے برخلاف گواہی دیتا ہے۔ کیونکہ جب تک مسیح نے خودکشی کا ارادہ نہیں کیا تھا، تب تک عیسائیوں میں نیک چلنی اور خدا پرستی کا مادہ تھا۔ مگر صلیب کے بعد تو جیسے ایک بند ٹوٹ کر ہر ایک طرف دریا کا پانی پھیل جاتا ہے۔ یہی عیسائیوں کے نفسانی جوشوں کا حال ہے۔

ہاں دمے ہر دم کفارہ زنی — پس نہ مردستی کہ کمتراززنی
نسخہ سہل است گر یا بد سزا — زید و گردد بکر زاں نعلش رہا
لیک زیں نسخہ نمے یابی شفا — در ورقہائے زمین و آسماں
تا خدا بنیاد ایں عالم نہاد — ظالمے ہم ننگ دارد زیں فساد

اگر کفارہ کا مسئلہ سچ ہے اور یہی درست ہے کہ تمام دنیا کے گناہ حضرت عیسیٰؑ پر ڈالے گئے اور گناہ کی لعنت اور تاریکی گنہگاروں سے لی گئی اور حضرت عیسیٰؑ کے دل پر رکھی گئی، تو اس سے لازم آتا ہے کہ اس کاروائی کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے سوا ہر ایک کو پاک زندگی اور خدا کی معرفت حاصل ہوگئی ہو، مگر

نعوذ باللہ حضرت عیسیٰؑ کو گویا ایک ایسی لعنت کے نیچے دبایا گیا، جو کروڑ ہا لعنتوں کا مجموعہ تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ایک انسان کے گناہ اس کے ساتھ ہیں۔ اور فطرت نے جس قدر کسی کو کسی جذبہ نفسانی یا افراط و تفریط کا حصہ دیا ہے، وہ اس کے وجود میں محسوس ہو رہا ہے۔ گو وہ حضرت عیسیٰؑ کو مانتا ہے یا نہیں۔ تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جیسا کہ لعنتی زندگی والوں کی لعنتی زندگی ان سے علیحدہ نہیں ہوسکتی، ایسا ہی وہ حضرت عیسیٰؑ پر بھی نہیں پڑسکتی۔ کیونکہ لعنت اپنے محل پر خوب چسپاں ہے۔ تو ہو حضرت عیسیٰؑ کی طرف کیونکر منتقل ہوسکے گی۔ اور یہ عجیب ظلم ہے کہ ہر ایک خبیث اور ملعون کی لعنت حضرت عیسیٰؑ پر پڑے۔ اور اس شخص کو بری اور پاک دامن سمجھا جائے۔ پس ایسا غیر منقطع سلسلہ لعنتوں کا جو قیامت تک رہیگا، اگر وہ ہمیشہ تازہ طور پر غریب حضرت عیسیٰؑ پر ڈالا جائے، تو کس زمانہ میں اس کو لعنتوں سے سبک دوشی ہوگی۔ کیونکہ جب وہ ایک گروہ کی لعنتوں سے اپنے تئیں سبکدوش کر لیگا، تو پھر نیا آنے والا گروہ، جو خبیث وجود کے ساتھ نئی لعنتیں رکھتا ہے، وہ اپنی تمام لعنتیں اس پر ڈال دے گا۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اس کے بعد دوسرا گروہ دوسری لعنتوں کے ساتھ آئیگا۔ تو پھر ان مسلسل لعنتوں سے فرصت کیونکر ہوگی۔ اس سے تو ماننا پڑتا ہے کہ یسوع کے لئے وہ دن پھر کبھی نہیں آئیں گے، جو اس کو خدا کی محبت اور معرفت کے نور کے سایہ میں رکھنے والے ہوں۔ بلکہ ایسے عقیدہ سے اگر کچھ ثابت ہوا، تو وہ یہی ہے کہ ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کے ایک مقدس کو ایک غیر منقطع ناپاکی میں ڈالنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور بدقسمتی سے اس اصل بات کو چھوڑ دیا ہے، جس سے گناہ دور ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ آنکھ پیدا کرنا، جو خدا کی عظمت کو دیکھے، اور وہ یقین حاصل کرنا، جو گستاخی کی تاریکی سے چھڑا دے۔

مسیح علیہ السلام کا اپنی امت کے لئے مصلوب ہونا اور امت کے گناہ اس پر ڈالے جانا ایک ایسا مہمل عقیدہ ہے، جو عقل سے ہزاروں کوس دور ہے۔ خدا کی صفات عدل اور انصاف سے یہ بہت بعید ہے کہ گناہ کوئی کرے اور سزا کسی دوسرے کو دی جائے۔ غرض یہ عقیدہ غلطیوں کا ایک مجموعہ ہے۔ خدائے واحدہٗ لاشریک کو چھوڑنا اور مخلوق کی پرستش کرنا عقلمندوں کا کام نہیں ہے اور تین مستقل اور کامل اقنوم قرار دینا، جو سب جلال اور قوت میں برابر ہوں، اور پھر ان تینوں کی ترکیب سے ایک کامل خدا بنانا، ایک ایسی منطق ہے، جو دنیا میں مسیحیوں کے ساتھ ہی خاص ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کا کفارہ ہونا، یعنی یہ بات، جو عیسائیوں کے اعتقاد میں جمی ہوئی ہے، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام امتیوں کی طرف سے ملعون خدا ہوئے ...... نعوذ باللہ منہا ...... اور تین دن تک ان کے عوض جہنم میں رہے، ہرگز قرین عقل نہیں۔ کیونکہ محبوب میں وجہ محبت اور عدو میں عداوت چاہئے۔ مرحوم

باعث رحمت اور ملعون میں موجب لعنت ضرور ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ حسن تو کسی میں نظر آئے اور محبوب کسی اور کو بنائیں۔ اطاعت کسی میں نظر آئے اور رحمت کسی اور پر کریں۔ یعنی خوش کسی اور سے ہو جائیں۔ بدمنظر تو کوئی اور ہو اور نفرت اور ہیبت اس سے ہو، جس میں حسن خداداد نظر آئے۔ اور خوشی کی باتیں تو کوئی اور کرے اور لعنت اس پر ہو، یعنی ناخوش اس سے ہو جائیں، جو ہر طرح سے مطیع ہو۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ کوئی کسی کی اطاعت کا مستحق نہیں بجز خدا اور کوئی کسی کے گناہ کا مجرم نہیں۔

عفو گناہ کی فلاسفی و تردید کفارہ مسیح ابن مریمؑ

گناہوں کی معافی کا فلسفہ یہ ہے کہ چونکہ انسان خدا تعالیٰ کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اس لئے اس کا تمام آرام اور تمام خوشحالی صرف اس میں ہے کہ خدا کا ہو جائے۔ کیونکہ جو سچی خوشحالیاں اس کی سرشت میں خدائی انوار سے ودیعت ہیں، وہ ظاہر نہیں ہوسکتیں، جب تک وہ اس حقیقی رشتہ کو، جو اس کو خدا سے ہے، ممکن قوت سے حیز فعل میں نہ لائے۔ پھر جب انسان خدا سے منہ پھیر لے، تو اس کی مثال ایسی ہو جاتی ہے، جیسا کہ کوئی ان کھڑکیوں کو بند کر دے، جو آفتاب کی طرف تھیں۔ اور کچھ شک نہیں کہ ان کے بند ہونے کے ساتھ ہی ساری کوٹھڑی میں اندھیرا پھیل جائیگا اور وہ روشنی، جو محض آفتاب سے ملی تھی، یک لخت دور ہو کر ظلمت پیدا ہو جائیگی۔ اور یہی ظلمت ہے، جو ضلالت اور جہنم سے تعبیر کی جاتی ہے، کیونکہ تمام دکھوں کی وہی جڑ ہے۔ اور اس ظلمت کا دور ہونا اور اس جہنم سے نجات پانا اگر قانون قدرت کے طریق پر تلاش کیا جائے، تو کسی کو مصلوب کرنیکی حاجت نہیں، بلکہ وہی کھڑکیاں کھول دینی چاہئیں، جو ظلمت کا باعث ہوئی تھیں۔ کیا کوئی یقین کر سکتا ہے کہ ہم دراں حالیکہ کھڑکیوں کو بند رکھنے پر اصرار کریں، کسی روشنی کو پاسکیں گے۔ ہرگز نہیں۔ سو گناہ کا معاف ہونا تو کوئی قصہ کہانی نہیں، جس کا ظہور کسی آئندہ زندگی پر موقوف ہے۔ یہ بھی نہیں کہ یہ باتیں محض بے حقیقت اور مجازی نافرمانیاں اور مجازی قصور بخششے کے رنگ میں ہیں۔ بلکہ جب انسان خدا سے اعراض کر کے اس روشنی کے مقابلہ سے پرے ہٹ جاتا ہے اور ادھر ادھر ہو جاتا ہے، جو خدا سے اترتی اور دلوں پر نازل ہوتی ہے، تب اس صورت موجودہ کا نما خدا کے کلام میں جناح ہے، جس کو پارسیوں نے مبدل کر کے گناہ بنا لیا ہے۔ جنح اس کا مصدر ہے۔ اس کے معنی ہیں میل کرنا اور اصل مقصد سے ہٹ جانا ہے۔ پس اس کا نام جناح یعنی گناہ اس لئے ہے کہ انسان اعراض کر کے اس مقام کو چھوڑ دیتا ہے، جو الٰہی روشنی پڑنے کا مقام ہے۔ اور اس خاص مقام سے دوسری طرف میل کر کے ان انوار سے اپنے تئیں دور ڈالتا ہے، جو اس سمت مقابل میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ گم شدہ انوار کسی شخص کے مصلوب ہونے سے ہمیں مل سکتے

ہیں یا ان کے حصول کے لئے قانون قدرت یہ ہے کہ ہم ان کھڑکیوں کو کھول دیں، جو آفتاب کے سامنے ہیں۔تب وہ کرنیں اور شعاعیں، جو بند کرنے سے گم ہو گئیں تھیں، یکدفعہ پھر پیدا ہو جائیں گی۔سو اس میں کچھ شک نہیں کہ عقل سلیم کے نزدیک یہی صحیح ہے، جو ان کھڑکیوں کو کھولا جائے۔تب ہم نہ صرف انوار کو پائیں گے، بلکہ اس مبداء انوار کو بھی دیکھ لیں گے، جس کا نام آفتاب ہے۔جسمانی قانون قدرت بھی یہی ہے، جو ہماری نظروں کے سامنے ہے۔تم میں سے ایسا شخص کون ہے کہ جب اپنی کوٹھڑی کے دروازوں کے بند ہونے کی حالت میں اندھیرے میں ہو اور اس سے دکھ پائے، وہ کسی کے مصلوب ہونیکا منتظر ہو اور یقین رکھتا ہو کہ وہ دروازے کسی کے سولی دیئے جانے سے کھلیں گے۔اور جب تک کوئی سولی نہ دیا جائے، اندھیرے میں بیٹھا رہے۔بلکہ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اگر وہ ہوا کے رکنے سے تنگ نہیں ہوگا، تاہم ایک خوفناک اندھیرے سے تنگ آکر اٹھے گا اور اپنے ہاتھوں سے ساری کھڑکیاں کھول دے گا۔تب ساتھ ہی صورت موجودہ جاتی رہے گی اور روشنی اور ٹھنڈی ہوا سے گھر بھر جائیگا۔اسی کی طرف خدا تعالیٰ نے اشارہ فرما کر کہا۔ **من کان فی ھذہ اعمیٰ فھو فی الآخرۃ اعمیٰ و اضل سبیلاً** ۔یعنی جو شخص اِس جہاں میں اندھا ہو، وہ اُس جہان میں بھی اندھا ہوگا، یعنی خدا کو دیکھنے کی آنکھیں جس کو یہاں نہیں ملیں اس کو اُس جہان میں بھی نہیں ملیں گی۔راستباز، جو قیامت کو خدا کو دیکھیں گے، وہ اِس جگہ سے خدا کو دیکھنے والے حواس ساتھ لے جائیں گے۔اگرچہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے صرف آنکھ کا ذکر کیا ہے، مگر اشارۃ النص سے کان بھی اس میں داخل ہیں۔یعنی جو شخص اِس جگہ خدا کی آواز نہیں سن سکے گا، وہ اُس جگہ بھی نہیں سن سکے گا۔خدا کو، جیسا کہ خدا ہے، بغیر کسی غلطی کے پہچاننا بھی تمام روشنیوں کا مبداء ہے۔لیکن جن لوگوں کا یہ مذہب ہے کہ خدا پر بھی موت، دکھ، مصیبت، جہالت وارد ہو جاتی ہے اور وہ بھی ملعون ہو کر سچی پاکیزگی اور الٰہی رحمت سے مردود ہو جاتا ہے۔اور لعنت کے مفہوم کے مطابق خدا اس سے بیزار ہو جاتا ہے۔کیا ایسے لوگوں کے دلوں پر سچے خدا کی معرفت کا ایک ذرہ پرتو بھی پڑا ہے۔اگر کہو کہ ہمارا مذہب نہیں کہ یسوع کو ہم حقیقی طور پر بدکار اور خدا کی رحمت سے دور اور خدا کے غضب کا مورد اور اس کی نظر عنایت سے گرا ہوا سمجھیں اور ایسا خیال کریں کہ سچ مچ خدا اس سے بیزار ہو گیا تھا۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تمام باتیں لعنت کے مفہوم میں داخل ہیں۔اور جس نے یہ جائز رکھا ہے کہ یسوع لعنتی ہوا، اس کو ضرور اقرار کرنا پڑیگا کہ لعنت کا تمام مفہوم اس پر صادق آیا۔اور جس حد تک لعنت کے معنے لغت کی رو سے ثابت ہوتے ہیں، وہ تمام معنی اس میں پائے گئے۔سو لعنت کے معنی لغت کی رو سے وہی ہیں، جو ابھی ہم ذکر کر چکے ہیں۔لعنت کا شیطان وارث ہے۔پس ہر ایک ملعون واقعی

طور پر شیطان ہے۔ پس اگر بموجب عیسائیوں کے عقیدہ کے یسوع ملعون ہے، تو ہمیں معاف فرمائیں کہ ضرور یہ کہنا پڑے گا کہ نعوذ باللہ وہ شیطان ہے۔ عیسائیو خدا کے واسطے اس بیہودہ اور گندے عقیدہ سے باز آؤ۔ اور خدا تعالیٰ کے برگزیدہ انسان حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ناحق ملعون نہ ٹھہراؤ۔

ہم اس وقت اس بحث کو زیادہ لکھنا نہیں چاہتے۔ اپنے پہلے کلام کی طرف عود کر کے کہتے ہیں کہ سچی نجات کا چشمہ سچی خدا شناسی ہے اور سچے طور پر گناہ کی معافی اس روشنی کے مرکز پر قائم ہو جانا ہے، جس سے میل کر کے اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ سبحان اللہ عربی کی لغت میں بھی کتنی خدا تعالیٰ نے برکت رکھی ہے کہ اس کا ایک لفظ بھی بڑے لمبے جھگڑوں کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ جس خدا نے گناہ کا نام جناح رکھا اس نے ابتدا سے اس لفظ کے ذریعہ سمجھا دیا کہ گناہ کہ گناہ کی حقیقت اصل مرکز سے اِدھر اُدھر میل کرنا ہے۔ اور جناح کا لفظ توبہ کے مقابل ہے۔ کیونکہ وہ بھی ایک میل کرنا ہے۔ نجات کا مفت ملنا اور اعمال سے فراغت رکھنا یہ عیسائیوں کی ایک غلطی ہے۔ ان کے فرضی خدا نے بھی چالیس روزے رکھے اور موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی کوہ سینا پر روزے رکھے۔ تب خدا تعالیٰ کی کتاب ملی۔ کیا ان نمونوں سے سمجھ نہیں آتا کہ دنیا محنت اور مجاہدہ کا مقام ہے۔ جس قدر دنیا میں مفت خورے ہیں، حقیقت میں سب بدمعاش ہیں۔ مثلاً اول درجہ کے چور، مفت خورے ہیں۔ پھر ڈاکو اور بٹمار اور امانت میں خیانت کرنیوالے اور رشوت لینے والے۔ تمام نیکوں کو راستبازی کی ہدایتیں عمل کے بعد ملتی رہی ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے اور عیسائی اس کو مانتے ہیں کہ خدا بدی سے اس قدر بیزار ہے کہ ایک بدی کے عوض دائمی جہنم ہے۔ پھر جب کہ وہ بدی سے اس قدر بیزار ہے، تو اس کے عدل کا تقاضا ہونا چاہئے کہ وہ نیکی سے بھی اسی قدر راضی ہو، یعنی اس نے نیکی کے عوض دائمی جنت رکھی ہوئی ہو۔ پس اس صورت میں نیکی بدی کا کفارہ ٹھہرتی ہے، نہ کسی اور کا مرنا۔ کیا اگر کوئی شخص دردسر سے بیتاب ہو، تو کوئی دوسرا اپنا سر کسی پتھر پر پھوڑے، تو اس سے اس کا دردسر جاتا رہیگا، کبھی نہیں۔ پس جب ایک انسان بدی کرنے کے بعد ایسی نیکی بجالایا، جس کا عوض دائمی جنت ہے، تو ضرور ہے کہ پہلی بات موقوف ہو کر دوسری بات قائم ہو جائے۔ ورنہ خلاف عقل ہو گا۔ اسی کے مطابق خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **ان الحسنات یذھبن لسیئات** ۔ یعنی نیکیاں بدیوں کو بہا لے جاتی ہیں یا دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ بدی میں خدا تعالیٰ نے ایک خاصیت رکھی ہے کہ وہ جہنم تک پہنچاتی ہے۔ تو عدل کا ضرور یہ تقاضا چاہئے کہ نیکی میں اس کے مقابل پر ایک خاصیت ہو۔ سو وہ یہی ہے کہ وہ جنت تک پہنچاتی ہے۔ مثلاً کھڑکیوں کا بند کرنا ایک بدی ہے، جس کی لازمی تاثیر یہ ہے کہ کوٹھڑی میں اندھیرا پھیل جائے۔ پھر اس کے مقابل پر نیکی

یہی ہے کہ وہ گمشدہ پھر واپس مل جائے یا بہ تبدیل الفاظ یوں کہہ سکتے ہیں کہ عذاب ایک سلبی چیز ہے اور خوشحالی ایک امر ایجابی ہے۔ اور سلب اور ایجاب میں کوئی اشتراک نہیں ہوتا۔ پس جیسا کہ ظلمت عدم وجود روشنی کا نام ہے، ایسا ہی عذاب عدم وجود خوشحالی کا نام ہے۔ مثلاً بیماری اس حالت کا نام ہے کہ جب بدن طبعی حالت پر نہ رہے، سو جب انسان کی روحانی حالت طبعی حالت سے ادھر ادھر کھسک جائے، تو اسی اختلال کا نام عذاب ہے۔ پس جیسا کہ دیکھا جاتا ہے کہ جب کوئی عضو مثلاً ہاتھ یا پیر اپنے محل سے اتر جائے، تو اسی وقت درد شروع ہو جاتا ہے اور یہ درد کہیں باہر سے نہیں آتا۔ بلکہ اس عضو کے اترنے کا لازمی نتیجہ ہے۔ ایسا ہی عذاب کی حالت ہے کہ وہ باہر سے نہیں آتا۔ بلکہ دوسرے لفظوں میں وہ خداتعالیٰ کا فعل ہے، جیسا کہ اگر کوئی سم الفار کھالے، تو خدا اس کو مار دیتا ہے۔ اور اگر آتشک زدہ عورت کے پاس جائے، تو خدا اس کو آتشک کر دیتا ہے۔ اور جبکہ یہ بات ثابت ہو چکی کہ عذاب صرف ایک سلبی حالت ہے، یعنی سچی خوش حالی کے دور ہونے کے بعد جو حالت پیدا ہوتی ہے، وہی عذاب ہے۔ قرآن شریف کے باریک بھیدوں میں سے ایک یہ بھید ہے جس کی طرف یہ آیت اشارہ فرماتی ہے۔
نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ ۔ یعنی عذاب جہنم خدا کی ایک آگ ہے، جو دلوں پر بھڑکتی ہے، یعنی اندر سے ہی نکلتی ہے۔ پس ایسی حالت میں کہ عذاب ایک سلبی امر ہے لازم آتا ہے کہ امر ایجابی پیدا ہونے سے وہ عذاب اٹھ جائے، کیونکہ قانون قدرت ہو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، وہ گواہی دیتا ہے کہ ہمیشہ امر سلبی امر ایجابی سے دور ہو جاتا ہے۔ اور کسی تیسری شئے کی حاجت نہیں پڑتی۔ مثلا کھڑکیوں کے بند ہونے سے جو اندھیرا اور حبس ہو جاتا ہے، اس کا صرف یہی علاج کافی ہے کہ کھڑکیوں کو کھول دیا جائے۔ اس صورت میں ہر ایک کو صاف سمجھ آ جائیگا کہ گناہ اور معافی گناہ کی فلاسفی کیا ہے۔ گناہ ایک امر سلبی ہے یعنی وضع طبعی سے ادھر ادھر ہو جانا، اور معافی گناہ بطور استرداد صحت زائلہ کے ہے، یعنی کھوئی ہوئی صحت کو اپنی حالت پر لانا اور کھسکے ہوئے عضو کو ایسی جگہ پر رکھنا، جہاں سے وہ کھسک گیا تھا۔ جس طرح جناح کے معنی ہیں مرکز طبعی سے میل کرنا۔ اسی طرح اس کے مقابل پر توبہ کے یہ معنی ہیں مرکز طبعی کی طرف میل کرنا۔ یہ دونوں لفظ مقابل پر پڑتے ہیں۔ اس مقابل کو خوب یاد رکھنا چاہیئے اور یہ دونوں لفظ نہایت قابل قدر ہیں کہ اصل حقیقت کو دکھلاتے ہیں اور گناہ اور معافی گناہ کی سچی فلاسفی ظاہر کرتے ہیں۔

عیسائیوں کے خیال میں یہ جما ہوا ہے کہ عذاب الٰہی اس انسان کے عذاب کی مانند ہے، جو نافرمانی سے چڑ کر مارتا ہے اور جس نے اپنے نفس پر فرض کر رکھا ہے کہ کبھی قصور سے درگزر نہ کرے۔ اور

اس کی اس بدخصلت سے مخلصی حاصل کرنے کے لئے بجز اس کے کوئی طریق نہیں کہ اسی کا بیٹا گنہگاروں کے گناہ معاف کرانے کے لئے اپنے تیئں سولی پر چڑھا دے تا اس طرح قصاب باپ کی منتقمانہ عادت بھی پوری ہو جائے اور دوسرے لوگ بھی بچ جائیں۔ اور کچھ شک نہیں کہ قرآن کریم نے اس بیہودہ تعلیم کو رد کیا ہے اور صاف فرما دیا ہے کہ جس طرح بدی میں یہ خاصیت ہے کہ خدا سے دور کر دیتی ہے، اسی طرح نیکی میں یہ خاصیت ہے کہ وہ پھر خدا کے پاس لے آتی ہے۔

حقیقت شفاعت

شفع عربی زبان میں جفت کو کہتے ہیں، جو طاق کے مقابل پر ہے۔ پس جو شخص ایک پاک فطرت اور کامل انسان سے ایسا تعلق حاصل کرتا ہے کہ گویا اس کا جزو ہے، تو قانون قدرت اس طرح پر واقع ہے کہ وہ اس کامل انسان کے انوار سے حصہ لیتا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک تاریکی ایک روشن جوہر کے مقابل پر آتی ہے، تو وہ تاریکی روشنی میں بدل جاتی ہے۔ پس اسی طرح جیسے ایک مصفّا فطرت نہایت صافی آئینہ کی طرح ہو جاتی ہے اور آفتاب حقیقی کے مقابل پر آ کر اس سے روشنی حاصل کر لیتی ہے۔ تو کبھی ایسا اتفاق بھی ہوتا ہے کہ ایک تاریک فطرت اس روشن فطرت کے مقابل پر آ جاتی ہے، تو بوجہ اس محاذات کے اس پر بھی روشنی کا عکس پڑ جاتا ہے۔ جس کے سبب وہ تاریک فطرت بھی روشن ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ جب ایک آئینہ صافی پر آفتاب کی شعاع پڑتی ہے، تو وہ آئینہ اپنے مقابل کے در و دیوار کو اس روشنی سے منور کر دیتا ہے۔ یہی شفاعت کی حقیقت ہے۔

سوال۔ کیا شفاعت پر بھروسہ کرنا شرک نہیں ہے؟

جواب۔ (ا) قران شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ **من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ** . یعنی کون ہے جو خدا تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اس کے پاس شفاعت کرے۔ قرآن شریف کے رو سے شفاعت کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص اپنے بھائی کے لئے دعا کرے کہ وہ مطلب اس کو حاصل ہو جائے یا کوئی بلا ٹل جائے۔ پس قرآن شریف کا حکم ہے کہ جو شخص خدا تعالیٰ کے حضور میں زیادہ جھکا ہوا ہے، وہ اپنے کمزور بھائی کے لئے دعا کرے کہ اس کو بھی وہ مرتبہ حاصل ہو۔ یہی حقیقت شفاعت ہے۔ سو ہم اپنے بھائیوں کے لئے بیشک دعا کرتے ہیں کہ خدا ان کو قوت دے اور ان کی بلا کو دور کرے اور یہ ایک ہمدردی کی قسم ہے۔ چونکہ تمام انسان ایک جسم کی طرح ہیں، اس لئے خدا تعالیٰ نے ہمیں بار بار سکھلایا ہے کہ اگرچہ شفاعت کو قبول کرنا اس کا کام ہے، مگر تم اپنے بھائیوں کی شفاعت میں یعنی ان کے لئے دعا کرنے میں لگے رہو۔ اور شفاعت سے یعنی ہمدردی کی دعا سے باز نہ رہو کیونکہ تمہارا ایک دوسرے پر حق

ہے۔جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اصل میں شفاعت کا لفظ شفع سے لیا گیا ہے۔اور شفع جفت کو کہتے ہیں، جو طاق کی ضد ہے۔پس انسان کو اس وقت شفیع کہا جاتا ہے جب وہ کمال ہمدردی سے دوسرے کا جفت ہو کر اس میں فنا ہو جاتا ہے اور دوسرے کے لئے ایسی ہی عافیت مانگتا ہے، جیسا کہ اپنے نفس کے لئے۔ اور یاد رہے کہ کسی شخص کا دین کامل نہیں ہوسکتا، جب تک کہ شفاعت کے رنگ میں ہمدردی اس میں پیدا نہ ہو۔ بلکہ دین کے دو ہی کامل حصے ہیں۔ایک خدا سے محبت کرنا اور دوسرا بنی نوع انسان سے اس قدر محبت کرنا کہ ان کی مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھنا اور ان کے لئے دعا کرنا، جس کو دوسرے لفظوں میں شفاعت کہتے ہیں۔

(۲) قانون قدرت سے واضح ہے اور ہم فن طبابت میں روزمرہ دیکھتے ہیں کہ طبیبوں کی کوشش اور سفارش بیماروں کے حق میں دواؤں سے کہیں منظور ہوتی ہے اور کہیں نامنظور۔اسی طرح سائنس دانوں کی سفارش کہیں منظور ہوتی ہے اور کہیں نامنظور۔بادشاہوں کے وزراء، امراء اور سپہ سالاروں کی سفارش کہیں منظور ہوتی ہے، کہیں نامنظور۔دعائیں کہیں کامیاب ہو کر شکر کے انعامات کا موجب ہوتی ہیں اور کہیں ناکامی سے صبر کے انعامات دلاتی ہیں۔شفاعت کا گناہ کیساتھ یہ تعلق ہے کہ گناہ اخذ کا موجب ہے اور شفاعت کنندہ کی سفارش اسکے نیک اعمال کے باعث الٰہی عفو کو حاصل کر کے ایک قسم کے گنہگار کیلئے عفو کا موجب بن جاتی ہے اور شفاعت کنندہ کے واسطے باعث اعزاز وامتیاز ہے۔

(۳) جب انبیاء سراپا اطاعت یعنی ہر طرح سے محکوم ہوئے، تو پھر ان کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ اپنے طور پر جسے چاہیں بخش دیں اور جسے چاہیں عذاب دینے لگیں۔ یہ اختیار ہو تو حاکم ہو جائیں اور محکوم نہ رہیں۔ہاں یہ بات البتہ متصور ہے کہ وہ کسی کے لئے دعا اور کسی کے لئے بددعا کریں۔کسی کے حق میں کلمۃ الخیر، کسی کے حق میں برا کلمہ کہیں۔مگر جب وہ ہر طرح سے مقدس مانے گئے، تو وہ اپنے خیر خواہوں کے خیر خواہ ہی بنیں گے، بدخواہ نہ بنیں گے۔کوئی برا کلمہ نہ کہیں گے۔اسی کو ہم شفاعت کہتے ہیں۔

شفاعت سفارش کو کہتے ہیں اور دنیا میں سفارشیں کئی طرح کی ہوتی ہیں۔جیسے ظاہری بادشاہ کے ہاں کسی شخص کی چوری ثابت ہو جائے اور کوئی امیر و وزیر اس کو اپنی سفارش سے بچالے، تو ایک تو یہ صورت ہے کہ بادشاہ کا جی تو اس چور کر پکڑنے ہی کو چاہتا ہے اور اس کے آئین کے موافق اس کو سزا پہنچتی ہے۔مگر اس امیر سے دب کر اس کی سفارش مان لیتا ہے اور اس چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے، کیونکہ وہ امیر اس سلطنت کا بڑا رکن ہے اور اس کی بادشاہت کو بڑی رونق دے رہا ہے۔سو بادشاہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اس جگہ اپنے غصے کو تھام لینا اور ایک چور سے درگزر کر جانا بہتر ہے اس سے کہ اتنے بڑے امیر کو

ناخوش کر دیا جائے، جس سے بڑے بڑے کام خراب ہو سکتے ہیں اور سلطنت کی رونق گھٹتی ہے۔اس کو شفاعت وجاہت کہتے ہیں یعنی اس امیر کی وجاہت کے سبب سے اس کی سفارش قبول کی گئی۔

اس قسم کی سفارش اللہ تعالیٰ کی جناب میں ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتی۔اور جو کوئی کسی نبی وولی کو یا امام اور شہید کو یا کسی فرشتے یا کسی پیر کو اللہ کی جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھے، سو وہ اصلی مشرک اور بڑا جاہل ہے۔ کیونکہ اس نے خدا کے معنی کچھ نہیں سمجھے اور اس مالک الملک کی قدر کچھ بھی نہ پہچانی۔اس شاہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کن سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی اور جن اور فرشتہ وجبریل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے اور ایک دم میں سارا عالم عرش سے فرش تک الٹ پلٹ کر ڈالے اور ایک اور ہی عالم اس جگہ پر قائم کرے۔ کیونکہ اس کے تو محض ارادے ہی سے ہر چیز ہو جاتی ہے۔کسی کام کے واسطے کچھ اسباب اور سامان جمع کرنے کی کچھ حاجت نہیں۔اور اگر سب لوگ پہلے اور پچھلے اور آدمی اور جن بھی سب مل کر جبریل اور پیغمبروں کی طرح ہو جائیں، تو اس مالک الملک کی سلطنت میں ان کے سبب سے کچھ رونق نہ بڑھ جائے گی۔اور جو سب شیطان اور دجال ہو جائیں، تو اسکی کچھ رونق گھٹنے کی نہیں۔ وہ ہر صورت سے بڑوں کا بڑا ہے اور بادشاہوں کا بادشاہ۔اس کا نہ کوئی کچھ بگاڑ سکتا ہے نہ کچھ سنوار سکتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی بادشاہ زادوں میں سے یا بیگماتوں میں سے یا بادشاہ کا کوئی معشوق اس چور کا سفارشی ہو کر کھڑا ہو جائے اور چوری کی سزا نہ دینے دے۔اور بادشاہ اس کی محبت سے لاچار ہو کر اس چور کی تقصیر معاف کر دے، تو اس کو شفاعت محبت کہتے ہیں، یعنی بادشاہ نے محبت کے سبب سے سفارش قبول کر لی اور یہ بات سمجھی کہ ایک بار غصہ پی جانا اور ایک چور کو معاف کر دینا بہتر ہے اس رنج سے کہ جو اس محبوب کے اٹھ جانے سے مجھ کو ہوگا۔اس قسم کی شفاعت بھی خدا کے دربار میں کسی طرح ممکن نہیں۔اور جو کوئی کسی کو اس جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھے، وہ بھی ویسا ہی مشرک اور جاہل ہے جیسا کہ اول مذکور ہو چکا ہے۔ وہ مالک الملک اپنے بندوں کو بہتیرا ہی نوازے اور کسی کو حبیب کا اور کسی کو خلیل کا اور کسی کو کلیم کا اور کسی کو روح اللہ وجیہ کا خطاب بخشے اور کسی کو رسول کریم اور مکین اور روح القدس اور روح الامین فرمائے۔ مالک پھر مالک ہے اور غلام غلام، کوئی شخص بندگی کے رتبے سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا اور غلام کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا، جیسا کہ اس کی رحمت سے ہر دم خوشی سے جھلکتا ہے، ویسا ہی اس کی ہیبت سے رات دن زہرہ پھٹتا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ چور پر چوری ثابت ہوگئی، مگر وہ ہمیشہ کا چور نہیں اور چوری کو اس نے

اپنا پیشہ نہیں ٹھہرایا، مگر نفس کی شامت سے قصور ہو گیا۔ سو اس بات پر شرمندہ ہے اور رات دن ڈرتا ہے اور بادشاہ کے آئین کو سر آنکھوں پر رکھ کر اپنے تئیں تقصیروار سمجھتا اور لائق سزا جانتا ہے اور بادشاہ سے بھاگ کر کسی امیر و وزیر کی پناہ نہیں ڈھونڈتا اور اس کے مقابلہ میں کسی کی حمایت نہیں جتاتا اور رات دن اسی کا منہ دیکھ رہا ہے کہ دیکھئے میرے حق میں کیا حکم فرمائے۔ سو اس کا یہ حال دیکھ کر بادشاہ کے دل میں اس پر ترس آتا ہے، مگر آئین بادشاہت کا خیال کر کے بے سبب درگذر نہیں کرتا کہ کہیں لوگوں کے دلوں میں اس کے آئین اور بادشاہت کی قدر گھٹ نہ جائے، سو کوئی امیر و وزیر اس کی مرضی پا کر اس تقصیردار کی سفارش کرتا ہے اور بادشاہ اس امیر کی عزت بڑھانے کی خاطر ظاہر میں اس کی سفارش کو منظور کر کے چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے۔ سو اس امیر نے اس چور کی سفارش اس لئے نہیں کی کہ اس کا قرابتی یا آشنا ہے یا اس کی حمایت کرنے والا ہے، بلکہ محض بادشاہ کی مرضی سمجھ کر، کیونکہ وہ تو بادشاہ کا امیر ہے نہ کہ چوروں کا۔ جو کوئی چوروں کا حمایتی بن کر ان کی سفارش کرتا ہے، تو وہ آپ بھی چور ہو جاتا ہے۔ اس کو شفاعت بالاذن کہتے ہیں، یعنی یہ سفارش خود مالک کی مرضی اور اجازت سے ہوتی ہے۔ سو اللہ تعالیٰ کی جناب میں اس قسم کی شفاعت ہوسکتی ہے۔ اور جس نبی و ولی کی شفاعت کا قرآن کریم و احادیث نبویہ میں ذکر ہے، اس کے معنی یہی ہیں۔ خدا بڑا غفور اور رحیم ہے۔ سب مشکلیں اپنے ہی فضل سے کھول دیگا اور سب گناہ اپنی ہی رحمت سے بخش دیگا اور جس کو چاہے گا اپنے حکم سے شفیع بنا دے گا۔ غرض جیسے کہ اپنی ہر حاجت خدا تعالیٰ کو سونپنا چاہیئے، اسی طرح یہ حاجت بھی اسی کے اختیار پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ جس کو وہ چاہے ہمارا شفیع کر دے۔ نہ یہ کہ کسی کی حمایت پر بھروسہ کیا جائے اور اس کو اپنی حمایت کے واسطے پکارا جائے۔ اور اس کو اپنا حمایتی سمجھ کر اصل مالک کو انسان بھول جائے۔ یہ بڑی قباحت کی بات ہے۔ سارے نبی اور ولی اس عقیدے سے بیزار ہیں۔ وہ ہرگز ایسے لوگوں کے شفیع نہیں بنتے اور نہ بننا چاہتے ہیں۔

شفیع کون ہوسکتا ہے؟

شفیع کا لفظ شفع سے نکلا ہے، جسکے معنی جفت کے ہیں۔ اسلیئے شفیع وہ ہوسکتا ہے، جو دو مقامات کا مظہر اتم ہو یعنی مظہر کامل لاہوت اور ناسوت کا ہو۔ لاہوتی مقام کا مظہر قائم ہونے سے یہ مراد ہے کہ اس کا خدا کی طرف صعود ہو، وہ خدا سے حاصل کرے۔ اور ناسوتی مقام کے مظہر کا یہ مفہوم ہے کہ خدا کی طرف اسکا مفہوم ہو، کہ جو خدا سے حاصل کرے، وہ مخلوق کو پہنچا دے۔ اور مظہر کامل ان مقامات کا ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسکی طرف اشارہ ہے۔ **دنی فتدلیٰ فکان قاب قوسین او ادنیٰ**۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدوں کامل حصہ مقام لاہوت کا کسی نبی

میں نہیں آیا۔ اور ناسوتی حصہ چاہتا ہے کہ بشری لوازم کو ساتھ رکھے۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میں ساری باتیں پوری پائی جاتی ہیں۔ آپ نے شادیاں بھی کیں، بچے بھی ہوئے، دوستوں کا زمرہ بھی تھا۔ فتوحات کر کے اختیاری قوتوں کے ہوتے ہوئے انتقام چھوڑ کر رحم کر کے بھی دکھایا۔ جبتک انسان کے اخلاق پورے نہ ہوں، وہ پوری ہمدردی نہیں کرسکتا۔ اس حصہ اخلاق فاضلہ میں وہ نامکمل رہیگا۔ مثلاً جس نے شادی نہیں کی، وہ بیوی بچوں کے حقوق کی کیا قدر کرسکتا ہے۔ اوران پر اپنی شفقت اور ہمدردی کا کیا نمونہ دکھا سکتا ہے۔ رہبانیت ہمدردی کو دور کر دیتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے رہبانیت کو نہیں رکھا۔ غرض کامل شفیع وہی ہوسکتا ہے، جسمیں یہ دونوں حصے کامل طور پر پائے جائیں۔ چونکہ یہ ایک ضروری امر تھا، کہ شفیع ان دونوں مقامات کا مظہر ہو، اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش سے ہی اسی سلسلہ کا ظل قائم رکھا۔ یعنی آدم علیہ السلام کو جب پیدا کیا، تو لاہوتی حصہ تو اس میں یوں رکھ دیا جب کہا۔ **فانا نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین** ۔ اور ناسوتی حصہ یوں رکھا کہ حوا کو اس سے پیدا کیا یعنی جب روح پھونکی، تو ایک جوڑ آدم کا خدا تعالیٰ سے قائم ہوا۔ اور جب حوا نکالی تو دوسرا جوڑ مخلوق کیساتھ ہونے کی وجہ سے ناسوتی ہوگیا۔ پس جبتک یہ دونوں حصے کامل طور پر کامل انسان میں نہ پائے جائیں، وہ شفیع نہیں ہوسکتا۔ جیسے آدم کی پسلی سے حوا نکلی، اسی طرح ہر کامل انسان کی پسلی سے مخلوق نکلتی ہے۔ (ماخوذ)

انسانوں کی تکالیف ومصائب کا راز اور انبیاء وبچوں کی مصائب کی وجہ

انسانی فطرت ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ زدوکوب ہی سے درست ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت انسان کی تکمیل چاہتی ہے اور خود عبودیت کا یہی تقاضا ہے کہ کسی نہ کسی طرح تکمیل کرے۔ اس لئے منجملہ تکمیلی صورتوں کے ایک شدائد اور مصائب بھی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام، جو بالکل معصوم اور مقدس وجود ہوتے ہیں، وہ بھی تکالیف اور شدائد کا نشانہ بنتے ہیں اور ایسے مصائب ان پر آتے ہیں کہ اگر کسی اور پر آئیں، تو وہ برداشت بھی نہ کرسکے۔ ہر طرف سے ان کے دشمن اٹھتے ہیں۔ کوئی باتوں سے دکھ دیتا ہے۔ کوئی حکام وقت کے ذریعہ تکلیف دینے کا منصوبہ کرتا ہے۔ کوئی قوم کو ان کے برخلاف اکساتا ہے۔ غرض ہر پہلو سے ان کو تکلیف دی جاتی ہے اور طرح طرح کی بے آرامی اور حزن وغم ان پر آتا ہے۔ باوجود اس کے ان ساری باتوں کا کچھ بھی اثر ان پر نہیں ہوتا۔ اور وہ پہاڑ کی طرح جنبش نہیں کرتے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ گنہگار ہیں، ہرگز نہیں۔ اگر کوئی ایسا خیال کرے، تو اس سے بڑھ کر بیہودگی اور کیا ہوگی۔ بچوں کی تکالیف کا مسئلہ انبیاء علہم السلام کے مسئلہ سے خوب حل ہوتا ہے۔ ان کو معصومیت کے لحاظ سے بچہ سمجھ لو۔

یہ مسائل عبودیت کی تکمیل کے لئے ہیں اور عالم آخرت کے لئے مفید ہیں۔اگر ایسی حالت ہوتی کہ مرنے کے بعد بچے کی روح مفقود ہو جاتی،تو بھی اعتراض کا موقع ہوتا۔لیکن جب کہ جاودانی عالم اورابدی راحت موجود ہے،تو پھر یہ سوال ہی کیوں ہے۔اگر یہ سوال ہے کہ بغیر تکلیف کے انسان کو ابدی راحت میں داخل کر دے،تو پھر کہیں گے کہ معاصی کا بکھیڑا کیوں ہے،ان کے ساتھ بھی داخل کر سکتا تھا۔اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں غنی اور بے نیاز ہے۔انسان کو نجات اور ابدی آسائش کے حصول کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیئے۔جب تک وہ تکالیف اور مصائب وشدائد نہیں اٹھاتا،راحت وآسائش نہیں پاسکتا۔یہ شدائد دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک تو وہ ہیں،جب انسان خود مجاہدات کرتا ہے اور اپنے نفس سے جنگ کرتا ہے اور اس طرح پر اکثر تکالیف میں سے ہو کر گذرتا ہے۔اور دوسری صورت یہ ہے کہ قضاوقدر اس پر کچھ تکالیف نازل کر دیتی ہے اور اس ذریعہ سے اسے صاف کرتی ہے۔پس بچوں اور انبیاء علیہم الصلوات والسلام،جن کے نفوس قدسیہ ہوتے ہیں اور وہ بیگناہ و معصوم ہوتے ہیں،ان پر اسی طریق قضاوقدر سے باوجود تقدس ومعصومیت کے جو مصائب وشدائد آتے ہیں،وہ محض ان کی تکمیل ورفع درجات اور ان کے اخلاق اور صدق ووفا کے اظہار کے لئے نازل ہوتے ہیں۔انسان کیلئے سعی اور مجاہدہ ضروری چیز ہے۔اور اسکے ساتھ مصائب اور مشکلات بھی ضروری ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے کہ تکالیف سے اپنے بندوں کو ثواب دے۔عبادات میں جو قصور رہ جاتے ہیں،ان کا ازالہ قضاوقدر سے ہو جاتا ہے،کیونکہ عبادات کی تکالیف میں تو انسان اپنے رگ پٹھا آپ بچا لیتا ہے۔سردی ہو،تو وضو کے لئے پانی گرم کر لیتا ہے۔کھڑا نہ ہو سکے،تو بیٹھ کر نماز پڑھ لیتا ہے۔لیکن قضاوقدر سے جو آسمانی مار پڑتی ہے،وہ رگ پٹھا نہیں دیکھتی۔دنیا ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔حدیث شریف میں آیا ہے کہ دنیا میں ہمیشہ کی خوشی صرف کافر کو حاصل ہو سکتی ہے،کیونکہ اس کے عذاب کا گھر آگے ہے۔لیکن مومن کے لئے ایسی زندگی ہوتی ہے کہ کبھی آرام اور کبھی تکلیف ہوتی ہے۔ہاں انجام بخیر چاہیئے۔یہ مصائب گناہ کا کفارہ ہوتے ہیں۔کرب اور گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں۔خدا داری چہ غم داری۔خدا تعالیٰ پر پورا بھروسہ اور ایمان ہو،تو پھر انسان خواہ تنور میں ڈالا جائے،اسے کوئی غم نہیں ہوتا۔تکالیف کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔اس کے بعد پھر راحت ہے۔جیسا کہ بچہ پیدا ہونے کے وقت عورت کو تکلیف ہوتی ہے،بلکہ ساتھ والے بھی روتے ہیں۔لیکن جب بچہ پیدا ہو چکتا ہے،تو پھر سب کو خوشی ہوتی ہے۔ایسا ہی مومن پر خداوند تعالیٰ کی طرف سے ایک تکلیف اور دکھ کا وقت آتا ہے،تاکہ وہ آزمایا جائے اور صبر اور استقامت کا اجر پائے۔اصل میں تکالیف کے دن ہی مبارک ہوتے ہیں۔انبیاء

تکالیف کے ساتھ موافقت کرتے ہیں۔ ہر ایک شخص پر نوبت بنوبت یہ دن آتے ہیں تا کہ معلوم ہو جائے کہ اس کا تعلق خدا تعالیٰ کے ساتھ اصلی ہے یا نہیں۔ مولوی رومی صاحب فرماتے ہیں۔

ہر بلا کیں قوم را حق دادہ است　　　زیر آں گنج کرم بنہادہ است

حدیث میں آیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ کسی سے پیار کرتا ہے، تو اسکو کچھ دکھ دیتا ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معجزات انہیں مصائب کے زمانہ کی دعاؤں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کا اپریشن ہے، جو کہ ہر صادق کے واسطے ضروری ہے۔

ہست حیوانے کہ نامش اسفر است　　　کو بزخم چوب رفت و کمتر است
تا کہ چوبش می زنی بہ مے شود　　　او ز زخم چوب فربہ مے شود
نفس و من اسفرے آمد یقین　　　کو بزخم چوب زفت است وسمیں
زیں سبب بر انبیاء رنج و شکست　　　از ہمہ خلق جہاں افزوں تر است
تا زجانہا جان شاں شد زفت تر　　　کہ ندید آں بلا قومے دگر
پوست از دارد بلا کش مے شود　　　چوں ادیم طائیفے خوش مے شود
گر نہ تلخ و تیز مالیدے درود　　　گندہ گشتے و ناخوش و ناپاک بود
آدمی را نیز چوں آں پوست داں　　　از رطوبتہا شدہ زشت و گراں
تلخ و تیز و مالش بسیار دہ　　　تا شود پاک و لطیف و با فرہ
در نمے تانی رضا دہ اے عیار　　　کہ خدا ر بخت دہد بے اختیار
کہ بلائے دوست تطہیر شما ست　　　علم او بالائے تدبیر شما ست
چوں صفا بیند بلا شیریں شود　　　خوش شود دارد چو صحت بیں شود
برو بیند خویش را در عین مات　　　پس بگوید اقتلونی یا ثقات

حضرت عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ اپنی کتاب لطائف المنن الکبریٰ کے صفحہ ۱۹۳ پر لکھتے ہیں۔

مما من اللہ تبارک و تعالیٰ بہ علی شهودی ان جميع ما ينزل علی من البلايا و المحن ليس هو من بغض الحق تبارک و تعالیٰ انما ذالک محبته فی کما وردت بہ الاحاديث ما عدا المعاصی فان الحق تبارک و تعالیٰ لا ينبلی بها لا من يكرهه و من شهد المشهد صار ليشهد سدرة و لحمته نعما من اللہ تبارک و تعالیٰ وری جميع ما يولمه به انما هو تاديب له و مصلحته كشرب الدواء الكريه فان صاحب

البلاء لا يخلو حاله من ثلاثة امور لانه اما ان يكفر خطاياه و اما ان يرفع درجاته و اما ان يكون عقوبة له علىٰ ذنب سلف.

قضاءِ الٰہی پر صابر رہنے کی حکمت

خداتعالیٰ جب کسی پر کوئی سختی اور مصیبت اتارتا ہے، تو اس میں مصیبت زدہ کے لئے خداتعالیٰ کو بھلائی و بہتری اصلاح ملحوظ ہوتی ہے، جیسا کہ مریض کو طبیب کڑوی اور تلخ ادویہ اس لئے دیتا ہے کہ وہ صحت یاب ہو جائے۔ اسی طرح بندوں پر خداتعالیٰ کی طرف سے مصائب و تکلیفات حکیمانہ رنگ میں بندوں کی بہتری و اصلاح کے لئے نازل ہوتی ہے۔

حکایت۔ لقمان حکیم جس کے ملازم تھے، وہ جب کوئی چیز کھانے لگتا، تو حضرت لقمان کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیتا۔ ایک دفعہ خربوزے آئے، جو آقا کو بہت خوش معلوم ہوئے۔ اس نے لقمان کو بلایا اور خود ایک خربوزہ چیر کر لقمان کو کھانے کے لئے دیا۔ لقمان نے بہ شوق اور محبت کے ساتھ کھایا۔ حالانکہ وہ سخت کڑوا تھا۔ آقا نے یہ دیکھ کر کہ لقمان بہت شوق سے کھا رہا ہے، دوسرا خربوزہ بھی چیر دیا۔ مگر جب خود چکھا، تو تعجب سے کہا کہ لقمان یہ تو بڑا کڑوا ہے۔ حضرت لقمان نے کہا۔ حضور اتنی مدت میں آپ کے ہاتھ سے شیرینی کھاتا رہا ہوں۔ ایک دفعہ کی تلخی پر شکایت کروں، تو بڑی بری بات ہے۔

انسان پر جب کوئی مصیبت آئے تو گھبرائے نہیں اور بے صبری کے کلمات منہ نہ نکالے اور یہ خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر کیا کیا احسانات اور انعامات کئے ہیں۔ کیا ہوا اگر ہماری اصلاح کے لئے کوئی تلخی بھیج دے۔

حدیث میں آیا ہے کہ مومن کے لئے اس دنیا میں بہشت دوزخ کی صورت میں متمثل ہوتا ہے، یعنی خداتعالیٰ کی راہ میں تکالیف شاقہ جہنم کی صورت میں اس کو نظر آتی ہیں۔ پس وہ بطیّب خاطر اس جہنم میں وارد ہو جاتا ہے، تو معاً اپنے تئیں بہشت میں پاتا ہے۔ اسی طرح اور بھی احادیث نبویہ بکثرت موجود ہیں، جن کا ماحصل یہ ہے کہ مومن اسی دنیا میں نارِ جہنم کا حصہ لے لیتا ہے اور کافر جہنم میں بجبر واکراہ گرایا جاتا ہے۔ لیکن مومن خداتعالیٰ کے لئے آپ آگ میں گرتا ہے۔ ایک اور حدیث اس مضمون کی ہے، جس میں لکھا ہے کہ ایک حصہ نار کا ہر یک بشر کے لئے مقدر ہے۔ چاہے تو وہ اس دنیا میں اس آگ کو اپنے لئے خداتعالیٰ کی راہ میں قبول کر لے، اور چاہے تو تنعم اور غفلت میں عمر گذارے اور آخرت میں اپنے تنعم کا حساب دے۔

حقیقت توبہ وتوبہ سے مغفرت الٰہی کا فلسفہ

واضح ہو کہ توبہ لغت عرب میں رجوع کرنے کو کہتے ہیں۔اس وجہ سے قرآن مجید میں خدا تعالیٰ کا نام بھی تـوّاب ہے،یعنی بہت رجوع کرنیوالا۔اس کے معنی یہ ہیں کہ جب انسان گناہوں سے دست بردار ہو کر صدق دل سے خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے،تو خدا تعالیٰ اس سے بڑھ کر اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔اور یہ امر سراسر قانون قدرت کے مطابق ہے۔کیونکہ خدا تعالیٰ نے نوع انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی ہے کہ جب ایک انسان سچے دل سے دوسرے انسان کی طرف رجوع کرتا ہے، تو اس کا دل بھی اس کے لئے نرم ہو جاتا ہے،تو پھر عقل کیونکر اس بات کو قبول کر سکتی ہے کہ بندہ تو سچے دل سے خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرے،مگر خدا اس کی طرف رجوع نہ کرے۔بلکہ خدا،جس کی ذات نہایت کریم ورحیم واقع ہوئی ہے،وہ بندے سے بہت زیادہ اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔چنانچہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے قرآن شریف میں خدا کا نام تـوّاب بھی ہے،یعنی بہت رجوع کرنیوالا۔سو بندہ کا رجوع تو پشیمانی اور ندامت اور تذلل اور انکسار کے ساتھ ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کا رجوع رحمت اور مغفرت کے ساتھ ہوتا ہے۔

اگر رحمت خدا تعالیٰ کی صفات میں سے نہ ہو،تو کوئی مخلصی نہیں پا سکتا۔افسوس ان لوگوں پر ہے، جنہوں نے خدا تعالیٰ کی صفات پر غور نہیں کیا اور تمام مدار اپنے فعل اور عمل پر رکھا ہے۔مگر وہ خدا،جس نے بغیر کسی کے عمل کے ہزاروں نعمتیں انسان کے لئے زمین میں پیدا کر دیں،کیا اس کا یہ خلق ہو سکتا ہے کہ انسان ضعیف البنیان جب اپنی غفلت سے متنبہ ہو کر اس کی طرف رجوع بھی کرے اور رجوع بھی ایسا کرے کہ گویا مر جائے اور پہلا ناپاک چولہ بدن پر سے اتار دے اور اس کی آتش محبت میں جل جائے،تو وہ اس کی پرواہ نہ کرے۔

انسان اپنی فطرت میں نہایت کمزور ہے اور خدا تعالیٰ نے صدہا احکام کا اس پر بوجھ ڈالا ہے۔ پس اس کی فطرت میں یہ داخل ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کی وجہ سے بعض احکام کے ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔اور کبھی نفس امارہ کی بعض خواہشیں اس پر غالب آ جاتی ہیں۔پس وہ اپنی کمزور فطرت کی رو سے حق رکھتا ہے کہ کسی لغزش کے وقت اگر وہ توبہ اور استغفار کرے،تو خدا کی رحمت اس کو ہلاک ہونے سے بچالے۔یہ یقینی امر ہے کہ اگر خدا توبہ قبول کرنیوالا نہ ہوتا،تو انسان پر یہ بوجھ صدہا احکام کا ہرگز نہ ڈالا جاتا۔اس سے بلاشبہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ تواب اور غفور ہے۔اور توبہ کا یہ مطلب ہے کہ انسان بدی کو اس اقرار کے ساتھ چھوڑ دے کہ بعد اس کے اگر وہ آگ میں بھی ڈالا جائے،تب بھی وہ بدی ہرگز

نہیں کریگا۔ پس جب انسان اس صدق اور عزم محکم کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے، تو خدا جو اپنی ذات میں کریم و رحیم ہے، وہ اس گناہ کی سزا معاف کر دیتا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی اعلیٰ صفات میں سے ہے کہ توبہ قبول کر کے ہلاکت سے بچا لیتا ہے۔ اور اگر انسان کو توبہ قبول ہونے کی امید نہ ہو، تو پھر وہ گناہ سے باز نہیں آئے گا۔

خدا تعالیٰ نے اپنے اسماء ظاہر کئے کہ وہ کریم اور رحیم ہے اور غفور اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔ مگر جو شخص گناہ پر اصرار کرے اور باز نہ آئے، تو اسکو وہ بے سزا نہیں چھوڑتا۔ اور اس نے اپنا یہ اسم بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ توبہ قبول کرنیوالوں سے پیار کرتا ہے اور اس کا غضب صرف انہیں لوگوں پر بھڑکتا ہے، جو ظلم اور شرارت اور معصیت سے باز نہیں آتے۔

توبہ کرنے والے اپنا صدق ظاہر کرنے کے لئے صدقہ و خیرات بھی کرتے ہیں اور اپنی طاقت سے زیادہ خدمات مالی اور جانی بجالاتے ہیں۔ اور مجاہدہ اور اعمال صالحہ کی آگ سے اپنے تئیں جلا دیتے ہیں۔ اور نہایت درجہ کی تبدیلی اپنے اندر پیدا کرتے ہیں اور موت تک اپنے تئیں پہنچا دیتے ہیں۔

جبکہ ایک شریف طبع انسان اپنے قصور واروں کے قصور ان کی توبہ کی درخواست پر بخش سکتا ہے، اور انسان کی فطرت میں یہ قوت پائی جاتی ہے کہ کسی خطا کار کی پشیمانی اور آہ و زاری پر اس کی خطا کو بخش دیتا ہے، تو کیا وہ خدا، جس نے انسان کو پیدا کیا ہے، وہ اس صفت سے محروم ہے۔

حقیقت معراج نبویؐ

سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الیٰ المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہ ۔ بعض اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ در حقیقت اور واقعی سیر معراج نبویؐ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا کشف تھا، جس کو در حقیقت بیداری کہنا چاہیئے۔ ایسے کشف کی حالت میں انسان ایک نوری جسم کے ساتھ حسب استعداد اپنے نفس ناطقہ کے آسمانوں کی سیر کر سکتا ہے۔ پس چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس ناطقہ کی اعلیٰ درجہ کی استعداد تھی اور انتہائی نقطہ تک پہنچی ہوئی تھی، اس لئے وہ اپنی سیر معراجی میں معمورہ عالم کے انتہائی نقطہ تک، جو عرش عظیم سے تعبیر کیا جاتا ہے، پہنچ گئے۔ سو در حقیقت یہ سیر کشفی تھی، جو بیداری سے اشد درجہ پر مشابہ ہے، بلکہ ایک قسم کی بیداری ہے۔ میں اس کا نام خواب ہرگز نہیں رکھتا اور نہ کشف کے اعلیٰ درجوں میں سے اس کو سمجھتا ہوں۔ بلکہ یہ کشف کا بزرگ ترین مقام ہے، جو در حقیقت بیداری سے بلکہ اس کشف سے زیادہ اصفی اور اجلی ہوتی ہے۔ یہ سیر اس جسم کثیف کے ساتھ نہیں تھی۔ یہی رائے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ہے۔ چنانچہ آپ فرماتی ہیں۔ **ما فقدت جسد النبی**

صلی اللہ علیہ وسلم ۔اوراکثرصوفیائے کرام کا بھی یہی مذہب ہے۔چنانچہ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اورحضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی بھی یہی رائے ہے۔

معراج مکانی اورزمانی دونوں پرمشتمل ہے۔اوربغیراس کے معراج ناقص رہتا ہے۔پس جیسا کہ سیر مکانی کے لحاظ سے خداتعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کومسجد الحرام سے بیت المقدس تک پہنچادیا تھا،ایسا ہی سیرزمانی کے لحاظ سے آنجناب کوابتدا سے انتہائی زمانہ تک شوکت اسلامی کا زمانہ دکھا دیا تھا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانی معراج سے یہ غرض تھی کہ آپ کی نظرکشفی کا کمال ظاہرہوکہ تا انقراض زمانہ جوجواسلام کوشوکت حاصل ہوگی،وہ آپ ہی کی برکات ہیں،جوآپ کی توجہ اورعقدہمت سے پیدا ہوئی ہیں۔پس اس تحقیقات سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج میں زمانہ گذشتہ کی طرف صعود ہے اورزمانہ آئندہ کی طرف نزول ہے۔اور ماحصل اس معراج کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیرالاولین والآخرین ہیں۔

معراج جومسجدالحرام سے شروع ہوا،اس میں یہ اشارہ ہے کہ صفی اللہ آدم کے تمام کمالات اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے تمام کمالات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود تھے۔اورپھراس جگہ سے قدم آنجناب علیہ السلام مکانی سیر کے طور پر بیت المقدس کی طرف گیا۔اس میں یہ اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں تمام اسرائیلی نبیوں کے کمالات بھی موجود ہیں۔اورپھراس جگہ سے قدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تاانتہائی برکات اسلامی کے زمانہ تک گیا،جس میں مسیح ابن مریم علیہ السلام کا زمانہ بھی شامل ہے۔یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ جوکچھ حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام اورتمام اولیائے کرام کوتاآخرزمانہ ملے گا،وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات میں موجود ہے۔اور پھرقدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آسمانی سیر کے طورپراوپر کی طرف گیا۔اورمرتبہ قاب قوسین کا پایا۔یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مظہرصفات الٰہی اتم اوراکمل طور پر تھے۔غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس قسم کا معراج نبوی جوزمانی مکانی دونوں رنگ کی سیرتھی۔اورنیزخداتعالیٰ کی طرف ایک سیرتھی،جوزمان اورمکان دونوں سے پاک تھی۔اس جدیدطرز کے معراج سے غرض یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیرالاولین والآخرین ہیں۔اور نیز خداتعالیٰ کی طرف سیران کا نقطہ ارتفاع پرہے کہ اس سے بڑھ کرکسی انسان کوگنجائش نہیں۔حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ معراج کے بارے میں فرماتے ہیں۔**سالت ربی عن المعراج فقیل لی المعراج عروج من کل شی سوای و کمال العروج ما زاغ البصر و ما طغیٰ.**

جب تک انسان بے خبر ہوتا ہے اس کی باتیں نری اٹکلیں ہوتی ہیں۔ ایسا ہی معراج کے متعلق لوگوں کا حال ہے۔ وہ اس کی حقیقت اور اصلیت سے بیخبر ہیں اور معراج کو بالکل بیداری میں تسلیم کرتے ہیں۔ ہاں ایک بیداری دنیاداروں کی ہے اور ایک بیداری عارفوں صادقوں نبیوں اور خدارسیدہ لوگوں کی ہوتی ہے۔ اوران دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل اور تمام صادقوں اور عارفوں کے سردار ہیں اس لحاظ سے یہ مرتبہ بھی آپ کا سب سے بڑھا ہوا ہے۔ معراج ایک کشفی معاملہ تھا۔ اور کشف دوطرح کا ہوتا ہے۔ ایک کشف ایسا ہوتا ہے کہ اس میں غیبت حس زیادہ ہوتی ہے۔ دوسرا کشف ایسا ہوتا ہے کہ وہ بالکل بیداری کے رنگ میں ہوتا ہے۔ اور دراصل وہ بیداری ہوتی ہے۔ اس قسم کے کشف کو خواب نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ ایسے کشف کو خواب کہنا ایسی غلطی ہے، جیسے کوئی دن کو رات کہے۔

اس حالت میں وہ دیکھتا ہے، جو دوسرے نہیں دیکھ سکتے۔ اور وہ اسرار مشاہدہ کرتا ہے، جو دوسروں کو نصیب نہیں ہوتے۔ اس بیداری میں جو عام لوگوں کی حالت ہوتی ہے، اس بیداری کے مقابلہ میں صدہا پردے اور حجاب ہیں۔ اگر اس کو اندھا کہیں تو زیادہ مناسب ہے۔ اور بہرہ کہیں تو موزون ہے۔ لیکن اس کشفی بیداری میں اعلیٰ درجہ کی بینائی اور شنوائی عطا ہوتی ہے۔ صاحب کشف وہ حالات دیکھتا ہے، جو کسی نے نہ دیکھے ہوں اور وہ باتیں سنتا ہے، جو کسی نے نہ سنی ہوں۔ پس اس قسم کی بیداری کے ساتھ وہ معراج تھا۔ اور ایک لطیف اور روحانی جسم آپ کے ساتھ تھا۔ انسان کے دو جسم ہیں۔ ایک زمینی اور دوسرا آسمانی۔ زمین جسم کے متعلق قرآن شریف میں آیا ہے۔ **الم نجعل الارض کفاتاً** ۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج جس جسم کے ساتھ تھا، وہ آسمانی جسم تھا۔ وہ معراج قابل تعریف نہیں، جو عوام مانتے ہیں۔

چونکہ ہر شخص اپنی حد تک بات کرتا ہے۔ بچہ اس حد تک ہی کہتا ہے، جو کھیل تک ہی محدود ہو۔ کم علم اپنی حد تک۔ اسی طرح عوام اس حقیقت سے محض ناآشنا اور ناواقف تھے۔ انہوں نے یہاں تک ہی اس راز کو سمجھا۔ ظاہری جسمانیت پر زور دینا اور روحانیت سے اعراض کرنا اہل اعتزال کا مذہب ہے۔

ہر کہ در حس ماند او معتزلی است ‎ ‎ ‎ ‎ گرچہ گوید سنی ام از جاہلی است

چشم حس را ہست مذہب اعتزال ‎ ‎ ‎ ‎ دیدہء عقل است سنی در وصال

حقیقت لوح محفوظ و قلم

(۱) حضرت امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ عالم کی ابتدائی آفرینش سے آخیر تک جو کچھ

خدا تعالیٰ نے مقرر کیا ہے۔ وہ سب ایک مخلوق الٰہی میں تحریر کیا ہے۔ کبھی اسکو لوح سے تعبیر کرتے ہیں، کبھی کتاب سے اور کبھی امام مبین سے، جیسا کہ قرآن کریم میں اسکے نام آئے ہیں۔ پس جو کچھ عالم میں ہو چکا ہے یا ہوتا چلا جاتا ہے، وہ اس میں منقوش اور نوشتہ ہے۔ لیکن اسکے نقوش اس آنکھ سے نظر نہیں آتے۔ اور یہ نہ گمان کرو کہ یہ لوح لکڑی یا لوہے یا ہڈی کی ہے یا کہ وہ کتاب کاغذ یا پتے کی قسم ہے۔ بلکہ تم کو قطعاً یہ سمجھنا چاہئے کہ خدا کی لوح مخلوق کی لوح کی طرح نہیں ہے۔ خدا کی کتاب مخلوق کی کتاب کی ہم شکل نہیں ہے۔ خدا کی ذات اور صفات بھی تو مخلوق کی ذات اور صفات سے مشابہت نہیں رکھتیں۔

اگر تم اس کی مثال چاہتے ہو، جس سے بخوبی سمجھ میں آ جائے، تو جان لو کہ لوح محفوظ میں امور کا جمنا ایسا ہے، جیسا کہ حافظ قرآن کے دماغ اور دل میں قرآن کے حروف اور کلمات منقش ہوتے ہیں۔ وہ اس کے دل و دماغ میں سب ایسے مندرج ہوتے ہیں گویا وہ پڑھتے وقت ان کو دیکھتا ہے۔ اور اگر اس کے دماغ کی تلاشی لو گے، تو اس خط کا ایک حرف بھی اس کے دماغ میں نہ پاؤ گے۔ اسی انداز پر تم کو یہ سمجھنا مناسب ہے کہ تمام مقدرات الٰہی اس لوح میں منقوش ہوتے ہیں۔

(۲) لوح سے مراد ایسے وجود سے ہے، جو اس قابل ہو کہ جو چیزیں اس پر نقش کرنی چاہئیں اس پر نقش ہو جائیں۔ اور قلم سے مراد ایسا وجود ہے، جس کے ساتھ لوح پر جو نقش کرنا چاہئیں نقش ہو جائے۔ کیونکہ قلم معلومات کی صورتوں کو لوح پر نقش کرنے والی چیز ہے۔ اور لوح وہ چیز ہے، جس پر ان معلومات کی صورتیں نقش ہوتی ہیں۔ اور یہ ضرور نہیں ہے کہ قلم نرسل کا اور لوح لکڑی کی ہو۔ بلکہ یہ بھی ضرور نہیں ہے کہ ان دونوں کے لئے جسم بھی ہو۔ کیونکہ قلم اور لوح کی ماہیت وحقیقت میں ان کا مجسم ہونا داخل نہیں ہے۔ بلکہ ان کی روحانیت ان کی حقیقت ہے۔ اور ان کی صورت ان کی حقیقت سے زائد نہیں۔ پس کچھ بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قلم اور اس کی لوح اس کی انگلیوں اور اس کے ہاتھ کے لائق ہو۔ اور یہ سب چیزیں ایسی ہوں، جو اس کی ذات کے لائق ہے۔ اور وہ پاک ہوں گی حقیقت جسمیت سے، بلکہ سب جواہر روحانی یعنی روحانی ذاتیں ہوں گی۔ بعض تو ان میں سے علم حاصل کرنے والی، مثل لوح کے، اور بعض قلم کی مانند علم دینے والی ہیں۔ **و ان اللہ تعالیٰ علم بالقلم** ۔ جواہر روحانیہ عقلیہ، جن میں تمام موجودات کا نقش ہے، شرع میں اسی کو لوح محفوظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضرت مسیح ابن مریمؑ کا بغیر باپ پیدا ہونے کا راز

حضرت یحییٰ وعیسی ابن مریم علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ولادت بطور خرق عادت ہوئی تھی۔ اور اس ولادت میں کچھ استبعاد عقلی لازم نہیں آتا۔ خدا تعالیٰ نے ان دونوں قصوں کا ایک ہی صورت میں یکے

بعد دیگرے ذکر فرمایا ہے۔ تا کہ پہلا قصہ دوسرے قصے پر گواہ ٹھہرے۔ خدا تعالیٰ نے اس خرق عادت کے امر کا ذکر حضرت یحییٰؑ سے شروع کیا اور حضرت عیسی ابن مریم علیہ السلام پر ختم کیا، تا کہ ادنیٰ خرق عادت کا انتقال اعلیٰ کی طرف ہو۔ اور حضرت یحییٰ و عیسیٰ علیہم السلام کی ایسی پیدائش، جو خرق عادت کے طور پر ہوئی، اس میں یہ بھید تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی پیدائش سے ایک عظیم الشان نشان ظاہر کرنے کا ارادہ فرمایا تھا، کیونکہ یہود نے میانہ روی و راستی کا طریق ترک کر دیا تھا۔ اور ان کے اعمال و اقوال و اخلاق میں خبث داخل ہو گیا تھا اور ان کے دل بگڑ گئے تھے۔ اور رسولوں اور بیگناہوں کو دشمنی سے ناحق قتل کرنے کے درپے رہتے تھے۔ اور فسق و فجور و ظلم و زیادتی میں حد سے گذر گئے تھے۔ اور خدا تعالیٰ کی گرفت سے بے پرواہ ہو گئے تھے۔ اور خدا تعالیٰ کو بھول گئے تھے۔ اور ان میں نور فراست نہ رہا تھا، جو ان کو لغزش سے روکتا اور راہ راستی بتاتا اور اس مجذوم کی طرح ہو گئے تھے، جس کے اعضا کٹ جائیں اور اس کی شکل مکروہ ہو جائے۔ جب ان کی حالت اس حد تک پہنچ گئی، تو خدا تعالیٰ نے ان شریروں پر اپنا غضب اور لعنت نازل فرمائی اور ارادہ کیا کہ ان کے خاندان سے نبوت کی نعمت سلب فرمائے اور ان کو ذلیل کرے۔ اور ان سے علامت عزت و کرامت اٹھالے۔ کیونکہ اگر نبوت ان کے خاندان میں باقی رہتی، تو وہی ان کی عزت کے لئے کافی تھی۔ اور اس حالت میں ممکن نہ تھا کہ ان کو ذلت کی طرف منسوب کیا جاتا۔ اور اگر نبوت عامہ عیسیٰؑ پر ختم ہوتی، تو یہودیوں کے فخر میں کچھ کمی نہ آتی۔ پس خدا تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ یہود کی بیخ کنی کرے اور ان کی ذلت و رسوائی کو محکم کرے۔ پس خدا تعالیٰ نے پہلا کام، جو اس ارادہ کے لئے ظاہر فرمایا، وہ حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کا دست قدرت سے بغیر باپ کے پیدا کرنا تھا۔ پس حضرت عیسیٰؑ کا وجود بغیر باپ کے پیدا ہونا ہمارے سرور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ارہاص اور بنی اسرائیل سے نقل نبوت کا نشان تھا۔ کیونکہ حضرت عیسیٰؑ باپ کی طرف سے بنی اسرائیل میں سے نہ تھے۔ اسی طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام کا تولد انتقال نبوت کے لئے پوشیدہ دلیل تھی، کیونکہ وہ بھی قوای اسرائیلیہ بشریہ میں سے پیدا نہیں ہوئے تھے، بلکہ خدا تعالیٰ کے محض دست قدرت سے پیدا ہوئے تھے۔ پس ان دونوں نبیوں کی پیدائش کے بعد یہود کے لئے سلسلہ نبوت کا فخر نہ رہا اور بنی اسرائیل سے بنوت کا انتقال بنی اسماعیل کی طرف ہوا۔ اور ہمارے نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا خاتمہ ہوا۔ اور خدا تعالیٰ نے یہود سے وحی اور جبرائیل کو پھیر دیا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم خاتم الانبیاء ہیں۔ ان کے بعد کوئی نبی یہود میں سے مبعوث نہ ہوگا اور وہ عزت جو یہود سے لی گئی، اس کو دوبارہ نہ ملے گی۔ توریت و انجیل و قرآن کریم میں ایسا ہی وعدہ ہو چکا ہے۔

الغرض اس میں اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ تمہاری حالتیں ایسی ردی ہوگئیں ہیں کہ اب تم میں سے کوئی اس قابل نہیں، جو نبی ہوسکے یا اس کی اولاد میں سے کوئی نبی ہوسکے۔ اسی واسطے آخری خلیفہ موسوی کو اللہ تعالیٰ نے بن باپ پیدا کیا اور بنی اسرائیل کو سمجھایا کہ اب شریعت و نبوت تمہارے خاندان سے چلی گئی۔

از روئے علم طبعی انسان بغیر باپ کے کس طرح پیدا ہوسکتا ہے؟

بڑے بڑے محقق طبیبوں نے، جو ہم سے پہلے گذر چکے ہیں، اس قسم کی پیدائش کی مثالیں لکھی ہیں اور نظیریں دی ہیں۔ ان کی تحقیق کی رو سے بعض عورتیں اس قسم کی بھی ہوتی ہیں کہ قوت رجولیت اور انوثیت دونوں ان میں جمع ہوتی ہیں اور کسی تحریک سے جب ان کی منی جوش مارے، تو حمل ہوسکتا ہے۔ ہندوؤں کی کتابوں میں بھی ایسے قصے پائے جاتے ہیں اور وہ خود بھی اس امر کے اقراری ہیں۔

یہ تعجب کی جگہ نہیں، کیونکہ جس حالت میں برسات کے ایام میں ہزارہا کیڑے مکوڑے خود بخود مٹی سے ہی پیدا ہو جاتے ہیں، تو اگر خدا نے کوئی ایسا نمونہ نوع انسان میں بھی پیدا کیا، تو کیوں اس کو انکار کی نظر سے دیکھا جائے۔ اور کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ یہ امر خدا کے قانون قدرت کے برخلاف ہے۔ حالانکہ جس قانون قدرت پر زور دے کر بعض آریہ وغیرہ اعتراض کرتے ہیں، وہ تو ان کے قول کے بموجب اول دفعہ ہی ٹوٹ چکا ہے۔ اور کروڑہا دفعہ خدا تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش دنیا میں اس موجودہ قانون کی پابندی چھوڑ دی ہے۔ پس ایسا قادر خدا جو ابتدائی دنیا میں صرف مٹی سے انسان کو پیدا کرتا رہا ہے، پھر اگر وہ کسی انسان کو صرف عورت کے نطفہ سے ہی پیدا کر دے، تو یہ کونسی تعجب کی جگہ ہے۔ ظاہر ہے کہ نطفہ بہ نسبت مٹی کے بچہ پیدا ہونے کے لئے بہت قریب استعداد رکھتا ہے۔ اور مٹی کی استعداد ایک استعداد بعیدہ ہے۔ اس وجہ سے خدا تعالیٰ نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی پیدائش کی مثال بیان کرنے کے وقت آدم کو ہی پیش کیا ہے۔ وہ فرماتا ہے۔ **اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ** ۔ ترجمہ۔ یعنی عیسیٰ ابن مریم کی پیدائش کی مثال خدا تعالیٰ کے نزدیک آدم کی ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے بنا کر کہا کہ تو زندہ ہو جا، پس وہ زندہ ہوگیا۔

علامہ شارح قانون، جو طبیب حاذق اور بڑا بھاری فلسفی ہے، ایک جگہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ یونانیوں میں یہ قصے بہت مشہور ہیں۔ بعض عورتوں کو، جو اپنے وقت میں عفیفہ اور صالح تھیں، بغیر صحبت مرد کے حمل ہو کر اولاد ہوئی ہے۔ پھر علامہ موصوف بطور رائے کے لکھتا ہے کہ یہ سب قصے افترا پر محمول نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ بغیر کسی اصل صحیح کے مختلف افراد اور مہذب قوموں میں ایسے دعاوی ہرگز فروغ

نہیں پا سکتے۔اور نہ عورتوں کو جرات ہوسکتی ہے کہ وہ زانیہ ہونے کی حالت میں اپنے حمل کی ایسی وجہ پیش کریں، جس سے اور بھی ہنسی کرائیں۔اور ہمیں اس بات سے پرہیز کرنا چاہئے کہ خواہ مخواہ ایسی تمام عورتوں پر زنا کا الزام لگائیں، جو مختلف ملکوں اور قوموں میں اور زمانوں میں مستورالحال گذر چکی ہیں۔ کیونکہ طبی قواعد کی رو سے ایسا ہونا ممکن ہے۔وجہ یہ کہ بعض عورتیں، جو بہت نادرالوجود ہیں، بباعث غلبہ رجولیت اس لائق ہوتی ہیں کہ ان کی منی دونوں طور قوت فاعلی وانفعالی رکھتی ہو۔اور کسی سخت تحریک خیال شہوت سے جنبش میں آ کر خود بخود حمل ٹھہرنے کا موجب ہو جائے۔ایسے قصے ہندوؤں میں بھی مشہور ہیں۔سورج بنسی اور چندر بنسی خاندان کی انہیں قصوں پر بنیاد پائی جاتی ہے۔

بروایت بہاؤالدین جمال العارفین شیخ عبدالرزاق کاشی پیدائش حضرت مسیح کے بارے میں لکھتے ہیں۔**انما تمثل لھابشرا سوی الخلق حسن الصورة لتتاثر نفسھا به فتحرک شھوتھا فتنزل کما یقع فی المنام من الاحتلام و امکن تولد الولد من نطفة واحدة لانه ثبت فی العلوم الطبعیة ان منی الذکر فی تولد الولد بمنزلة الانفخة من الجبن و من الانثی بمنزلة اللبن ای الفقد من منی الذکر وا لانعقاد من منی الانثیٰ لا علی معنی ان منی الذکر ینفرد بالقوة العاقدة و منی الانثیٰ ینفرد بالقوة المنعقدة بل علی معنی ان القوة العاقدة فی منی الذکر اقوی و المنعقده فی منی الانثیٰ اقوی و الا لم یمکن ان یتحدا شیئاً واحدا و لم ینعقد منی الذکر حتی یصیر جزاً من الولد فعلی ھذا اذا کان مزاج الانثیٰ قویا زکوریا کما تکون امزجة النساء الشریفة النفس القویة القویٰ و کان مزاج کبدھا حاراً کان المنی الذی ینفصل عں کلیتھا الیمنی احر کثیراً من المنی الذی ینفصل عن کلیتھا الیسریٰ فاذا اجتمعا فی الرحم و کان مزاج قویا فی الامساک و الجذب قام المنفصل من الکلیة الیمنی مقام من الرجل فی شدة قوة العقده و المنفصل من الکلیة الیسریٰ مقام من الانثیٰ فی قوة الانعقاد فیتخلق الولد ھذا و خصوصاً اذا کانت النفس متائده بروح القدس متقویة به یسریٰ اثر اتصابھا به الی الطبعیة و البدن و یغیر المزاج و یمد جمیع القویٰ فی افعالھا بالمدد الروحانی فتصیرا قدر علیٰ افعالھا بما لا بنضبط بالقیاس** ۔ترجمہ۔"حضرت مریم علیہا السلام کے آگے ایک فرشتہ عالم مکاشفہ میں خوبصورت آدمی کی شکل میں متمثل ہوا تا کہ اس کے ساتھ حضرت مریم کا نفس متاثر ہو جائے۔اور مقتضائے طبع پر متحرک ہو یا اثر خیال کے ذریعہ طبیعت میں سرایت کرے۔اور

حضرت مریم کوشہوت جوش میں آ کرانزال ہو،جیسا کہ خواب میں احتلام واقع ہوتا ہے۔حضرت مریم کو ایک ہی نطفہ سے بچہ تولد ہونا ممکن ہوا، کیونکہ علم طبعی میں یہ بات بپایہ ثبوت پہنچ چکی ہے کہ مرد کی منی بچے کے تولد کے لئے ایسی ہوتی ہے، جیسا کہ دودھ کے لئے جاگ۔اورعورت کی منی دودھ کے منزلہ ہوتی ہے، یعنی جمانا مرد کی منی سے ہوتا ہے اور جمنے کی قوت عورت کی منی میں ہوتی ہے۔اس سے یہ مرادنہیں ہے کہ مرد کی منی تنہا قوت عاقدہ یعنی جمانے کی قوت اورعورت کی منی جمنے کی قوت رکھتی ہے۔ بلکہ ہماری یہ مراد ہے کہ مرد کی منی میں جمانے کی قوت بہت قوی ہوتی ہے اورعورت کی منی میں جمنے کی قوت بہت قوی ہوتی ہے۔ورنہ ممکن ہی نہیں کہ دونوں منیاں ایک چیز ہوکرآ پس میں مل جائیں۔مرد کی منی نہیں جمتی، جب تک بچہ کی جز نہ ہوجائے۔پس اس حالت پر جب عورت کی منی میں مردمی کی قوت قوی ہو،جیسا کہ بعض شریف النفس قوی البدن عورتوں کے مزاج ہوتے ہیں۔اورعورت کا جگر گرم ہو،تو جومنی اس کے دائیں جانب کے گردہ سے علیحدہ ہوتی ہے، وہ رحم کے مزاج امساک اور جذب میں قوی ہو،تو دائیں جانب کے گردہ کی منی شدت قوت عقد میں مرد کی منی کے قائم مقام ہوجاتی ہے۔اور بائیں جانب کے گردہ کی منی جمنے کی قوت میں عورت کی منی کے قائم مقام ہوجاتی ہے۔پس بچہ پیدا ہوجاتا ہے۔بالخصوص جب نفس مؤید بروح القدس ہو،تو اس کے اتصال کا اثر طبیعت اور بدن میں سرایت کر جاتا ہے۔اور مزاج کومتغیر کردیتا ہے۔اورسارے قویٰ بامدادروحانی مؤید ہوجاتے ہیں اورطبیعت اپنے افعال میں ایسی قادرہوجاتی ہے، جواحاطہ قیاس سے باہر ہے"۔

اسی کے متعلق شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تاویل احادیث میں لکھتے ہیں۔

ان مریم حاضت فی ایام سریان قویٰ الروحانیات فی تلک البقعة فلما طهرت انتبذت الیٰ مکان بعید من الناس لتغتسل و اسدلت سترا و نزعت ثیابها فارسل الله الیها جبریل فی صورة شاب سوی الخلق ممتلیا شباباً و جمالاً فرائة مریم و هی شابة قوی المزاج فخافت علیٰ نفسها الفساد و التجئت الی الله بقلبها لیعصمها فکانت لها حالة مجیبة اما الطبیعة فحصل لها ما یحصل عند الجماع من ثوران القویٰ النسلیة کم ان النظر ربما کان سبباً للانزال و اما النفس فحصل لها الالتجاء الی الله .والاعتصام به حتی ملئت من حالة عصمیة فائضة من الغیب و اما الصورة للانسانیة فکانت علیٰ شرف الظهور لمخالطة الروح الامین و لما قال جبریل علیه السلام ان رسول ربک لا هب لک غلاماً زکیاً ابتهجت و انشرحت و

آنست و لماریٰ جبریل هذا حالها نفخ فی فرجها فدغدغت النفخة رحمها فانزلت و کان فی منیها قوة منی الذکر فحملت و التویٰ فی الجنین ما کان غالباً علیٰ مریم من الاعتصام باللہ و الالتجاء الیه و الابتهاج و الانبساط بالهیئة الملکیة فان حالتها سرت فی کل قوة من قوی نفسها حتی المصورة و المولدة و الامر ما امرا الاطباء لمن اراد ان یذکر ولده ان یتصور فی حالة الجماع غلاماً وا لتوی فیه حکم عالم المثال و خواص الروح من قبل نفخ جبریل اذا هو السبب فی التصویر مخصلت فی جبلته ملکة راسخة شبیهة بجریل و هذا معنی تائید اللہ له بروح القدس.

"حضرت مریمؑ کوقوائے روحانی کے ساری وجاری ہونے کے زمانہ میں ایام آئے۔ پھر جب اس سے پاک ہوئیں، تو علیحدہ دور ایک مکان میں گئیں، تا لوگوں سے چھپ کر وہاں غسل کریں۔ اور پردہ ڈال کے کپڑے اتارے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف جبریل کو بھیجا، ایک سڈول جوان کی صورت میں، جو جوانی اور جمال سے بھرا ہوا تھا۔ حضرت مریم علیہا السلام نے دیکھا اس کو اور یہ جوان اور قوی مزاج تھیں۔ اس لئے ڈریں کہ نفس کچھ فساد نہ کر بیٹھے۔ اور دل سے اللہ تعالیٰ کی جناب میں دعا کی کہ ان کی عصمت و پاکدامنی پر حرف نہ آئے۔ پس ان کو ایک عجیب حالت پیش آئی۔ اور اس وقت طبیعت کو وہ کیفیت حاصل ہوئی، جو مرد کی صحبت سے ہوتی ہے۔ یعنی قوائے نسلیہ کا انتشار جیسے کبھی کسی کو نظر کرنے سے انزال ہو جاتا ہے۔ اور نفس کو التجا تھی اللہ تعالیٰ سے اور اس سے امید قوی تھی۔ یہاں تک کہ حضرت مریم حالت عصمت سے، جو غیب سے فایض تھی، پُر ہو گئیں۔ اور صورت انسانیہ شرف ظہور پر تھی، بسبب حضرت جبریلؑ کے آنے کے۔ اور جب حضرت جبریل نے کہا کہ میں تیرے پروردگار کا رسول ہوں تا کہ تجھے پاکیزہ بچہ عطا کروں، تو شاد و خوش ہوگئیں۔ اور ان سے انس کیا۔ اور حضرت جبریل نے جب ان کا یہ حال دیکھا، تو ان کے ستر میں پھونک ماری۔ اس سے رحم میں گدگدی ہوئی اور منزل ہوگئیں۔ اور حضرت مریم کے نطفہ میں قوت مرد کے نطفہ کی بھی تھی۔ پس حمل رہ گیا اور جو بات حضرت مریم میں تھی وہ بچے میں آ گئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے اعتصام اور اس کی طرف التجا اور خوشی و خورمی ہیئت ملکیہ سے پس اس کی حالت سریاں کر گئی۔ ہر قوت میں ان کی قوتوں میں سے یہاں تک کہ کہ قوت مصورہ اور مولدہ ہیں۔ اور بات یہ ہے جو اطباء کہتے ہیں کہ جو شخص چاہے کہ میرے گھر میں لڑکا پیدا ہو، وہ وقت صحبت لڑکے کا تصور کرے۔ اور حضرت جبریل کے نفخہ کی طرف سے عالم مثال اور خواص روح اس میں مرکوز ہوئے، کیوں کہ حضرت عیسی کی تصویر کے وہی سبب تھے، تو حاصل ہوا ان کی جبلت میں ملکہ راسخہ متشابہ جبریل

علیہ السلام کے اور یہی معنے ہیں خدا تعالیٰ کے اس فرمودہ کے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید روح القدس سے کی تھی"۔

الغرض حضرت مسیح ابن مریم کا بغیر باپ پیدا ہونا خلاف قانون قدرت نہیں ہے۔ کیونکہ یونانی، مصری، ہندی طبیبوں نے اس مرکی بہت سی نظریں لکھی ہیں کہ کبھی بغیر باپ کے بھی بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بحکم قادر مطلق ان میں دونوں قوتیں عاقدہ اور منعقدہ پائی جاتی ہیں۔ اس لئے دونوں خاصیتیں ذَکر اور انثیٰ کی ان کے تخم میں موجود ہوتی ہے۔ یونانیوں نے بھی ایسی پیدائشوں کی نظریں دی ہیں۔ اور ابھی حال میں مصر میں جو طبی کتابیں تالیف ہوئی ہیں، ان میں بھی بڑی بھاری تحقیق کے ساتھ نظیروں کو پیش کیا ہے۔ ہندوؤں کی کتابوں کے لفظ چندر بنسی اور سورج بنسی در حقیقت انہی امور کی طرف اشارات ہیں۔ پس اس قسم کی پیدائش صرف اپنے اندر ایک ندرت رکھتی ہے، جیسے توام میں ایک ندرت ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ بغیر باپ پیدا ہونا ایک ایسا امر فوق العادت ہے، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے خصوصیت رکھتا ہے۔ اگر یہ امر فوق العادت ہوتا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ہی مخصوص ہوتا، تو خدا تعالیٰ قرآن شریف میں اس کی نظیر، جو اس سے بڑھ کر تھی، کیوں پیش کرتا۔ اور کیوں فرماتا **ان مثل عیسیٰ عندا للہ کمثل آدم خلقه من تراب ثم قال له کن فیکون**۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال خدا تعالیٰ کے نزدیک ایسی ہے، جیسے آدم کی مثال کہ خدا نے اسکو مٹی سے، جو تمام انسانوں کی ماں ہے، پیدا کیا اور پھر اس کو کہا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا۔ یعنی جیتا جاگتا ہو گیا۔ اب ظاہر ہے کہ کسی امر کی نظیر پیدا ہونے سے وہ امر بینظیر نہیں کہلا سکتا۔ اور جس شخص کے کسی عارضہ ذاتی کی کوئی نظیر مل جائے تو پھر وہ شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ صفت مجھ سے مخصوص ہے۔

عالم برزخ یعنی عذاب وثواب قبر کی حقیقت

(۱) برزخ عالمِ قبر کو کہتے ہیں۔ اصل میں لفظ برزخ لغت عرب میں اس چیز کو کہتے ہیں کہ جو دو چیزوں کے درمیان واقع ہو۔ سو چونکہ یہ زمانہ عالم بعث اور عالم نشاء اولیٰ کے درمیان واقع ہے، اس لئے اس کا نام برزخ ہوا۔ لیکن یہ لفظ قدیم ہے اور جب سے دنیا کی بنا پڑی ہے عالم درمیانی پر بولا گیا ہے۔ اس لئے اس لفظ میں عالم درمیانی کے وجود پر ایک عظیم الشان شہادت مخفی ہے۔ ایسا ہی ایک دوسرے عالم پر شہادت ہے، جو اس کے بعد عالم حشر اجساد آنے والا ہے۔ برزخ عربی لفظ ہے، جو مرکب ہے زرخ اور برّ ہے، جس کے معنے یہ ہیں کہ طریق کسب اعمال ختم ہو گیا اور ایک مخفی حالت میں پڑ گیا۔ برزخ کی حالت وہ ہے کہ جب یہ ناپائیدار ترکیب انسان تفرق پذیر ہو جاتی ہے۔ اور روح الگ اور جسم الگ ہو

جاتا ہے۔ اور جیسا کہ دیکھا گیا ہے کہ جسم کسی گڑھے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اور روح بھی ایک قسم کے گڑھے میں پڑ جاتی ہے، جس پر لفظ زخ دلالت کرتا ہے، کیونکہ وہ افعال کسب خیر یا شرّ پر قادر نہیں ہو سکتی کہ جو جسم کے تعلقات سے اس سے صادر ہو سکتے تھے۔

حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں۔(۲) **و لما کان البرزخ امراً فاصلاً بین معلوم و بین معدوم و موجود و بین معقول و غیر معقول سمّی برزخاً اصطلاحاً و هو معقول فی نفسہٖ** ۔ترجمہ۔ چونکہ برزخ معلوم اور غیر معلوم اور نابود اور بود اور معقول و غیر معقول کے درمیان ایک امر فاصل ہے، اس لئے اس کا نام برزخ ہوا۔

(۳) جب انسان اس عالم دنیا سے گزر کر عالم برزخ میں پہنچتا ہے، تو اس کے اپنے اعمال کی تاثیرات کا ظہور شروع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ موت کے بعد جو کچھ انسان کی حالت ہوتی ہے، وہ کوئی نئی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہی دنیا کی زندگی کی حالتیں زیادہ صفائی سے کھل جاتی ہیں۔ جو کچھ انسان کے عقائد اور اعمال کی کیفیت صالحہ یا غیر صالحہ ہوتی ہے، وہ اس جہان میں مخفی طور پر اس کے اندر ہوتی ہے اور اس کا تریاق یا زہر ایک چھپی ہوئی تاثیر انسانی وجود پر پڑتا ہے۔ مگر آنے والے جہان میں ایسا نہیں رہیگا۔ بلکہ تمام کیفیات کھلا کھلا اپنے چہرہ دکھلائیں گی۔ اس کا نمونہ عالم خواب میں پایا جاتا ہے کہ انسان کے بدن پر جس قسم کے مواد غالب ہوتے ہیں، عالم خواب میں اسی قسم کی جسمانی حالتیں نظر آتی ہیں۔ جب تیز تپ چڑھنے کو ہوتا ہے، تو خواب میں اکثر آگ اور آگ کے شعلے نظر آتے ہیں۔ اور بلغمی تپوں اور ریزشوں اور زکام کے غلبہ میں انسان اپنے تئیں پانی میں دیکھتا ہے۔ غرض جس طرح کی بیماریوں کے لئے بدن نے تیاری کی ہو، وہ کیفیتیں تمثّل کے طور پر خواب میں نظر آجاتی ہیں۔ پس خواب کے سلسلہ پر غور کرنے سے ہر ایک انسان سمجھ سکتا ہے کہ عالم ثانی میں بھی یہی سنت اللہ ہے۔ کیونکہ جس طرح خواب ہم میں ایک خاص تبدیلی پیدا کر کے روحانیت کو جسمانی طور پر تبدیل کر کے دکھلاتی ہے۔ اس عالم میں بھی یہی ہوگا۔ اور اس دن ہمارے اعمال اور اعمال کے نتائج جسمانی طور پر ظاہر ہوں گے۔ اور جو کچھ ہم اس عالم سے مخفی طور پر ساتھ لے جائیں گے، وہ سب اس دن ہمارے چہرہ پر نمودار نظر آئے گا۔ اور جیسا کہ انسان جو کچھ خواب میں طرح طرح کے تمثلات دیکھتا ہے اور کبھی گمان نہیں کرتا کہ یہ تمثلات ہیں، بلکہ انہیں واقعی چیزیں یقین کرتا ہے، ایسا ہی اس عالم میں ہوگا۔ بلکہ خدا کے تمثلات کا نام بھی نہ لیں اور یہ کہیں کہ وہ خداتعالیٰ کی قدرت سے ایک نئی پیدائش ہے، تو یہ تقریر بہت درست اور واقعی اور صحیح ہے۔

(۴) جیسا کہ انسانی مزاج کے اغلاط کے اعتدال و فساد سے انسان کے جسم پر اچھے یا خراب

آ ثار نمایاں ہو جاتے ہیں اور وہی اس کو خواب میں نظر آتے ہیں۔ ایسا ہی اعمال و اخلاق و اعتقادات کے اعتدال و فساد سے روح پر اچھے یا خراب آ ثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور عالم برزخ میں وہ اپنی اشکال مناسبہ پر ظاہر ہو کر انسان کے لئے سکھ یا دکھ کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً صفراوی مزاج اکثر خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ گرمی کے دن ایک خشک نیستان میں ہے، باد سموم چل رہی ہے اور دیکھتا ہے کہ آگ درخشاں نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ وہ بھاگتا ہے، لیکن موقع گریز کرنے کا نہیں ملتا اور آگ اس کو پھونک دیتی ہے۔ اس وجہ سے اس کو سخت تکلیف پہنچتی ہے۔ اسی طرح بلغمی مزاج بھی خواب میں دیکھتا ہے کہ سرما کی رات ہے، نہر جاری ہے، باد زمہریر چل رہی ہے۔ موجوں نے اس کی کشتی کو لوٹ پوٹ کر ڈالا ہے۔ وہ ہر چند بھاگنے کا قصد کرتا ہے، لیکن کوئی موقعہ نہیں ملتا اور دریا میں غرق ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے اس کو سخت تکلیف پہنچتی ہے۔ ایسا ہی دموی وسوداوی مزاج والا اپنی اخلاط کے مناسب خواب دیکھتا اور دکھ اٹھاتا ہے۔ اگر تم آدمیوں سے پوچھو، تو کسی کو ایسا نہ پاؤ گے، جس نے اس چیز کا تجربہ نہ کیا ہو کہ مجتمع حوادث کی صورتیں جوان کے اور دیکھنے والے کے نفس کے مناسب ہوں، آرام و تکلیف کے ضمن میں نظر نہ آتی ہوں۔ جو خواب میں مبتلا ہوتا ہے، اس کی یہ حالت ہوا کرتی ہے۔ لیکن یہ عالم برزخ کا خواب ایسا ہے کہ روز قیامت تک اس سے بیداری نہ ہوگی۔ خواب دیکھنے والا اپنی حالت خواب میں یہ نہیں جانتا کہ یہ چیزیں خارج میں نہیں ہیں۔ عالم برزخ کا نام عالم رویا کی نسبت سے عالم خارجی ہونا زیادہ مناسب ہے۔

(۵) جس کی قوت سبعی غالب ہوتی ہے، وہ اکثر دیکھتا ہے کہ کوئی درندہ اس کو زخمی کر رہا ہے۔ اور بخیل دیکھتا ہے کہ سانپ، بچھو اس کو کاٹ رہے ہیں۔ پس جس کے دل میں اعتقادات ردیہ اور برے اخلاق اور نفس میں بداعمال کے آ ثار جمے ہوئے ہوں، وہ اپنی اشکال پر مثل سانپ اور درندے بن کر برزخ میں اس کی روح کو کاٹتے ہیں۔ اور ان سے اس کے جسم و روح کو بڑا دکھ پہنچتا ہے۔ اور جس کے اعتقادات درست اور اخلاق اور اعمال اچھے ہوں، اس کو عالم برزخ اور بعد کی منازل میں سکھ و آرام و چین اور خوشی کی حالتیں پیش آتی رہیں گی۔ لہٰذا ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْمُؤْمِنُ فِیْ قَبْرِہٖ فِیْ رَوْضَۃٍ خَضْرَاءٍ وَ یَرْجَبُ لَہٗ قَبْرُہٗ سَبْعُوْنَ ذِرَاعاً یُضِیْئُی حَتّٰی یَکُوْنُ کَالْقَمَرِ لَیْلَۃَ الْبَدَرِ وَ قَالَ عَذَابَ الْکَافِرِ فِیْ قَبْرِہٖ یُسَلِّطُ عَلَیْہِ تِسْعَۃَ وَ تِسْعُوْنَ تِنِیْنًا ھَلْ تَدْرُوْنَ مَا التَنِیْن (ھی) تِسْعَۃَ وَ تِسْعُوْنَ حَیَّۃٍ لِکُلِّ حَیَّۃٍ سَبْعَۃَ رَؤُسْ یَخْدِ شُوْنَہٗ وَ یَلْھَسُوْنَہٗ وَ یَنْفَخُوْنَ فِیْ جِسْمِہٖ اِلٰی یَوْمٍ یَبْعَثُوْنَ۔ ترجمہ۔ مومن کو جب قبر میں رکھا جاتا ہے، تو

اس کو وہاں ایک سبز باغ میں داخل کیا جاتا ہے۔ اور اس کی قبر ستر گز کشادہ کی جاتی ہے اور اس میں چودھویں رات کے چاند کی طرح روشنی ہو جاتی ہے۔ اور فرمایا کہ کافر پر اس کی قبر میں ننانوے اژدھے مسلط کئے جاتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ اژدہا کیا ہیں۔ وہ ننانوے سانپ ہیں۔ ہر ایک سانپ کے سات سر ہوتے ہیں۔ اس کو کاٹتے اور ڈستے اور اس کے جسم پر پھنکاریں قیامت تک مارتے رہتے ہیں۔

(۶) سانپوں کی اس خاص تعداد سے تعجب نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان سانپوں اور بچھوؤں کی تعداد اخلاق مذمومہ کبر، ریا، حسد وغیرہ کی تعداد کے موافق ہوتی ہے۔ یہ صفات اصول ہیں اور ان کے فروعات بھی ہیں، جن کی تقسیم ان صفات کے موافق ہوتی ہے۔ جو مہلکہ ہیں، وہی صفات بچھو اور سانپ ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے جو زبردست صفت ہو، اس کا کاٹنا اژدھا کی مانند ہوتا ہے۔ اور جو کمزور صفت ہو، اس کا کاٹنا بچھو کی طرح ہوتا ہے۔ اور جو ان کے درمیانی قوت کی صفت ہو، اس کا ایذا ودکھ سانپ کے کاٹنے کی طرح ہوتا ہے۔ صاحبان دل وارباب بصیرت ان صفات مہلکہ اور ان کی فرعات کو نور بصیرت سے دوسرے لوگوں میں مشاہدہ کر لیتے ہیں۔

سوال۔ اگر کوئی شبہ کرے کہ ہم مدت دراز تک کافر و مومن کو قبر میں پڑا ہوا دیکھتے ہیں، لیکن سانپ اور بچھو اور بہشتی نعمتیں اور قبر کی کشادگی نظر نہیں آتی۔ پس جو امر مشاہدہ کے خلاف ہو، اس پر کس طرح یقین ہو سکتا ہے؟

جواب۔ ایسے امور کی تصدیق کرنے کے لئے تین حالتیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ یہ سب موجود ہیں۔ سانپ اور بچھو مردہ کو کاٹتے ہیں اور اس کے نفس میں موجود ہوتے ہیں۔ لیکن تم کو اس لئے نظر نہیں آتے کہ تمہاری آنکھ ان ملکوتی امور کے مطالعہ کے قابل نہیں ہے۔ عالم برزخ کے سارے واقعات عالم ملکوت میں واقع ہوتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حالات پر غور کرو کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام کے آنے کا ان کو پختہ یقین تھا۔ لیکن انہوں نے حضرت جبریل علیہ السلام کو آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ ان کو یقین تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جبریل علیہ السلام کو دیکھتے ہیں۔ اگر تمہارا اس بات پر ایمان نہیں ہے، تو پہلے فرشتوں اور وحی الٰہی پر ایمان لانے کو درست کر لینا تمہارے لئے بہت ضروری ہے۔ اور اگر تم کو اس امر کا یقین ہے اور تم گمان کر سکتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان چیزوں کا دیکھ سکتے تھے، جن کو ان کی امت نہ دیکھ سکی، تو مردہ کی حالت کو اسی پر کیوں قیاس نہیں کرتے ہو۔

(۷) جیسا کہ فرشتے کو آدمیوں اور حیوانات سے کچھ مشابہت نہیں ہے، ایسا ہی سانپ اور بچھو

بھی، جو قبر میں کاٹتے ہیں، وہ ہماری دنیا کے سانپوں کی نسل میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی اور ہی جنس ہے اور وہ ایک دوسری قسم کی حس اور قوت سے معلوم ومحسوس ہوتے ہیں۔ الغرض سانپ اور بچھو وغیرہ اسباب دوزخ اور باغ ونعمتیں وغیرہ اسباب جنت انسان کے اپنے ہی اعمال کا نقشہ ہوتے ہیں۔

دوزخ وجنت ہمیں نفس است فضل　　　　ہر چہ کاری بد روی اے با عمل

دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ تم کو سونے والے کی حالت کا خیال کرنا چاہئے۔ وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ اس کو سانپ کاٹ رہے ہیں اور وہ ان سے تکلیف اٹھا رہا ہے، حتیٰ کہ تم کبھی کبھی دیکھو گے کہ وہ چلا اٹھتا ہے۔ اس کی پیشانی پر پسینہ آ جاتا ہے اور وہ گاہے بگاہے اپنی جگہ پر سے اچھل پڑتا ہے۔ ان سب امور کو وہ اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ وہ بیدار آدمی کی طرح ان سے اذیت اور دکھ اٹھاتا ہے۔ وہ دلی آنکھ سے ان سب امور کو دیکھتا ہے اور تم اس کو ظاہر میں بالکل چپ چاپ پاتے ہو۔ اس کے آس پاس نہ سانپ ہوتے ہیں نہ بچھو۔ جب کہ اس کے احساس کے مطابق سانپ اور بچھو موجود ہیں اور اس کو ان کی طرف سے تکلیف وایذا پہنچ رہی ہے۔ لیکن تمہاری رائے میں وہ موجود نہیں ہوتے۔ تاہم جب کاٹے جانے والے کو تکلیف پہنچ رہی ہو، تو پھر یہ امر غیر اہم بن جاتا ہے کہ سانپ محض خیالی ہیں یا حسی طور پر نظر بھی آتے ہیں۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ خود سانپ تکلیف نہیں دیتا، بلکہ اس کے زہر کی سبب تمہاری یہ حالت ہو جاتی ہے۔ اور خود زہر بھی کوئی تکلیف دہ چیز نہیں ہے۔ بلکہ تم کو اس اثر کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے، جو زہر تمہارے اندر پیدا کرتا ہے۔ تو اگر زہر کے بغیر بھی ایسا ہی اثر پیدا ہو جائے، تو یقیناً اس کی تکلیف بہت زیادہ ہوگی۔ اور اس کا اندازہ صرف اسی طرح ہو سکے گا کہ اس کو کسی ایسے سبب کی طرف منسوب کریں، جس سے عادۃً ایسا اثر پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کو مباشرت کے بغیر جماع کی لذت میسر آ جائے، تو اس کو اسی طرح بیان کر سکیں گے کہ اس لذت کو مباشرت کی طرف منسوب کریں۔ دراصل سبب خود مطلوب نہیں ہوتا، بلکہ اپنے ثمرہ کی وجہ سے مطلوب ہوتا ہے۔ الغرض یہ تمام مہلک صفتیں موت کے وقت نفس میں ایذا رسان اور تکلیف دہ ہو جایا کرتی ہیں۔ ان کی تکلیف سانپوں کے کاٹنے کی سی ہوتی ہے، اگرچہ سانپ موجود نہیں ہوتے۔

(۸) جب نفوس اپنے بدنوں سے علیحدہ ہوتے ہیں اور ان میں عدالت کی صفت ہوتی ہے، تو ان کو نہایت درجہ فرحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے اور موقعہ ملتا ہے کہ اس لذت سے مسرور ہوں، جو تمام دنی لذتوں سے جدا ہوتی ہے۔ اور اگر بدنوں سے مفارقت کرنے کے بعد نفوس میں صفت عدالت نہیں

ہوتی، تو ان کا حال نہایت تنگ ہوتا ہے اور وہ متوحش اور ملول ہوتے ہیں۔

(۹) جو شخص انبیاء کی شریعتوں کی اشاعت کا مانع و منکر و اعلائے کلمۃ الاسلام سے غافل ہو، جب وہ مرجاتا ہے، تو ملائے اعلیٰ کی تمام ہیئتیں اس سے نفرت کرتی ہیں اور اسکو ایذا پہنچانے کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ اور خطا ہر جانب سے اسکا ایسا احاطہ کرلیتی ہے کہ پھر اسکو نکلنے کا موقعہ نہیں ملتا اور چونکہ وہ اپنے کمال کو نہیں پہنچتا۔ اور اگر پہنچتا بھی ہے، تو وہ پہنچنا قابل اعتبار اور لحاظ نہیں ہوتا۔ اس واسطے یہ حالت اس سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔ یہ مرتبہ آدمی کو مذاہب میں اپنے پیغمبر کے طریقہ سے باہر کر دیتا ہے۔

عذاب قبر کے متعلق حضرت سید عبدالوہاب شعرانیؒ کی کشفی شہادت

حضرت سید عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب "لَطَائِفُ الْمِنَنْ" جلد دوم کے صفحہ ۹ پر لکھتے ہیں۔ "و مما وقع لی اننی رأیت فی منامی اننی نزلت تحت الارض فرأیت اهل القبور علیٰ احوال شدیدة نسال الله العافیه، فمنهم من رأیت عنده کلباً عقوراً یعضه و یکشر علیه و منهم من رأیت عنده ذئباً و منهم من رأیت عنده تمساحاً و منهم من رأیت عنده هرةً و منهم من رأیت عنده فیراناً و منهم من رأیت عنده ثعباناً و منهم من رأیت عقرباً و منهم من رأیت عنده بعوضاً و منهم من رأیت عنده بقاً و منهم من رأیت عنده قملاً و براغیث فسالت الملائکة الذین هناک عن اصل هذه الموذیات التی تطورت فی قبورهم علیٰ هذا التفصیل فقیل هی غیبة و نمیمة و سخریاء بالناس و سوء ظن و نحو ذٰلک فاخبرونی باصولها و نزلت مرة اخریٰ الی القبور فرأیت القیامة قد قامت و رأیت جماعة واقفین و اعمالهم عنهم تصدرو الناس ینظرونها فقلت من هولاء فقال لی ملک هناک هٰذه اعمال هؤلاء القوم الذین کانوا یاکلون اوساخ الناس و یسألونهم و هم قادرون علی الکسب فحکم الله تبارک تعالیٰ اصحاب تلک القیمات فی اعمالهم یاخذ کل واحد منها ماشاء فی نظیر ما اطعمه لان تلک الصور کلها نشأت من القوة الناشئة من ذٰلک الطعام فمن اکل من کسبه کان عمله له و قد طلبت مرة من الله تعالیٰ ان یطعلنی علی ما یقع لی فی قبری فرأیت انی نائم علیٰ طراحة محشوة شوکاً و انا اتقلب علیه فلا تسأل یا اخی ما حصل لی من الالم فسأل الله اللطف. و کان سیدی علی الخواص رحمة الله تعالیٰ یقول ان هٰذه الوقائع التی تقع الانسان فی المنام جند من جنود الله تقوی ایمان صاحبها

بالغیب اذا کان اھلا لذالک ۔ترجمہ۔خواب میں دیکھا کہ میں زمین کے نیچے اترا ہوں۔اوراہل قبور کوسخت احوال میں دیکھتا ہوں۔بعض کو دیوانے کتے کاٹتے ہیں اور بھونکتے ہیں اور بعض کے پاس بھیڑیئے ہیں اوران کو کاٹتے ہیں۔اور بعض کے پاس مگر مچھ نہنگ دیکھے۔اور بعض کے پاس بلی دیکھی اور بعض کے پاس چوہے دیکھے اور بعض کے پاس سانپ اور بچھو دیکھے، جوان کو کاٹتے اور ڈستے ہیں۔اور بعض پر مچھروں کو مسلط دیکھا۔پس میں نے وہاں کے ملائکہ سے پوچھا کہ یہ موذیات، جوان لوگوں کی قبروں میں ان شکلوں سے متشکل ہیں، ان کی اصل کیا ہے۔تو مجھے کہا گیا کہ یہ غیبت، چغلی اور لوگوں کے ساتھ تمسخر اور بدظنی اور دیگر امور قبیحہ ہیں۔پس مجھے انہوں نے سب اصولوں کی خبر دی۔اور میں دوسری بار قبور میں اترا تو دیکھا کہ قیامت قائم ہے اور ایک گروہ کو دیکھا کہ کھڑے ہیں اور ان کے اعمال ظاہر ہو رہے ہیں۔اور لوگ ان کو دیکھ رہے ہیں۔تو میں نے کہا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ مجھے کہا گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں، جو لوگوں کی میل یعنی صدقات کھاتے ہیں۔اور ان سے سوال کرتے ہیں، حالانکہ وہ کسب وکمائی پر قادر ہو سکتے ہیں۔پس خدا تعالیٰ نے ان قوتوں والوں کو ان کے اعمال میں حکم کیا کہ جو کچھ انہوں نے کمایا ہے اس کی نظیر کھائیں۔کیونکہ وہ سب صورتیں اس طعام کی قوت نامیہ سے پیدا ہوئی ہیں۔پس جو شخص اپنی کمائی میں سے کھائے گا، تو اس کا عمل اس کے اپنے کام آئیگا۔اور ایک دفعہ میں نے خدا تعالیٰ سے سوال کیا کہ مجھے قبر میں جو کچھ واقع ہونیوالا ہے اس پر مطلع فرمایا جائے۔پس میں نے دیکھا کہ ایک کانٹوں کی بھری ہوئی توشک پر لیٹا ہوں اور اس پر لوٹ پوٹ رہا ہوں۔پس اے بھائی اس درد کے بارے میں، جو مجھے اس وقت ملا، اس کے بارے میں نہ پوچھ۔خدا تعالیٰ سے نرمی طلب کرو۔حضرت علی الخواص رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے تھے کہ جو واقعات انسان کو خواب میں نظر آتے ہیں، وہ خدا تعالیٰ کے لشکروں میں سے ہوتے ہیں، جن کے ساتھ انسان کا ایمان قوی ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ ان امور کا اہل ہو۔

عذاب وثواب قبر پراعتراضات

اور حضرت ابن قیم جوزیؒ کے ان پر فلسفیانہ جوابات

حضرت ابن قیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ کے آگے مندرجہ ذیل اعتراضات عذاب وثواب قبر کے متعلق پیش کئے گئے کہ ملحد وزندیق منکرانِ عذاب وثواب قبر کو ہم کیا جواب دیں، جو کہتے ہیں کہ قبر دوزخ کے گڑھوں میں سے گڑھا یا بہشت کے باغوں میں سے باغ کیونکہ ہو سکتی ہے اور کیونکہ کشادہ اور تنگ ہو سکتی ہے، جب کہ میت نہ اس میں بیٹھ سکتی ہے اور نہ کھڑی ہو سکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ہم قبر کو

کھولتے ہیں، تو اس میں نہ تو اندھے اور گونگے فرشتے دیکھتے ہیں، جو مردوں کو لوہے کی گرزوں اور ہتھوڑوں سے مارتے ہیں اور نہ وہاں پر سانپ اور اژدھے دیکھتے ہیں اور نہ بھڑکتی ہوئی آگ محسوس کرتے ہیں۔ اور اگر میت کے احوال میں سے کوئی حال قبر کھود کر معلوم کرنا چاہئیں، تو ہم میت کو اسی ایک ہی حالت غیر متغیرہ پر پاتے ہیں۔ اور اگر ہم اس کی آنکھ پر سیماب یا اس کے سینے پر رائی کا دانہ رکھیں، تو اس کو اسی حالتِ غیر متغیرہ پر پاتے ہیں۔ پھر مردہ پر قبر کس طرح فراخ یا تنگ ہوسکتی ہے، جب کہ ہم اس کو اسی حالت پر دیکھتے ہیں اور قبر کی کشادگی کو اسی حد پر پاتے ہیں، جس حد پر ہم نے اس کو کھودا تھا، وہ نہ زیادہ ہوتی ہے اور نہ تنگ ہوتی ہے۔ اور قبر کی لحد میں تنگی کس طرح ممکن ہوسکتی ہے۔ اور فرشتے یا وہ صورت جو مردہ کے ساتھ انس پکڑیں یا اس کو ڈرائیں، قبر میں کس طرح سما سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر ایسی بات جو عقل اور مشاہدہ کے برخلاف ہو، وہ کہنے والے کی قطعی خطا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مصلوب کو ہم مدت دار تک لکڑی پر آویزاں دیکھتے ہیں۔ وہاں اس سے نہ کوئی منکر نکیر سوال کرتا ہے، نہ وہ حرکت کرتا ہے اور نہ اس کے جسم پر آگ دھکتی ہوئی دیکھی جاتی ہے۔ اور جس کو درندوں نے پھاڑ کھایا ہو اور پرندوں نے نوچ لیا ہو اور اس کے ٹکڑے درندوں کے پیٹوں اور پرندوں کے پوٹوں اور سانپوں کے شکموں اور ہواؤں کے طبقوں میں الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ اس کے ٹکڑوں سے الگ الگ ہو جانے کے بعد کس طرح سوال و جواب ہونا ممکن ہوسکتا ہے۔ اور جس کے جسم کے ٹکڑوں کی یہ حالت ہو جائے، اس کے ساتھ دو فرشتوں منکر و نکیر کا سوال و جواب کس طرح ہونا ممکن ہے۔ اور ایسے شخص پر قبر بہشت کے باغوں میں سے باغ یا دوزخ کے گڑھوں میں سے گڑھا کس طرح ہونا ممکن ہے۔ اور کس طرح قبر اس پر تنگ ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ مردہ کی پسلیاں قبر کے گھٹنے سے اِدھر کی اُدھر ہو جائیں۔

جوابات۔ ہم پہلے چند باتیں بطور تمہید لکھتے ہیں، جن سے جوابات واضح ہو جائیں گے۔

(۱) رسولوں نے ایسی کوئی بات نہیں بتائی، جس کو عقلیں محال جانیں اور وہ اسکے محال ہونے پر قطعی حکم دے سکیں، بلکہ رسولوں کا خبر دینا دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ ہے، جس پر عقل اور فطرت گواہی دیں۔ (۲) دوسرے وہ خبریں رسولوں نے دی ہیں، جن کو محض عقل دریافت نہ کر سکے۔ مثلاً غیب کی باتیں، جو رسولوں نے عالم برزخ اور قیامت اور عذاب کے متعلق مفصل بیان فرمائی ہیں۔ رسولوں کی خبریں از روئے عقل ہائے سلیمہ محال نہیں ہوتی ہیں۔ ہر بات، جس کو عقل محال سمجھتی ہے، اس کا حال دو باتوں سے خالی نہیں ہوتا، ایک تو یہ کہ وہ بات جھوٹی بنا کر رسولوں کی طرف منسوب کی گئی ہو، یا سمجھنے والی عقل ہی فاسد ہو۔ وہ ایک خیال اور وہم ہے، جس کو صاحبِ خیال اپنے فہم غلط میں نہایت معقول سمجھتا

ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ یَرَی الَّذِیْنَ اُوْتُو الْعِلْمَ اَلَّذِیْ اُنْزِلَ مِنْ رَبِّکَ ھُوَ الْحَقُّ وَ یَھْدِیْ اِلٰی صِرَاطَ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدُ. فَمَنْ یَّعْلَمُ اِنَّمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَبِّکَ الْحَقُّ کَمَنْ ھُوَ اَعْمٰی وَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنَاھُمُ الْکِتَابَ یَفْرَحُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ یُّنْکُرُہ ۔ترجمہ۔ دیکھتے ہیں وہ لوگ، جن کو علم دیا گیا ہے اس کتاب کو، جو تیرے رب کی طرف سے اتری کہ وہ سچی راہ دکھاتی ہے خدا تعالیٰ غالب اور ستودہ صفات کے راستہ کی طرف۔ کیا وہ جو جانتا ہے کہ یہ کتاب تجھ پر تیرے پروردگار کی طرف سے اتاری گئی ہے، اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے، جو اندھا ہے۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ خوش ہوتے ہیں اس پر جو کچھ اترا تیری طرف، پھر بھی بعض گروہ اس سے انکار کر رہے ہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ نفوس انسانی محال بات پر خوش نہیں ہوتے۔ اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے جن باتوں کی خبر دی ہے، ان کو سمجھنا انسانوں کے لئے محال نہیں ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ یَاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَ تْکُمْ مَوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ شِفَاءٌ لِمَا فِی الصُّدُوْرِ وَ ھُدًی وَ رَحْمَۃٌ لِلْمُؤْمِنِیْنَ. قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَ بِرَحْمَتِہٖ فَلِذَالِکَ فَلْیَفْرَحُوْا ھُوَ خَیْرٌ مِمَّا یَجْمَعُوْنَ ۔ ترجمہ۔ "اے لوگو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لئے پند ونصیحت اور سینوں سے شک وشبہات کی بیماری کو دور کرنے والی دوا اور ہدایت مومنوں کے لئے رحمت بن کر آئی ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت سے۔ خوش ہو اس پر کہ قرآن ان مالوں سے بہتر ہے، جس کو لوگ جمع کرتے ہیں"۔ اگر قرآن کریم کی باتیں میں سمجھنے کے لئے محال ہوتیں، تو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ محال بات نہ تو شافی ہوتی ہے اور نہ اس کے ساتھ ہدایت ہوسکتی ہے اور نہ رحمت مل سکتی ہے اور نہ کوئی اس سے خوش ہوسکتا ہے۔ پس جب کہ قرآن کریم سینوں کے شک وشبہات کی بیماری کو شفا دینے والا اور مومنوں کے لئے رحمت اور موجب ہدایت ہے، تو اس کو سمجھنے سے وہی قاصر ہے، جس کے دل میں کوئی نیکی قرار نہ پکڑے اور نہ اسلام پر اس کا قدم ثابت ومحکم ہوا ہو۔ ایسے شخص کا حال حیرانی وسرگردانی میں گزرتا ہے۔

دوسرا امر یہ ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مراد کو افراط وتفریط کے بغیر سمجھا جائے۔ اور آپ کے کلام سے وہ چیز مراد نہ لی جائے، جس کا آپ نے ارادہ نہ کیا ہو۔ اور آپ کے ارادۂ ہدایت و بیان میں کمی وبیشی نہ کی جائے۔ جو شخص آپ کی مراد ومطلب سے اور طرف پھر جاتا ہے اور اس کے قرار واقعی معنوں کو سمجھنے میں غفلت وکوتاہی کرتا ہے، وہ سیدھے راستے سے بھٹک جائیگا۔ خدا اور رسول کے کلام کو سمجھنے میں لوگوں سے غلط فہمیاں واقع ہونے کے سبب اسلام میں بہت سے گمراہ اور بدعتی فرقے پیدا ہو

گئے ہیں۔مثلاً قادریہ۔ملحد خارجی،معتزلہ،جہمیہ،رافضی وغیرہ۔ یہاں تک کہ دین اسلام اکثر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا ہے، جو غلط فہمی سے کچھ کا کچھ سمجھ رہے ہیں۔اور جو کچھ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد تھی اور جو کچھ صحابہ کرام نے سمجھا تھا،اس کو اکثر لوگوں نے چھوڑ دیا ہے اور اس کی طرف بہت کم التفات کرتے ہیں۔

تیسرا امر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین مقام انسان کیلئے ٹھہرائے ہیں۔(۱) دنیا۔(۲) برزخ۔(۳) دارقرار۔اور ہر ایک مقام کے لئے علیحدہ علیحدہ احکام مقرر کئے ہیں، جو اسی سے مخصوص ہیں۔ انسان کو بدن اور نفس سے مرکب کیا اور دنیا کے احکام بدنوں پر ٹھہرائے۔اور روحوں کو بدنوں کے تابع کیا۔اس لئے شرعی احکام ان حرکات سے مرکب کئے ہیں، جو زبان اور اندا موں سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اگرچہ دلوں میں کچھ اور باتیں چھپی ہوئی ہوں۔اور خدا تعالیٰ نے برزخ کے احکام روحوں پر ٹھہرائے اور جسموں کو روحوں کے تابع کیا۔پس جیسا کہ روح دنیا کے احکام میں بدنوں کے تابع ہوکر بدن کے دکھی ہونے سے دکھی ہوتی اور لذت پانے سے لذت پاتی ہے، کیونکہ جسم ہی تو اسباب سکھ اور دکھ کماتے ہیں، قبر یعنی عالم برزخ میں جسم دکھوں اور سکھوں میں روح کے تابع ہو جاتا ہے۔جب روح دکھ اور سکھ سہتی ہے،تو بدن بھی اس دکھ اور سکھ میں اس کے تابع ہو جاتا ہے۔بدن اس جگہ ظاہر ہے اور روح پوشیدہ ہے۔ اور بدن روح کے لئے قبر کی طرح ہے۔اور عالم قبر یعنی عالم برزخ میں روح ظاہر و غالب ہوگی اور بدن پوشیدہ ہوں گے اور برزخ کے احکام ارواح پر جاری ہوں گے۔یعنی جب دکھ وسکھ روح کو پہنچے گا،تو وہ صاحب روح کے جسم میں بھی سرایت کرے گا،جیسا کہ دنیا میں اگر جسم کو کچھ راحت یا دکھ پہنچے،تو اس کا اثر روح میں بھی سرایت کر جاتا ہے۔ایسا ہی قبر میں روح کو دکھ وسکھ پہنچنے سے اس کا اثر جسم پر بھی ہوگا۔

خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت ولطف واحسان سے اس امر کا نمونہ دنیا میں بھی سونے والے کے حال سے ظاہر و باہر کر دیا ہے۔ کیونکہ خواب میں جو دکھ وسکھ سونے والے کو پہنچتا ہے، وہ اس کی روح پر جاری ہوتا ہے اور اس میں بدن بھی اس کے تابع ہو جاتا ہے۔بعض اوقات اس دکھ یا سکھ کا ایسا قوی اثر ہوتا ہے کہ اس کی تاثیر جسم پر علانیہ طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔مثلاً بعض اوقات کوئی شخص خواب میں دیکھتا ہے کہ اس کو کسی نے خواب میں مارا ہے اور زدوکوب کیا ہے،تو اس زدوکوب کے آثار بیداری پر اس کے بدن پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔اور گاہے کوئی شخص خواب میں دیکھتا ہے کہ اس نے کچھ کھایا یا پیا اور جب جاگتا ہے، تو اس طعام اور شربت کا اثر اس کے منہ میں موجود ہوتا ہے اور اس کی بھوک و پیاس رفع ہو جاتی ہے۔اور مرض "یقظۃ النومی" میں اس سے بھی بڑھ کر عجیب وغریب بات ملاحظہ کی گئی ہے کہ تم سونے والے کو دیکھو

گے کہ نیند میں اٹھ کر ادھر ادھر چلتا پھرتا یا کوئی کام کرتا یا لکھتا پڑھتا ہے۔ گویا دیکھنے والے کو وہ جاگتا ہوا معلوم ہوتا ہے، حالانکہ وہ سویا ہوا ہوتا ہے اور اس کو ان باتوں کا کوئی شعور نہیں ہوتا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ کیونکہ جب اس کی روح پر حکم جاری ہوا، تو روح نے باہر سے بدن سے مدد لے لی۔ پس خوب یاد رکھو کہ جب روح کو دکھ پہنچتا ہے یا وہ سکھ پاتی ہے، تو اس درد یا سکھ کا اثر بطور متابعت اس کے جسم تک پہنچ جاتا ہے۔ تو ایسا ہی عالم برزخ میں بھی جسم اور روح کے لئے دکھ و سکھ کا طریق جاری ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہوگا۔ کیونکہ اس عالم میں روح کا تجرد اور ظاہر ہونا بہت کامل ہوتا ہے۔ اور روح کا تعلق ایک نا معلوم وجہ کے سبب بدن سے بھی رہتا ہے۔ بدن سے اس کا مکمل انقطاع اور جدائی عمل میں نہیں آتی۔ الغرض جب کہ یہ ثابت شدہ بات اور مسلم امر ہے کہ کبھی روح جسم پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور کبھی جسم روح پر اپنا اثر ڈالتا ہے، جیسے اگر روح کو کوئی خوشی پہنچتی ہے تو اس خوشی کے آثار یعنی بشاشت اور چمک چہرے پر بھی نمودار ہو جاتی ہے۔ اور کبھی جسم کے آثار ہنسنے اور رونے کے روح پر بھی پڑتے ہیں۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ روح کو دکھ یا سکھ پہنچنے سے جسم پر بھی اس کا اثر ہو جاتا ہے۔

الغرض جب کہ یہ ثابت شدہ ہے اور مسلم امر ہے کہ کبھی روح جسم پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور کبھی جسم روح پر اپنا اثر ڈالتا ہے، جیسے اگر روح کو کوئی خوشی پہنچتی ہے، تو اس خوشی کے آثار یعنی بشاشت اور چمک چہرہ پر بھی نمودار ہوتی ہے اور کبھی جسم کے آثار ہنسنے رونے کے روح پر پڑتے ہیں۔ تو اس سے ثابت ہوا کہ ایک چیز یعنی روح کو دکھ سکھ پہنچنے سے جسم پر بھی اس کا اثر ہو جاتا ہے۔

جب حشر اجساد ہوگا اور لوگ قبروں سے اٹھیں گے، تو اس دن سکھ اور دکھ کا حکم روح اور جسم دونوں پر غالب و ظاہر و باہر ہوگا۔ مذکورہ بالا بیانات سے تم پر واضح ہو گیا ہوگا کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عذاب قبر اور اسکے سکھ و دکھ، ثواب و عذاب اور تنگی اور کشادگی اور اسکے گھوٹنے اور اسکے دوزخ کا گڑھا ہونے یا بہشت کا باغ ہونے کی خبر دی ہے، وہ عقل کے مطابق ہے۔ یہ بات سچ ہے اور اس میں کچھ شک وشبہ نہیں۔ اگر کسی پر یہ بات سمجھنی مشکل ہو، تو یہ اسکی اپنی غلط فہمی اور قلت علم کے سبب ہے۔

(۳) اس سے زیادہ عجیب تر یہ بات ہے کہ دو شخص ایک ہی بستر پر سوئے ہوں اور ایک کی روح کو سکھ و چین ملے اور جب جاگے، تو سکھ و آرام و راحت کے آثار اس کے بدن پر ظاہر ہوں۔ اور دوسرے کی روح کو دکھ پہنچتا ہے۔ اور جب جاگتا ہے، تو دکھ و عذاب کا اثر اس کے بدن پر ہوتا ہے۔ اور ایک کو دوسرے کے حال سے اطلاع نہیں ہوتی۔ اسی پر عالم برزخ کے عذاب و ثواب کا استدلال کر لو۔ ان تمام دلائل مذکورہ بالا سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی اصول کی رو سے جسم کی رفاقت روح کے ساتھ

دائمی ہے، گوموت کے بعد جسم روح سے الگ ہوجاتا ہے۔مگر عالم برزخ میں مستعار طور پر ہر روح کو کسی قدر اپنے اعمال کا مزا چکھنے کے لئے جسم ملتا ہے۔ وہ جسم اس جسم کی قسم میں سے نہیں ہوتا، بلکہ وہ جسم نور سے یا تاریکی سے تیار ہوتا ہے، جیسا کہ اعمال کی صورت ہو۔ گویا اُس عالم میں انسان کی عملی حالتیں جسم کا کام دیتی ہیں۔ ایسا ہی خدا تعالیٰ کے کلام میں بار بار آیا ہے۔اور بعض جسم نورانی اور بعض ظلمانی قرار دیئے گئے ہیں، جو اعمال کی روشنی میں یا اعمال کی ظلمت سے تیار ہوتے ہیں۔اگرچہ یہ ایک دقیق راز ہے، مگر غیر معقول نہیں۔انسان کامل اِسی زندگی میں ایک نورانی وجود اس کثیف جسم کے علاوہ پاسکتا ہے۔ اور عالم مکاشفات میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں، جس کسی کو عالم مکاشفات میں سے کچھ حصہ ملا ہے، وہ اس قسم کے جسم کو، جو اعمال سے تیار ہوتا ہے، تعجب اور استبعاد کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔

غرض یہ جسم جو اعمال کی کیفیت سے بنتا ہے، یہی عالم برزخ میں نیک و بد کی جزا کا موجب ہو جاتا ہے۔ اصحاب مکاشفہ کی عین بیداری میں مُردوں سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ فاسقوں اور گمراہی اختیار کرنے والوں کا جسم ایسا سیاہ دیکھتے ہیں کہ گویا وہ دھوئیں سے بنایا گیا ہے۔ بہر حال مرنے کے بعد ہر کسی کو ایک جسم ملتا ہے، نورانی یا ظلمانی۔

(۴) خدا تعالیٰ نے امور آخرت کو مکلفوں کے دریافت کرنے اور پانے سے در پردہ اور پوشیدہ رکھا ہے۔اور یہ بات خدا تعالیٰ کی کمال حکمت پر دال ہے، تاکہ مؤمن ایمان بالغیب کے ساتھ منکریں سے متمیّز ہوجائیں۔

فرشتے قریب المرگ آدمی پر اترتے ہیں اور اس کے نزدیک آکر بیٹھتے ہیں اور وہ ان کو دیکھتا ہے۔اور وہ اس کے پاس باتیں کرتے ہیں اور ان کے پاس اس کے لئے کفن کی خوشبو بہشت میں سے یا بدبو دوزخ کے اسباب میں سے لاتے ہیں۔اور وہ حاضرین کے سلام و دعا پر آمین بالخیر یا آمین بالشّر کہتے ہیں۔اور بسا اوقات قرب المرگ آدمی کو سلام دیتے ہیں اور وہ ان کے سلام کا جواب کبھی الفاظ میں اور کبھی اشاروں سے اور کبھی دل سے دیتا ہے، جب کہ وہ نہ تو بات کرسکتا ہے اور نہ اشارہ۔ بسا اوقات قریب المرگ آدمی کہتے ہیں۔خوش آمدید، مگر مردہ کے سوا حاضرین میں سے کوئی ان فرشتوں کو نہیں دیکھتا۔اس بارے میں بے شمار آثار ہیں اور ان سب کی شہادتوں سے بڑھ کر خدا تعالیٰ کی شہادت کافی ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَلَوْ لَا اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ وَ اَنْتُمْ حِنِیْذٍ تَنْظُرُوْنَ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ وَ لٰكِنْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۔ترجمہ۔(تم کیوں مردہ کی مدد نہیں کرسکتے ہو) جب کہ اس کی روح حلقوم تک پہنچ جاتی ہے اور تم اس وقت صرف تکتے رہ جاتے ہو۔اور ہم اس کے پاس تم سے

زیادہ قریب ہوتے ہیں۔لیکن تم نہیں دیکھ سکتے۔(ورنہ تم اس کو چھڑانے کی کوشش کرتے)۔یعنی مردہ کے پاس ہمارے فرشتے اور قاصد نزدیک تر ہوتے ہیں،مگر تم ان کونہیں دیکھ سکتے۔

امور آخرت میں سے یہ پہلا امر ہے، جو اس دنیا میں ہمارے درمیان واقع ہوتا ہے اور باوجود اس دنیا میں واقع ہونے کے ہم کو دکھائی نہیں دیتا۔پھر فرشتہ روح کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کو قبض کر لیتا ہے اور روح سے بات چیت کرتا ہے۔مگر حاضرین نہ تو فرشتے کو دیکھتے ہیں، نہ اس کی آواز کو سنتے ہیں۔پھر روح نکلتی ہے اور اس کا نور آفتاب کی شعاعوں کی طرح اور اس کی خوشبو مشک سے زیادہ ہوتی ہے۔مگر حاضرین میں سے کسی کو یہ سب کچھ نظر نہیں آتا اور نہ وہ خوشبو کو سونگھ سکتے ہیں۔پھر وہ فرشتہ روح کو لے کر ملائکہ کے گروہ میں جا ملتا ہے اور حاضرین (یعنی وہاں پر موجود انسان) اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ پھر روح واپس آ کر مردہ کا نہلانا اور اس کا اٹھانا دیکھتی ہے اور کہتی ہے۔ مجھے آگے لے چلو، مجھے آگے لے چلو یا کہتی ہے کہ مجھے کہاں لئے جاتے ہو۔اور لوگ اس کی کوئی بات نہیں سن سکتے۔

(۵) لحد قبر میں مردے کے پاس فرشتے کے پہنچنے کی صورت۔ جب مردے کو لحد میں رکھا جاتا ہے اور اس کی قبر پر مٹی ڈالی جاتی ہے،تو مٹی فرشتوں کو مردے کے پاس جانے سے نہیں روک سکتی۔ بلکہ اگر پتھر بھی کندہ کیا جائے اور مردے کو اس میں رکھ کر اس پتھر کو قلعی سے سربمہر کر دیا جائے،تب بھی یہ امر فرشتہ کیلئے مردے کے پاس پہنچنے میں مانع نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اجسام کثیفہ ارواح لطیفہ کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔ بلکہ ان اجسام کثیفہ سے تو جن بھی گزر جاتے ہیں۔خدا تعالیٰ نے پتھر اور مٹی کو فرشتوں کیلئے ایسا بنایا ہے،جیسا کہ فضا کے پرندوں کے لئے ، جو اس میں اڑتے پھرتے ہیں۔اور قبر کی فراخی وکشادگی اور اس کا روح کیلئے وسیع ہونا بالذات ہوتا ہے اور بدن کو روح کی متابعت میں کشادگی مل جاتی ہے۔ورنہ جسم تو بہت تھوڑی جگہ میں سمایا ہوا ہوتا ہے۔اس کیلئے قبر اسکی متابعت میں کھولی جاتی ہے۔

(٦) ضغطة القبر۔قبر کا مردے کو گھٹنا حق ہے۔مردے کی پسلیاں اِدھر کی اُدھر ہو جاتی ہیں، اس میں کچھ شک نہیں اور نہ اس بات کو عقل اور مشاہدہ اور فطرت رد کر سکتے ہیں۔اور اگر کوئی شخص مردے کی قبر کو کھود کر اس کو دیکھے،تو اس کی پسلیاں اسی پہلی حالت پر ہوتی ہیں، اِدھر کی اُدھر دکھائی نہیں دیتیں۔ خدائے قادر مطلق کو کوئی بات نہیں روک سکتی کہ وہ مردے کی پسلیاں قبر میں گھٹنے کے بعد پہلی حالت پر نہ لوٹا دے اور وہ پہلی حالت پر آ جائیں۔زندیقوں کے پاس سوائے تکذیب رسول کے اور کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ فوٹو گرافی والے کسی چیز کا نقشہ کھینچ کر بعینہٖ دکھا سکتے ہیں۔تو کیا وہ قادر مطلق اس بات پر قادر نہیں ہے کہ اپنی پیدا کردہ چیز کا نقشہ وصورت پہلی حالت پر لوٹا کر قائم رکھے کہ پردۂ

بالغیب کی حکمت قائم رہے۔

☆ قبر کے فرشتوں اور آتش جہنم ونعمائے جنت کے نہ دکھائی دینے کی وجہ☆۔قبر کی آگ اور سبزی نہ دنیا کی آگ کی قسم سے ہوتی ہے اور نہ دنیا کی کھیتی وسبزہ کی مانند ہے، جو دیکھ کر معلوم ہو سکے۔ اور آگ کو دیکھنے والا دنیا کی آگ یا سبزی کو دیکھ سکے۔ وہ تو آخرت کی آگ اور آخرت کی سبزی کی قسم سے ہوتی ہے۔ وہ آگ دنیا کی آگ سے زیادہ تیز اور سخت ہے۔ اوراس کو اہل دنیا معلوم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اہل قبر پر وہی مٹی اور پتھر، جو اس کے اوپر اور نیچے ہوتے ہیں، گرم کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ دنیا کی حرارت سے وہ حرارت بہت سخت ہوتی ہے اور اگر اہل دنیا اس آگ کو چھوئیں، تو معلوم کر سکیں۔ یہ بات طلسمات الٰہی میں سے ہے کہ ایک چیز کو وہ سامنے دکھ دیتا ہے، تو بعض اس کو دیکھتے ہیں اور بعض اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ یہ امر اس لئے ہوا کہ پردۂ بالغیب کی حکمت قائم رہے۔

(۷) اس سے عجیب تر یہ بات ہے کہ دو شخصوں کو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو دفن کیا جائے اور انکے اعمال متفرق ہوں، تو ان میں سے ایک دوزخ کے گڑھے میں جلتا ہے اور اسکے پاس والے پر دوزخ کی حرارت نہیں پہنچ سکتی۔ اور دوسرا بہشت کے باغ میں ہوتا ہے اور اسکے پاس والے دوزخی کو اس کے آرام وچین سے حصہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بات بھی طلسمات الٰہی میں سے ہے۔ اور خدا تعالےٰ ان باتوں پر قادر ہے، کیونکہ جب کہ اس نے انسان کو ایسے ایسے ہنر سکھائے ہیں کہ وہ اپنی ایک چیز میدان میں رکھ کر اس پر بعض کو اطلاع دیتا اور دکھاتا ہے اور بعض کی اس سے چشم بندی کر دیتا ہے۔ تو پھر خدا تعالیٰ، جو خالق الکل ہے اور قادر مطلق ہے، اس کے آگے ایسے امور کس طرح ناممکن ومشکل ہو سکتے ہیں۔ وہ قادر ہے کہ قبر کی مٹی اور پتھروں کو کافر کے لئے مثل تنور گرم کر دے اور وہی پتھر اور مٹی اس کیلئے دوزخ بن جائیں اور ان سے اس کو عذاب پہنچے۔ اور وہ قادر ہے کہ ایسے عذاب وثواب قبر سے اپنے بعض بندوں کو مطلع کر دے اور بعض کو نہ دکھائے اور ان کی آنکھوں پر پردہ رکھے، تا کہ ایمان بالغیب کی حکمت ان سے زائل نہ ہو جائے۔ وہ قادر ہے کہ اس قبر کی مٹی اور پتھروں کو ایک کیلئے بہشت کے باغ وسبزہ زار وغیرہ نعمائے بہشت کی شکل میں دکھائے اور دوسرے کیلئے سزائے جہنم کی شکل میں ظاہر کرے۔

باد و خاک و آب و آتش بندہ اند	بامن تو مردہ باحق زندہ اند
پیش حق آتش ہمیشہ در قیام	ہمچو عاشق روز و شب بیجا مدام
ہر یکے زا جزائے عالم یک بیک	بر غبی بند است و بر استاد فک
بر یکے قند ست و بر دیگر و زہر	بر یکے لطف است و بر دیگر چو قہر
بر یکے دیو ست و بر دیگر چو حور	بر یکے نار است و بر دیگر چو نُور
بر یکے گنج است و بر دیگر چو مار	بر یکے درد است و بر دیگر چو خار
بر یکے شیریں و بر دیگر چو ترش	بر یکے مبہوت و بر دیگر چو ہش
بر یکے پنہاں و بر دیگر عیاں	بر یکے بودست و بر دیگر زیاں
بر یکے بند ست و بر دیگر کشاد	بر یکے قید است و بر دیگر مراد
بر یکے نوش است و بر دیگر چو نیش	بر یکے بیگانہ بر دیگر چو خویش
بر یکے روز است و بر دیگر چو شب	بر یکے عیش است و بر دیگر تعب
بر یکے محبوب است و بر دیگر عدو	بر یکے راہ است و بر دیگر کدو
بر یکے آب است و بر دیگر چو خوں	بر یکے اعجاز و بر دیگر فسوں
بر یکے حلوا و بر دیگر چو سم	بر یکے سنگ و بر دیگر صنم
بر یکے جسم است و بر دیگر چو روح	بر یکے حبس است و بر دیگر فتوح
بر یکے تیر است و بر دیگر کماں	بر یکے مال است و بر دیگر سناں
بر یکے نقص است و بر دیگر کمال	بر یکے ہجر است و بر دیگر وصال

جب لوگوں نے مردہ کو دفن کیا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم مردہ کو دفن نہ کرتے، تو میں خدا تعالیٰ کے آگے دعا کرتا تا کہ تم کو عذاب قبر میں سے کچھ سناتا، جو میں سنتا ہوں۔

چونکہ ایمان بالغیب کی حکمت بہائم و مواشیوں کے حق میں نہیں ہے، لہٰذا وہ مردے کی پکار و فریاد کو سنتے ہیں اور محسوس و معلوم کرتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے آپ کے خچر نے خبر دی تھی اور نزدیک تھا کہ وہ آپ کو گرا دیتا، جب کہ اس قبر کے پاس سے گزرا، جس میں مردے کو عذاب دیا جا رہا تھا۔

(۸) اللہ تعالیٰ اس سے بھی عجیب تر کام دنیا میں کرتا ہے۔ وہ اکثر آدمیوں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اترتے اور ایک مرد کی شکل پر متمثل ہو کر آپ

سے کلام کرتے اور آپ سنتے تھے۔اور جو لوگ نبی علیہ السلام کے آس پاس بیٹھے ہوتے، وہ نہ تو فرشتہ کو دیکھتے تھا اور نہ اس کے کلام کو سن سکتے تھے۔اور ایسا ہی اور پیغمبروں کے پاس فرشتہ آتا تھا اور دوسرے لوگ اس کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔اور کبھی کبھی وحی آپ پر گھنٹی کی آواز کی طرح اترتی تھی اور آپ کے سوا حاضرین میں سے اس آواز کو کوئی بھی نہ سن سکتا تھا۔

(۹) جنّ ہمارے درمیان آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہیں اور بلند آواز میں باتیں کرتے ہیں۔مگر ہم انکی آوازوں کو نہیں سن سکتے۔اور جنگ میں فرشتے کفار کو تازیانوں سے گردنوں اور انکے سرانگشتاں پر ضربیں لگاتے تھے۔چنانچہ خداتعالیٰ اس امر کی خبر قرآن شریف میں یوں دیتا ہے۔ فَاضْرِبُوْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ۔یعنی کفار کی ہر انگلی کے سر پر ضرب لگاؤ۔یہ اسلئے ہوا کہ جب انسان کی انگلیاں ماؤف وکمزور ومجروح ہوجائیں، تو وہ اپنے مقابل سے لڑنے میں دلیری نہیں دیکھا سکتا۔فرشتے جنگ میں کفار کو مارتے اور پکارتے تھے۔اور مسلمان بھی انکے ساتھ ہی کفار سے لڑرہے تھے۔اور وہ سب ایک ہی جنگ میں موجود تھے۔مگر وہ فرشتوں کو نہ تو دیکھ سکتے تھے اور نہ ان کی بات وپکاروں کو سن سکتے تھے۔

(۱۰) خداتعالیٰ نے بنی آدم سے بہت سے امور، جو دنیا میں واقع ہوتے ہیں، پوشیدہ رکھے ہیں۔نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام صحابہ کے درمیان ہی موجود ہوتے تھے، جبکہ حضرت جبرائیلؑ آنحضرتؐ کو قرآن کریم پڑھاتے تھے اور آپ سے مذاکرہ فرماتے تھے، مگر حاضرین حضرت جبرائیلؑ کی آواز کو نہ سن سکتے تھے۔بلاشک اس امر سے وہ شخص کیسے انکار کرسکتا ہے، جو کہ خداتعالیٰ کی ذات کے موجود ہونے کا اقرار کرتا اور اس کی قدرت کاملہ کا قائل ہے، کہ خداتعالیٰ دنیا میں بعض حادثات پیدا کرے اور اپنی مخلوق کی نظروں کو اپنی حکمت بالغہ ورحمت وسیعہ سے ان واقعات وحادثات سے پھیر دے اور وہ ان کو نہ دیکھ سکیں اور نہ سن سکیں۔انسان کی نظر اور شنوائی اس امر میں بہت ہی کمزور ہے کہ وہ عذاب قبر کو دیکھ سکے۔اور بھی بہت سے ایسے امور واقع ہوتے ہیں کہ اگر خداتعالیٰ وہ سب انسان کو دکھادے، تو انسان بیہوش ہوجائے اور زندہ نہ رہ سکے۔اگر اس کے دل سے پردہ اٹھادیا جائے، تو وہ مرجائے۔خداتعالیٰ کی حکمت کاملہ کا کیونکر انکار ہوسکتا ہے۔وہ قادر ہے کہ مکلفین انسانوں اور اس حادثہ کے درمیان کوئی ایسا پردۂ حکمت آویزاں کردے کہ انسان اس کو نہ دیکھ سکیں۔اور اگر وہ پردہ اٹھادیا جائے، تو اس کو اپنے سامنے دیکھ لیں۔

(۱۱) خداتعالیٰ قادر ہے کہ سیماب اور رائی کو میت کی آنکھ اور اس کے سینے سے ہٹادے اور پھر جلدی سے رکھ دے۔خداتعالیٰ کا فرشتہ اس امر سے کس طرح عاجز ہوسکتا ہے اور وہ ذات قادر قدرت

کس طرح قادر نہیں ہوسکتی، جو ہر بات پر قادر ہے۔اور کیونکہ اس کی قدرت سیماب اور رائی کو اس کی آنکھ وسینہ پر باقی رکھنے سے عاجز ہوسکتی ہے۔اور اس امر سے کہ رائی کا دانہ اس سے نہ گرے۔

(۱۲) عالم برزخ کا قیاس دنیا میں دیکھے ہوئے امور و مشاہدات پر کرنا محض جہالت اور گمراہی ہے۔اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جھٹلانا اور خداوند تعالیٰ قادر قدرت کو ایسے امور سے عاجز جاننا و ناطاقت ٹھہرانا پرلے درجے کی جہالت و گمراہی و ظلم ہے۔ جب کہ ہم میں سے کوئی شخص قبر کو دس گز اور سو گز اور اس سے بھی زیادہ لمبائی و چوڑائی و گہرائی میں بنا سکتا ہے اور اس کی کشادگی کو لوگوں سے پوشیدہ رکھ سکتا ہے اور جس کو چاہے اس کو اس پر مطلع کرسکتا ہے، تو پھر رب العالمین کے لئے کس طرح یہ امر ناممکن ہوسکتا ہے۔ وہ تو قادر ہے کہ جس بات کو جس پر چاہے کھولے اور دوسروں کی نظروں سے اس کو پوشیدہ رکھے۔ وہ قادر ہے کہ لوگوں کو ایک چیز تنگ دکھائی دے، حالانکہ وہ بہت کشادہ اور خوشبودار اور بہت بڑی اور نورانی و روشن ہو، مگر لوگ اس کو نہ دیکھ سکیں۔

(۱۳) اس مسئلہ کا یہ بھید ہے کہ قبر کی کشادگی اور اس کی تنگی اور اس کی روشنی اور سبزی اور روئیدگی اور باغات دنیا کی قسم میں سے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو وہی چیزیں دکھائی ہیں، جو اس دنیا میں ہیں۔ جو چیزیں عالم آخرت کی ہیں، وہ ان کی نظروں سے پوشیدہ رکھی ہیں اور درمیان میں ایک پردہ لٹکا دیا ہے، تا کہ ان باتوں پر ایمان بالغیب لانے سے انسان سعادت پائے۔ اگر ان چیزوں پر سے پردہ دور کیا جائے، تو وہ سامنے نظر آئیں۔ اور اگر میت مدفون ہو، تو منع اور محال نہیں ہے کہ اس کے پاس دو فرشتے آکر سوال کریں اور حاضرین ان کی باتوں کو نہ سن سکیں۔ اور جب مردہ فرشتوں کو جواب دے اور لوگ اس کا کلام نہ سن سکیں۔ اور اگر فرشتے اس کو زدوکوب کریں اور ماریں، تو حاضرین اس مارنے کو نہ دیکھ سکیں۔ یہ سب باتیں طلسمات الٰہی میں سے ہیں۔

یہ بڑی جہالت اور پرلے درجے کی گمراہی ہے کہ کوئی گمان کرے کہ فرشتے زمین اور پتھر کے اندر داخل نہیں ہو سکتے، حالانکہ خدا تعالیٰ نے فرشتوں کے لئے زمین اور پتھروں کو مانند ہوا کے کیا ہے۔ جیسا کہ پرندے ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں، ایسے ہی فرشتے زمین و پتھروں میں اڑ کر نفوذ کرتے اور داخل ہو جاتے ہیں۔ اور یہ لازم نہیں ہے کہ زمین و پتھر، جو ٹھوس جسموں کو چھپا سکتے ہیں، ان میں ارواح نفوذ نہ کر سکیں۔ جو شخص یہ گمان کرتا ہے، وہ انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کرتا ہے۔

(۱۵) ناممکن اور منع نہیں ہے کہ مصلوب اور غریق اور سڑے ہوئے کو روح واپس کر دی جائے اور ہم اس امر کو معلوم نہ کر سکیں، کیونکہ وہ روح اور قسم کی ہے۔ بیہوش اور سکتہ زدہ اور مبہوت زندہ ہوتے

ہیں اوران کی روحیں ان کے ساتھ ہوتی ہیں، اگرچہ وہ بظاہر مردہ دکھائی دیتے ہیں۔ان کی زندگی ہم کو معلوم ومحسوس نہیں ہوسکتی۔اور جس کے ٹکڑے اور اجزاء الگ الگ ہوکر پراگندہ ہوجائیں،تو خدائے قادر مطلق پر نہ مشکل ہے اور نہ ممتنع ہے کہ ان ٹکڑوں واجزا میں روح کو پیوست کردے۔اور درداورلذت اور دکھ وسکھ کا شعوران اجزااورٹکڑوں میں پیدا کردے۔خداتعالیٰ نے جمادات میں بھی شعوراورادراک رکھاہے، جووہ اپنے پروردگار کی تسبیح پڑھتی ہیں اوراس کے خوف سے پتھر گر پڑتے ہیں اوراس کی دہشت وبیم سے پہاڑ اور درخت چلتے اور سنگریزے اور پانی اور سبزے اس کی تسبیح وتحمید میں مشغول ہیں۔چنانچہ خداتعالیٰ فرماتا ہے۔**و ان من شئی ال یسبح بحمده و لکن لا تفقهون تسبیحهم** ۔ترجمہ۔ یعنی ہرایک چیز خداتعالیٰ کو یادکرتی اوراس کی تسبیح وتحمید میں مشغول ہے۔لیکن تم اس کی تسبیح وتحمید کونہیں سمجھتے۔اورخداتعالیٰ فرماتا ہے۔**انا سخرنا الجبال معه یسبحن بالعشی و الاشراق** ۔یعنی ہم نے پہاڑوں کو داؤد کے لئے مسخر کردیا ہے اوروہ اس کے ساتھ صبح وشام خداتعالیٰ کی تسبیح وتحمید کررہے ہیں۔ایسا ہی خداتعالیٰ فرماتا ہے۔**یا جبال اوبی معه و الطیر** ۔ترجمہ۔اے پہاڑو اوراے پرندو۔ داؤد کے ساتھ مل کر میری طرف رجوع کرو۔پس جب کہ ان جسموں میں بھی ادراک وشعور ہے،تو وہ اجسام،جن میں روح اورزندگی ہوتی ہے،وہ ادراک وسمجھ کے لئے زیادہ سزاوار ہیں۔

(۱۶)عذاب قبر دنیااور عالم آخرت کے درمیان واقع ہوتا ہے،جیسا کہ خداتعالیٰ فرماتا ہے۔ **و من ورائهم برزخ الی یوم یبعثون** ۔ترجمہ۔ان کے مرنے کے پیچھے قیامت تک ایک آڑ ہے۔اور اس اڑ یعنی عالم برزخ کے لوگوں کو دنیاوآخرت پر مطلع کیا جاتا ہے۔اوران کے واردات وحالات وارادہ کا نام دکھ وسکھ رکھا۔یا یہ کہ وہاں باغ ہے یا آگ کا گڑھا ہے۔یہ نام اس لئے رکھے گئے کہ لوگ ان امور سے واقف ہوتے ہیں۔پس جو صلیب یعنی پھانسی پر باندھا ہوا ہو،اور جو جل گیا ہو،اور جو ڈوب مرا ہو،اور جس کو درندوں اور پرندوں نے کھالیا ہو۔ان سب کے لئے عالم برزخ کا عذاب ان کے عملوں کے حساب پر ہوتا ہے،اگرچہ ان کے دکھ سکھ اوران کی کیفیت کچھ اور ہی ہو۔کسی شخص نے گمان کرلیا کہ جب میرا جسم آگ سے جلایا جائے اور خاکستر ہوجائے،تو کچھ ذرات دریا میں بکھیر دیئے جائیں اور کچھ ذرات آندھی اور تیز ہوا کے دن جنگل میں اُڑا دیئے جائیں،تو اس طرح سے میں عذاب قبر سے بچ جاؤں گا۔اس نے اپنے وارثوں کو یہی وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد یہی عمل کرو۔اس کے وارثوں نے ایسا ہی کیا،تو خداتعالیٰ نے جنگل اور دریا کے ملائکہ کو حکم فرما کر اس کے ذرات کو جمع کیا اوراس کو فرمایا کہ کھڑا ہو۔پس وہ خداتعالیٰ کے حضور میں حاضر ہوا،تو خدتعالیٰ نے اس کو فرمایا کہ تجھے اس امر پر کس

نے ترغیب دی تھی، جوتو نے کیا۔اس نے عرض کیا۔ یا اللہ تیرے خوف نے مجھے اس بات پر برانگیختہ کیا تھا۔پس خدا تعالیٰ نے اس پر رحم فرمایا اور عذاب دینے سے درگزر کیا۔

(۱۷) اگر مردہ کو درختوں کے سروں پر اور ہواؤں کے جھونکوں میں لٹکا دیا جائے، تو اس کا لٹکا ہوا جسم عالم برزخ کے حصہ عذاب کو ضرور پائے گا۔ اور اگر کوئی نیک شخص کسی سخت گرم حمام میں دفن کیا جائے اور آگ اس کے اوپر اور نیچے رکھی جائے، تو اس کے جسم کو عالم برزخ کے ثواب کا حصہ ضرور ملے گا۔اور خدا تعالیٰ اس آگ کو اس شخص پر ٹھنڈک وسلامت کر دے گا۔اور پہلے پر ہوا کو آگ اور سموم کر دے گا۔ سارے جہاں کے عناصر اور اسباب اور مادے و ذرات سب کے سب اپنے پروردگار کے فرمانبردار اور اس کے حضور میں دست بستہ کھڑے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہی ان کا خالق ہے۔ وہ جس طرح چاہے، اسی کیفیت پر ان کو کر دیتا ہے۔اور کوئی چیز اس کے ارادہ کی نافرمانی نہیں کرتی۔ بلکہ ہر چیز اس کے ارادے پر چلتی ہے۔ جو شخص اس امر کا انکار کرے۔ وہ خدا تعالیٰ اور اس کی ربوبیت کا منکر ہے۔

تودۂ خاک ترا چوں زندہ ساخت   خاکہا را جملگی باید شناخت
مردہ زمیسنو یند ز آنسو زندہ اند   خامش ایں جا و آں طرف گویندہ اند

عالم برزخ کے بعد ایک دوسرا عالم حشر برپا ہونے کی وجہ

جب کہ انسان کے مرنے کے وقت عالم برزخ میں جزا وسزا شروع ہو جاتی ہے اور دوزخی دوزخ میں اور بہشتی بہشت میں جاتے ہیں، مگر اسکے بعد ایک اور تجلی اعلیٰ کا دن ہے، جو خدا تعالیٰ کی بڑی حکمت نے اس دن کے ظاہر کرنیکا تقاضا کیا، کیونکہ اس نے انسان کو پیدا کیا، تا وہ اپنی خالقیت کے ساتھ شناخت کیا جائے اور پھر وہ سب کو ہلاک کریگا، تا کہ وہ اپنی قہاریت کے ساتھ شناخت کیا جائے۔اور پھر ایک دن سب کو کامل زندگی بخش کر ایک میدان میں جمع کریگا، تا کہ اپنی قادریت کے ساتھ پہچانا جائے۔

موت جائے بازگشت اور جائے بعثت اوّل ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ نے بنی آدم کیلئے دو معاد اور دو بعثتیں ٹھہرائی ہیں۔اور ان دونوں میں بنی آدم کو نیکی و بدی کا بدلہ دیا جائیگا۔ پہلی بعثت میں تو روح اور جسم کی جدائی ہے اور اسکو پہلے دار الجزا کی طرف چلایا جاتا ہے۔اور دوسری بعثت وہ ہے، جس میں خدا تعالیٰ روح کو جسم سے ملائیگا اور اسکو قبروں سے اٹھا کر بہشت یا دوزخ کی طرف چلائیگا۔ وہ دوسرا حشر ہے۔ اسی لئے حدیث نبوی میں آیا ہے۔ **و تؤمن بالبعث الآخر** ۔یعنی دوسری بعثت پر ایمان لاؤ۔ کیونکہ پہلی بعثت سے کم ہی لوگ منکر ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ان دونوں قیامتوں کا ذکر قرآن کریم میں تشریح کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ایک بڑی قیامت ہے اور دوسری چھوٹی۔اس امر کا ذکر سورہ مؤمن، مطففین، فجر

وغیرہ سورتوں میں آیا ہے۔ہم قبل ازیں اس مضمون کے ابتداء میں بیان کر آئے ہیں کہ لفظ برزخ خود اس امر پر کافی شہادت ہے کہ عالم برزخ کے بعد ایک اور عالم آنیوالا ہے اور وہ عالم حشر اجساد ہے۔

مرنے کے بعد ہر ایک مؤمن طیب اور طاہر، جنکی گردن پر کوئی بوجھ گناہ اور معاصی کا نہیں ہوتا، بلاتوقف بہشت میں داخل ہو جاتے ہیں۔لیکن قبر میں مردہ کا بہشت میں داخل ہونا اجمالی طور پر ہوتا ہے۔اور مرنے کے بعد جومؤمنوں کو بلاتوقف اجسام دیئے جاتے ہیں، وہ بھی ناقص ہوتے ہیں۔مگر حشر اجساد کا دن تجلی اعظم کا دن ہے۔اس دن کامل اجسام ملیں گے۔اور بہشتیوں کا تعلق کسی حالت میں بہشت سے الگ نہیں ہوگا۔ایک پہلو سے وہ بہشت میں ہوں گے اور دوسرے پہلو سے خدا تعالیٰ کے سامنے آئیں گے۔کامل درجہ دخول بہشت کا، جو جسمانی اور روحانی دونوں طور پر ہوگا، وہ حشر اجساد کے بعد ہر ایک مستحق کو عطا کیا جائیگا۔مگر اب بھی جس قدر بہشت کی لذات عطا ہو چکی ہیں، اس سے مقرب لوگ باہر نہیں جائیں گے۔

قیامت میں خدا تعالیٰ کا تخت عدالت پر بیٹھنے کی حقیقت

قیامت کے دن مومنوں کا بحضور رب العالمین حاضر ہونا ان کو بہشت سے نہیں نکالے گا۔کیونکہ یہ تو نہیں ہوگا کہ بہشت سے باہر کوئی لکڑی یا لوہے یا چاندی کا تخت بچھایا جائیگا اور خدا تعالیٰ مجازی حکام اور سلاطین کی طرح اس پر بیٹھے گا، اور سب کو کسی قدر مسافت طے کر کے اس کے حضور میں حاضر ہونا ہو گا، تا یہ اعتراض کیا جا سکے کہ اگر بہشتی لوگ بہشت میں داخل شدہ ہیں، تو طلبی کے وقت ان کو بہشت سے نکلنا پڑیگا۔اور اس لق ودق جنگل میں، جہاں تخت رب العالمین بچھایا جائیگا، حاضر ہونا پڑیگا۔ایسا خیال تو سراسر جسمانی اور یہودیت کی سرشت سے نکلا ہوا ہے۔اور حق یہی ہے کہ ہم عدالت کے دن پر ایمان تو لاتے ہیں اور تخت رب العالمین کے قائل ہیں۔لیکن جسمانی طور پر اس کا خاکہ نہیں کھینچتے اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے فرمایا ہے، وہ سب کچھ ہوگا۔لیکن ایسے پاک طور پر کہ جو خدا تعالیٰ کے تقدس اور تنزہ اور اس کی صفات کاملہ کے منافی ومغائر نہ ہو۔بہشت تجلی گاہ حق ہے۔اس لئے یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ اس دن خدا تعالیٰ ایک مجسم شخص کی طرح بہشت سے باہر اپنا خیمہ یا یوں کہو کہ اپنا تخت بچھوائے گا۔ بلکہ حق یہ ہے کہ اس دن بھی بہشتی بہشت میں ہوں گے اور دوزخی دوزخ میں۔لیکن رحم الٰہی کی تجلی عظمیٰ راستبازوں اور ایمانداروں پر ایک جدید طور سے لذات کاملہ کی بارش کر کے اور تمام سامان بہشتی زندگی کا حسی اور جسمانی رنگ میں بہشتیوں کو بہشت میں دکھلا کر اس نئے طور پر دارالسلام میں اور دوزخیوں کو دوزخ میں کامل طور پر داخل کرے گی، یعنی خدا تعالیٰ کی قہری تجلی جہنمی لوگوں

کو بھی بعد از حساب ومناقشہ سخت اورالزام صریح کے نئے رنگ میں دکھلا کر گویا نئے سرے سے جہنم میں داخل کرے گی۔

واضح رہے کہ جنت اور جہنم تین درجوں پر منقسم ہیں۔ پہلا درجہ، جو ایک ادنیٰ درجہ ہے، اس وقت شروع ہوتا ہے کہ جب انسان اس عالم سے رخصت ہو کر اپنی خوابگاہ قبر میں جا لیٹتا ہے۔اس درجہ ضعیفہ کو استعارہ کے طور پر احادیث نبویہ میں کئی پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ میت عبد صالح کے لئے قبر میں جنت کی طرف ایک کھڑکی کھولی جاتی ہے،جس راہ سے وہ جنت کی باغ و بہار دیکھتا ہے اور اس کی دلربا ہوا سے متمتع ہوتا ہے۔اس کھڑکی کی کشادگی بحسب مرتبہ ایمان وعمل اس میت کے ہوتی ہے۔لیکن اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ جو لوگ ایسے فنا فی اللہ ہونے کی حالت میں دنیا سے جدا ہوتے ہیں کہ اپنی جان عزیز کو محبوب حقیقی کی راہ میں فدا کر دیتے ہیں، جیسے شہداء یا وہ صدیق لوگ، جو شہداء سے بھی بڑھ کر آگے قدم رکھتے ہیں، ان کے لئے ان کی موت کے بعد صرف بہشت کی طرف کھڑکی ہی نہیں کھولی جاتی، بلکہ وہ اپنے سارے وجود اور تمام قویٰ کے ساتھ بہشت میں داخل ہو جاتے ہیں۔مگر پھر بھی قیامت کے دن سے پہلے اکمل اور اتم طور پر لذات جنت حاصل نہیں کر سکتے۔

ایسا ہی اس درجہ میں میت خبیث کے لئے دوزخ کی طرف قبر میں ایک کھڑکی کھولی جاتی ہے، جس راہ سے دوزخ کی ایک جلانے والی بھاپ آتی رہتی ہے اور اس کے شعلوں سے ہر وقت وہ خبیث روح جلتی رہتی ہے۔لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جو لوگ اپنی کثرت نافرمانی کی وجہ سے فنا فی الشیطان ہونے کی حالت میں دنیا سے جدا ہوتے ہیں کہ شیطان کی نافرمانی کی وجہ سے بکلی تعلقات اپنے مولا حقیقی سے توڑ دیتے ہیں، ان کے لئے ان کی موت کے بعد صرف دوزخ کی طرف کھڑکی ہی نہیں کھولی جاتی۔ بلکہ وہ اپنے سارے وجود اور تمام قویٰ کے ساتھ خاص دوزخ میں ڈال دیئے جاتے ہیں، جیسا کہ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے۔ مِمَّا خَطِيَّاتِهِمْ أُغْرِقُوْا فَادْخُلُوْا نَاراً ۔(سورہ نوح) چونکہ وہ اپنی نافرمانی میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے آگ میں ڈالے جاتے ہیں۔مگر پھر بھی وہ لوگ قیامت کے دن سے پہلے مکمل اور اتم طور پر عقوبات جہنم کا مزا نہیں چکھتے۔

دوسرا درجہ پھر اس درجہ سے اوپر، جو ابھی ہم نے بہشتیوں اور دوزخیوں کے لئے بیان کیا ہے، دخول جنت و دخول جہنم کا ہے، جس کو درمیانی درجہ کہنا چاہیئے۔اور وہ حشر اجساد کے بعد اور جنت عظمیٰ یا جہنم کبریٰ میں داخل ہونے سے پہلے حاصل ہوتا ہے۔اور بوجہ تعلق جسد کامل قویٰ میں ایک اعلیٰ درجہ کی تیزی پیدا ہو کر خدا کی تجلی رحم یا تجلی قہر کا حسب حالت اپنے کامل طور پر مشاہدہ ہو کر اور جنت عظمیٰ کو بہت

قریب پاکر یا جہنم کبریٰ کو بہت ہی قریب دیکھ کراور لذات یا عقوبات ترقی پذیر ہو جاتے ہیں، جیسا کہ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے۔ وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغَاوِيْنَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ۔ ترجمہ۔ بہشت قریب کی جادیگی پرہیزگاروں کے لئے اور دوزخ ظاہر کی جادیگی گمراہوں کے لئے۔ اس دن بہت سے منہ روشن اور ہنستے ہوئے خوشیاں کرتے ہوں گے۔ اور بہت سے منہ اس دن گرد آلودہ اور سیاہی زدہ ہوں گے۔ یہی لوگ منکر اور ڈھیٹھ ہیں۔

اس درجہ میں بھی لوگ مساوی نہیں ہوتے، بلکہ اعلیٰ درجہ کے بھی ہوتے ہیں، جو بہشتی ہونیکی حالت میں بہشتہ انوار اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ انہیں کی طرف اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے۔ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ ۔یعنی ان کا نور ان کے آگے اور دائیں طرف روشنی دیگا۔ ایسا ہی دوزخی ہونے کی حالت میں اعلیٰ درجہ کے کفار ہوتے ہیں کہ قبل اس کے جو کامل طور پر دوزخ میں پڑیں، ان کے دلوں پر دوزخ کی آگ بھڑکائی جاتی ہے، جیسا کہ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے۔ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ۔ یعنی خدا تعالیٰ کی بھڑکائی ہوئی آگ دلوں کو جھلستی ہے۔

پھر اس درجہ کے اوپر جو آخری درجہ ہے، وہ تیسرا ہے، جو منتہائے مدارج ہے، جس میں یوم الحساب کے بعد لوگ داخل ہوں گے۔ اور اکمل اور اتم طور پر سعادت یا شقاوت کا مزہ چکھ لیں گے۔ اب حاصل کلام یہ ہے کہ تینوں مدارج میں انسان ایک قسم کی بہشت یا ایک قسم کے دوزخ میں ہوتا ہے۔ اور جبکہ یہ حال ہے، تو اس صورت میں صاف ظاہر ہے کہ ان مدارج سے کسی درجہ پر ہونیکی حالت میں انسان بہشت یا دوزخ میں سے نکالا نہیں جاتا۔ ہاں جب اس درجہ سے ترقی کرتا ہے، تو ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ میں آجاتا ہے۔

مردہ کو صدقات و خیرات و دعا سے فائدہ پہنچنے کی حقیقت۔ اس ترقی کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً ایک شخص ایمان اور عمل کی ادنیٰ حالت میں فوت ہو جاتا ہے، تو ایک چھوٹا سا سوراخ بہشت کی طرف اس کے لئے نکالا جاتا ہے۔ کیونکہ بہشتی تجلی کی اس میں اسی قدر استعداد موجود ہوتی ہے۔ پھر اس کے بعد اگر وہ اولاد صالح چھوڑ کر مرا ہے، جو جدوجہد سے اس کے لئے دعائے مغفرت کرتی ہے اور صدقات و خیرات اس کی مغفرت کی نیت سے مساکین کو دیتی ہے۔ یا کسی ایسے اہل اللہ سے اس کا محبت کا تعلق تھا، جو تضرعات سے جناب الٰہی سے اس کی بخشش چاہتا ہے یا کوئی ایسا خلق اللہ کے فائدے کا کام وہ دنیا میں کر گیا ہے، جس سے بندگان خدا کو کسی قسم کی مدد یا آرام پہنچتا ہے، تو اس خیر جاری کی برکت سے وہ

کھڑکی اس کے لئے بہشت کی طرف کھولی جاتی ہے اور دن بدن اپنی کشادگی میں زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اور سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ۔ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے جاتی ہے، کا منشا اس کو اور بھی زیادہ کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ کھڑکی ایک بڑا وسیع دروازہ بنتا جاتا ہے اور آخر نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ شہیدوں اور صدیقوں کی طرح وہ بہشت میں ہی داخل ہو جاتا ہے۔ اس بات کو سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بات شرعاً و انصافاً اور عقلاً بیہودہ ہے کہ ایسا خیال کیا جائے کہ باوجود اس کے کہ ایک مسلم فوت شدہ کے بعد اس کے لئے ایک قسم کی خیر جاری رہے اور ثواب اور اعمال صالحہ کی بعض وجوہ اس کے لئے کھلی رہیں، مگر پھر بھی وہ کھڑکی، جو بہشت کی طرف اس کے لئے کھولی گئی ہے، ہمیشہ اتنی کی اتنی ہی رہے، جو پہلے دن کھولی گئی تھی۔

یاد رکھنا چاہئے کہ خدا تعالیٰ نے اس کھڑکی کے کھولنے کے لئے پہلے سے اس قدر سامان کر رکھے ہیں، جن سے بتصریح معلوم ہوتا ہے کہ اس کریم کا دراصل منشاء ہی یہی ہے کہ اگر ایک ذرہ ایمان و عمل لے کر بھی اس کی طرف کوئی سفر کرے، تو وہ ذرہ بھی نشو نما کرتا رہیگا۔ اور اگر کسی اتفاق سے تمام سامان اس خیر کے، جو میت کو اس عالم کی طرف سے پہنچتی ہے، ناپید رہیں، تاہم یہ سامان کسی طرح ناپیدا اور گم نہیں ہوسکتا کہ جو تمام مومنوں اور نیک بختوں اور شہیدوں اور صدیقوں کے لئے تاکیدی طور پر یہ حکم فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے ان بھائیوں کے لئے بدل و جان دعائے مغفرت کرتے رہیں، جو ان سے پہلے اس عالم میں سے گزر چکے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے لئے ایک لشکر مومنوں کا دعا کر رہا ہے، وہ دعا ہرگز ہرگز خالی نہیں جائیگی۔ بلکہ وہ ہر روز کام کر رہی ہے۔ اور گنہگار ایماندار جو فوت ہو چکے ہیں، ان کی اس کھڑکی کو، جو بہشت کی طرف تھی، بڑے زور سے کھول رہی ہے۔ ان دعاؤں نے اب تک بیشمار کھڑکیوں کو اس حد تک کشادہ کر دیا ہے کہ بے انتہا ایسے لوگ بہشت میں پہنچ چکے ہیں، جن کو اول دنوں میں صرف ایک چھوٹی سی کھڑکی بہشت کے دیکھنے کے لئے عطا کی گئی تھی۔

اب ہماری اس تقریر سے بخوبی ثابت ہو گیا ہے کہ بہشت میں داخل ہونے کے لئے ایسے زبردست اسباب موجود ہیں کہ قریباً تمام مومنین یوم الحساب سے پہلے اس میں پورے طور پر داخل ہو جائیں گے۔ اور یوں الحساب ان کو بہشت سے خارج نہیں کیا جائیگا۔ بلکہ اس وقت بہشت اور بھی نزدیک ہو جائیگا۔ کھڑکی کی مثال سے سمجھ لینا چاہئے کہ کیونکر بہشت قبر سے نزدیک کیا جاتا ہے، یعنی روحانی طور پر نزدیک کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بہشتی لوگ روحانی طور پر میدان حساب میں بھی ہوں گے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری قبر کے نیچے روضہء جنت ہے۔ اس پر خوب غور کرو کہ یہ

کس بات کی طرف اشارہ ہے۔

قبر کے سوال و جواب محدود ہیں یا غیر محدود

سوال ۔اگر قبر کے سوالات من ربّک وغیرہ محدود ہیں،تو وہ خوب یاد کر لئے جائیں اور وہاں پاس جائیں یا کہ وہ غیر محدود ہیں؟

جواب ۔ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک ایمانی کیفیت ہے،جو دنیاوی امتحانوں کی طرح نہیں کہ آدمی حیلوں اور بہانوں سے پاس ہو جائے۔ بلکہ وہاں جس رنگ میں دل رنگین ہوگا،اسی کا اظہار ہوگا اور اسی کے موافق بوجہٖ من وجوہ قبر میں رنج یا راحت کا سامان مہیا ہوگا۔

فرشتگان قبر کے سوالات کس زبان میں ہوں گے؟

ہمیں عربی، فارسی، اردو، انگریزی، سنسکرت وغیرہ سب زبانیں خدا تعالیٰ نے سکھائی ہیں۔ پھر کیا خدا کو بھیجا ہوا فرشتہ کسی زبان سے قاصر رہ سکتا ہے۔وہ ہر زبان بول سکتا ہے۔

قبر میں منکر ونکیر کے آنے کا راز اور ان کے ناموں کی وجہ تسمیہ

عالم قبر اسی دنیا کے متمم امور سے ہوا کرتا ہے۔ایک پردے کی آڑ میں برزخ کے سب علوم انسان پر یکے بعد دیگرے نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔جو انسان دنیا میں منہمک وشاغل رہا اور علوم آسمانی و عرفان الٰہی سے غافل اور لا پرواہ رہا، یا ان علوم کو پڑھ کر بدعمل ہو جائے اور ان کے آثار حقہ کو اپنے اندر سے زائل کر دے،تو عالم برزخ میں علوم آسمانی کا زوال اکثر دو دہشت ناک ومہیب فرشتوں کی صورت میں اس کو نظر آتا ہے۔اور اگر انسان صالح ہو،تو فرشتے خوش شکل میں آتے ہیں، جو اس سے دریافت کرتے ہیں۔مَنْ رَبُّکَ وَ مَا دِیْنُکَ وَ مَا قَوْلُکَ فِی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ۔یعنی تیرا پروردگار کون ہے۔تیرا دین کیا ہے۔اور حضرت محمد رسول اللہ علیہ وسلم کے متعلق تیری کیا رائے واعتقاد ہے۔ہم پہلے بھی عذاب وثواب قبر کے بیان میں لکھ چکے ہیں کہ انسان کے دُکھ وسُکھ پہنچانے کے اسباب وموجبات اس کے اپنے ہی اعمال ہوتے ہیں، جو وہ اس دنیا سے لے کر جاتا ہے۔اگر انسان کے اعمال ناشائستہ ومکروہ ہوں،تو اس کے پاس منکر ونکیر کا آنا خطرناک اور ڈراونی شکلوں میں ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے نام برائے تنبیہ وعبرت منکر اور نکیر ٹھہرے ہیں۔ورنہ صالح انسان پر خوش شکل فرشتوں کا نزول ہوتا ہے، جو کئی حدیثوں سے ثابت ہے۔

عالم برزخ میں بعض نفوس ملکی ایسے ہی ماموراالٰہی ہوتے ہیں کہ انسان پر اس کے اعمال کے

موافق شکلوں میں ظاہر ہوں۔ اور وہ ایسے موقعوں پر ظاہر ہو کر انسان کو آرام یا تکلیف پہنچائیں۔ اس وقت وہ انسان، جو گرفتار حالت میں ہوتا ہے، ان فرشتوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے، گو دنیا کے لوگ ان کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں۔ ترمذی شریف میں لکھا ہے۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمْ اِذَا اُقْبِرَ الْمَیِّتُ اَوْ قَالَ اَحَدُکُمْ اَتَاهُ مَلَکَانِ اَسْوَدَانِ اَزْرَقَانِ یُقَالُ لِاَحَدِهُمَا اَلْمُنْکَر وَ لِلآخِرِ اَلْنَکِیْرِ فَیَقُوْلَانِ مَا کُنْتَ تَقُوْلُ فِیْ هٰذِ الرَّجُلِ فَیَقُوْلُ مَا کَانَ یَقُوْلُ هُوَ عَبْدُ اللّٰهِ وَ رَسُوْلَه' اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُه' وَ رَسُوْلَه' فَیَقُوْلَانِ قَدْ کُنَّا نَعْلَمُ اِنَّکَ تَقُوْلُ هٰذَا ثُمَّ یُفْسَحُ لَه' فِیْ قَبْرِهٖ سَبْعُوْنَ ذِرَاعاً فِیْ سَبْعِیْنَ ثُمَّ یُنَوَّرُ لَه' فِیْهِ ثُمَّ یُقَال نَمْ فَیَقُوْلَ اَرْجِعُ اِلٰی اَهْلِیْ فَاَخْبِرُهُمْ فَیَقُوْلَانِ نَمْ کَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ اَلَّذِیْ لَا یُوْقِظُه' اِلَّا اَحَبَّ اَهْلَه' اِلَیْهِ حَتّٰی یَبْعَثَهُ اللّٰهُ مِنْ مَضْجِعِهٖ ذَالِکَ وَ اِنْ کَانَ مُنَافِقاً قَالَ سَمِعْتُ النَّاسَ یَقُوْلُوْنَ فَقُلْتُ مِثْلَه' لَا اَدْرِیْ فَیَقُوْلَانِ قَدْ کُنَّا نَعْلَمُ اِنَّکَ تَقُولُ ذَالِکَ لَا دَرَایْتَ وَ لَا تَلَیْتَ فَیُقَالُ لِلْاَرْضِ اِلْتَامِیْ عَلَیْهِ فَتَلْتَام عَلَیْهِ فَتَنْحَتْلِفُ اَضْلَاعُهُ فَلَا یَزَالُ فِیْهَا مُعَذَّبًا حَتّٰی یَبْعَثُهُ اللّٰهُ مِنْ مَضْجِعِهٖ ذَالِکَ۔ ترجمہ۔ حضرت ابی ہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا، جب دفن کی جاتی ہے میت، یا فرمایا کوئی تم میں سے، تو اسکے پاس دو فرشتے سیاہ رنگ کیری آنکھوں والے آتے ہیں۔ ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہتے ہیں۔ پھر وہ دونوں اس کو کہتے ہیں کہ تو اس مرد کے حق میں کیا کہتا تھا۔ پس اگر وہ شخص صالح بندہ ہو تو وہی کہتا ہے، جو کچھ دنیا میں وہ کہتا تھا کہ وہ بندہ ہے اللہ تعالیٰ کا اور اس کا رسول ہے۔ گواہی دیتا ہوں میں اس امر کی کہ نہیں ہے کوئی معبود برحق سوائے ایک خدائے برحق کے اور حضرت محمد اس کا بندہ ہے اور اس کا رسول ہے۔ پس وہ فرشتے کہتے ہیں کہ ہم جانتے تھے کہ تو یہ بات کہے گا۔ پھر فراخی کی جاتی ہے اس کی قبر میں ستر در ستر گز۔ پھر روشنی کی جاتی ہے اس کے لئے قبر میں۔ پھر کہا جاتا ہے اس کو کہ سورہ۔ مگر وہ کہتا ہے کہ میں پھر اپنے گھر والوں کے پاس جاؤں گا اور ان کو خبر دوں گا۔ وہ دونوں اس کو کہتے ہیں کہ سورہ مانند سونے دلہن کے کہ نہیں جگا تا اس کو مگر جو زیادہ پیارا ہو اس کے اہل میں سے۔ یہاں تک کہ اٹھائے اس کو خدا تعالیٰ اس کے لیٹنے کی جگہ سے۔ اور اگر منافق ہو، تو کہتا ہے کہ میں نے سنا تھا لوگوں سے کہ اس طرح کہتے تھے۔ پس میں بھی اسی طرح کہتا تھا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ پس وہ دونوں فرشتے کہتے ہیں کہ ہم جانتے تھے کہ تو یہی کہے گا۔ پھر زمین کو کہا جاتا ہے کہ مل جا اس پر۔ پس وہ مل جاتی ہے۔ اس پر اس کی پسلیاں ادھر کی ادھر ہو جاتی ہیں۔ اور اسکو قیامت تک اس میں عذاب دیا جاتا ہے۔

اس حدیث میں الفاظ ذیل۔ لَا دَرَیْتَ وَ لَا تَلَیْتَ ۔ ایک دوسری حدیث سے نقل کئے گئے ہیں۔ جن کے معنے ہیں کہ تو نے حق کو نہ جانا اور نہ تو نے قرآن کی تلاوت کی۔ قرآن سے دل تمام سفلی کدورتوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ہر چیز کے لئے ایک خاص صیقل ہوتی ہے اور دل کی صیقل قرآن کریم کی تلاوت ہے۔

قبور سے تعلق ارواح کی حقیقت

ارواح کا تعلق قبور سے بھی ہوتا ہے۔ اور اس میں کوئی محال عقلی لازم نہیں آتا۔ اس کیلئے ہم خدا تعالیٰ کے قانون قدرت میں ایک نظیر پاتے ہیں۔ یہ امر اس قسم کا ہوتا ہے، جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ بعض امور کی سچائی اور حقیقت صرف زبان ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ اس کو ذرا وسیع کر کے یوں کہہ سکتے ہیں کہ حقایق الاشیاء معلوم کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے مختلف طریق رکھے ہیں۔ بعض خواص آنکھ کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں اور بعض صداقتوں کا پتہ صرف کان لگاتے ہیں اور بعض ایسی ہیں کہ حسِ مشترک کے ذریعہ سے ان کا سراغ چلتا ہے۔ اور کتنی ہی سچائیاں ہیں کہ وہ مرکز قویٰ یعنی دل سے معلوم ہوتی ہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے صداقت معلوم کرنے کے لئے مختلف طریق اور ذریعے رکھے ہیں۔ مثلاً مصری کی ایک ڈلی کو اگر کان پر رکھیں، تو اس کا مزہ معلوم نہ کر سکیں گے اور نہ اس کے رنگ کو بتلا سکیں گے۔ ایسا ہی اگر آنکھوں کے سامنے کریں گے، تو اس کے ذائقہ کے متعلق کچھ نہ کہہ سکیں گے۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حقائق الاشیاء کے معلوم کرنے کے لئے مختلف قویٰ اور طاقتیں ہیں۔ اب آنکھ کے ذریعہ اگر کسی چیز کا ذائقہ معلوم کرنا ہو اور وہ آنکھ کے سامنے پیش ہو، تو کیا ہم یہ کہیں گے کہ اس چیز میں کوئی ذائقہ نہیں ہے، یا آواز نکلتی ہو، تو کان بند کر کے زبان سے وہ کام لینا چاہیں، تو کب ممکن ہے۔ آج کل کے فلسفی مزاج لوگوں کو یہ بڑا دھوکا لگا ہوا ہے کہ وہ اپنے علم کی وجہ سے کسی صداقت کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔ روزمرہ کے کاموں میں دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ سب کام ایک شخص نہیں کرتا، بلکہ جداگانہ خدمتیں مقرر ہیں۔ سقہ پانی لاتا ہے۔ دھوبی کپڑے دھوتا ہے۔ غرضیکہ تقسیم محنت کا سلسلہ ہم انسانوں کے خود ساختہ نظام میں بھی پاتے ہیں۔ پس اس اصل کو یاد رکھو کہ مختلف قوتوں کے مختلف نام ہیں۔ انسان بڑے قویٰ لے کر آیا ہے۔ اور طرح طرح کی خدمتیں اس کی تکمیل کیلئے ہر ایک قوت کے سپرد ہیں۔ نادان فلسفی ہر ایک بات کا فیصلہ اپنی عقل خاص سے چاہتا ہے، حالانکہ یہ بات محض غلط ہے۔ تاریخی امور تو تاریخ ہی سے ثابت ہونگے اور خواص الاشیاء کا تجربہ بدون تجربہ صحیحہ کے کیونکر لگ سکتا ہے۔ امور قیاسیہ کا پتہ عقل دے گی۔ اس طرح پر متفرق طور پر الگ الگ ذرائع ہیں۔ انسان دھوکہ میں مبتلا ہو کر حقائق الاشیاء کے معلوم کرنے سے تب

ہی محروم ہو جاتا ہے، جبکہ وہ ایک ہی چیز کو مختلف امور کی تفتیش کا ذریعہ قرار دے لیتا ہے۔ ذرا سے فکر سے یہ بات خوب سمجھ میں آ جاتی ہے اور روزمرہ ہم ان باتوں کی سچائی کو دیکھتے ہیں۔ پس جب روح جسم سے مفارقت کرتا ہے یا تعلق پکڑتا ہے، تو ان باتوں کا فیصلہ عقل سے نہیں ہوسکتا۔ اگر ایسا ہو، تو فلسفی اور حکماء ضلالت میں مبتلا نہ ہوتے۔ اسی طرح پر قبور کے ساتھ جو تعلق ارواح کا ہوتا ہے، یہ ایک صداقت تو ہے، مگر اسکا پتہ دینا اس آنکھ کا کام نہیں۔ یہ کشفی آنکھ کا کام ہے۔ اگر عقلِ محض سے اسکا پتہ لگانا چاہو، تو کوئی عقل کا پتلا اتنا ہی بتلاوے کہ روح کا وجود بھی ہے یا نہیں۔ ہزار ہا اختلاف اس مسئلہ پر موجود ہیں۔ اور ہزار ہا فلاسفر دہریہ مزاج موجود ہیں، جو منکر ہیں۔ اگر نری عقل کا یہ کام تھا، تو اختلاف کا کیا کام۔ کیونکہ جب آنکھ کا کام دیکھنا ہے، تو میں نہیں کہہ سکتا کہ زید کی آنکھ تو ایک چیز کو دیکھتی ہے اور بکر کی ویسی ہی آنکھ اس چیز کا ذریعہ بتلائے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ نری عقل روح کا وجود بھی یقینی طور پر نہیں بتلاسکتی، چہ جائیکہ اسکی کیفیت اور تعلقات کا علم پیدا کر سکے۔ فلاسفر تو روح کو ایک سبز لکڑی کی طرح مانتے ہیں۔ اور روح فی الخارج انکے نزدیک کوئی چیز نہیں۔ یہ تفاسیر روح کے وجود اور اسکے تعلق وغیرہ کی چشمہءنبوت سے ملی ہیں۔ اور نرے عقل والے تو دعویٰ ہی نہیں کر سکتے۔ اگر کہو کہ بعض فلاسفروں نے کچھ لکھا ہے، تو یاد رکھو کہ انہوں نے منقولی طور پر چشمہءنبوت سے لے کر کچھ لکھا ہے۔ اور یہ امر کہ ارواح کا قبور کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، اس چشم سے دیکھنا چاہئے۔ اور کشفی آنکھ نے بتلایا ہے کہ اس تودہٗ خاک سے ارواح کا ایک تعلق ہوتا ہے۔ اور **السلام علیکم یا اھل القبور** کہنے سے جواب ملتا ہے۔ پس جو آدمی ان قویٰ سے کام لے، جن سے کشف قبور ہوتا ہے، تو وہ ان تعلقات کو دیکھ سکتا ہے۔

ہم ایک اور بات کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ ایک نمک کی ڈلی اور ایک مصری کی ڈلی رکھی ہو۔ اب عقل محض ان پر کیا فتویٰ دے سکے گی۔ ہاں اگر ان کو چکھیں، تو دو جداگانہ مزوں سے معلوم ہو جائیگا کہ یہ نمک ہے اور وہ مصری ہے۔ پس اگر حسِ لسان ہی نہیں، تو نمکین اور شیرین کا فیصلہ کوئی کیا کریگا۔ پس ہمارا کام دلائل سے سمجھا دینا ہے۔ آفتاب کے چڑھنے میں ایک اندھے کے انکار سے فرق نہیں آ سکتا۔ اور ایک مصلوب القوت کے طریق استدلال سے فائدہ نہ اٹھانے سے اس کا ابطال نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح پر اگر کوئی شخص کشفی آنکھ نہیں رکھتا، تو وہ اس تعلق ارواح کو کیونکر دیکھ سکتا ہے۔ پس اس کے انکار سے محض اس لئے کہ وہ دیکھ نہیں سکتا، اس کا انکار جائز نہیں ہے۔ اسی باتوں کا پتہ نری عقل اور قیاس سے کچھ نہیں لگتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس لئے انسان کو قویٰ دیئے ہیں۔ اگر ایک ہی سب کام دیتا، تو پھر اس قدر قویٰ کے عطا کرنیکی کیا ضرورت تھی۔ بعض کا تعلق آنکھ سے ہے اور بعض کا تعلق کان سے، بعض

زبان سے متعلق ہیں۔اور بعض ناک سے۔مختلف قسم کی حسیں انسان رکھتا ہے۔قبور کے ساتھ تعلق ارواح کے دیکھنے کے لئے کشفی حس کی ضرورت ہے۔اگر کوئی کہے کہ یہ ٹھیک نہیں ہے،تو وہ غلط کہتا ہے۔انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ایک کثیر تعداد اور کروڑہا اولیاء صلحاء کا سلسلہ دنیا میں گزرا ہے۔اور مجاہدات کرنے والے بیشمار لوگ ہوگزرے ہیں۔وہ سب اس امر کی زندہ شہادت ہیں۔گو اس کے تعلقات کی وجہ مخفی طور پر ہم معلوم کرسکیں یا نہ،مگر نفس تعلق سے انکار نہیں ہوسکتا۔غرض کشفی دلائل ان ساری باتوں کا فیصلہ کئے دیتے ہیں۔کان اگر دیکھ نہ سکیں،تو ان کا کیا قصور۔وہ اور قوت کا کام ہے۔ہم اپنے ذاتی تجربہ سے گواہ ہیں کہ ارواح کا تعلق قبر کے ساتھ ضرور ہوتا ہے۔انسان میت سے کلام کرسکتا ہے۔ارواح کا تعلق آسمان سے بھی ہوتا ہے، جہاں اس کے لئے ایک مقام ملتا ہے۔میں پھر کہتا ہوں کہ یہ ایک ثابت شدہ صداقت ہے۔ہندوؤں کی کتابوں میں بھی اس کی گواہی موجود ہے۔یہ مسئلہ عام طور پر مسلمہ مسئلہ ہے۔بجز اس فرقہ گمراہ کے، جو نفی بقائے روح کرتا ہے۔اور یہ امر کہ کس جگہ تعلق ہے، کشفی قوت خود بتلادیگی۔

جیالوجسٹ یعنی عالم علم طبقات الارض بتلادیتے ہیں کہ یہاں فلاں دھات ہے اور وہاں کان ہے۔دیکھو ان میں یہ ایک قوت ہوتی ہے، جو فی الفور بتلادیتی ہے۔پس یہ ایک سچی بات ہے کہ ارواح کا تعلق قبور سے ضرور ہوتا ہے۔یہاں تک کہ اہل کشف توجہ سے میت کے ساتھ کلام بھی کرسکتے ہیں۔

بلاشبہ مرنے کے بعد اجزائے مفارق بدن سے روح کا تعلق رہتا ہے۔نیکوں کی روحیں علیّین میں ہوتی ہیں اور بدوں کی سجین میں۔لیکن روحوں کا روحانی تعلق ابدان کے ذرات مفارق کے ساتھ رہنا ضرور ہے،خواہ کسی قبر میں دفن کریں،خواہ جلادیں،خواہ ڈوب جائے۔ذرے ذرے کے ساتھ، جو اخیر کو روح نے چھوڑے، روح کا تعلق (بالاتر از فہم) رہتا ہے۔اس کی نظیر ایک تار برقی کافی ہے۔تار برقی کا تعلق دیکھئے کہاں سے کہاں تک رہتا ہے۔ایسا ہی روح کا تعلق بدن کے ساتھ ہے اور ضرور ہے۔مگر اس دنیا کی آنکھیں محسوس نہیں کرسکتیں۔کیونکہ عالم غیب کے اسرار دنیا دار کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔اور نہ دکھایا جانا مناسب ہے۔کیونکہ پھر ایمان بالغیب نہیں رہیگا، جس پر فلسفہ انبیاء کا قائم ہے۔لیکن بوجہ محسوس نہ ہونے کے کسی امر کا انکار صریحاً عقل کی بدہضمی ہے۔قبر کا تنگ یا فراخ ہونا یہ بھی ایک عالم باطن کے اسرار سے ہے، جسے اہل دنیا کی آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں، عقلیں دریافت نہیں کرسکتیں۔ہاں صوفی و اولیاء اللہ لوگ دیدہِ باطن سے دیکھ لیتے ہیں۔اہل باطن بسا اوقات کشف قبور کے ذریعہ مُردوں کو قبروں میں معذب یا مثاب دیکھتے ہیں۔قرآن شریف میں فرعون والوں کی نسبت بھی وارد ہے۔ **اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَ عَشِيًّا**۔یعنی صبح و شام دوزخ ان کے پیش نظر کی جاتی ہے۔ (ماخوذ)

حقیقت پل صراط آخرت

عالم آخرت میں ہر ایک سعید اور شقی کو متمثل کر کے دکھلا دیا جائیگا کہ وہ دنیا میں سلامتی کی راہوں پر چلا تھا یا اس نے ہلاکت اور موت جہنم کی راہیں اختیار کی تھیں۔ سو اس سلامتی کی راہ، جو صراط مستقیم اور نہایت باریک ہے اور جس پر چلنے والے بہت تھوڑے ہیں اور جس سے تجاوز کرنا اور ادھر ادھر ہونا درحقیقت جہنم میں گرنا ہے، تمثل کے طور پر نظر آئیگی۔ اور جو لوگ دنیا میں صراط مستقیم پر نہیں چل سکے، وہ اس روز بھی اس صراط پر نہیں چل سکیں گے، کیونکہ وہ صراط درحقیقت دنیا کی روحانی صراط کا نمونہ ہے۔ اور جیسا کہ ابھی سے روحانی آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری صراط کے دائیں بائیں درحقیقت جہنم ہے۔ اگر ہم اس صراط کو چھوڑ کر دائیں طرف ہوئے، تب بھی جہنم میں گریں گے اور اگر بائیں طرف ہوئے، تب بھی جہنم میں گریں گے۔ اور اگر سیدھے صراط مستقیم پر چلے، تب جہنم سے بچ جائیں گے۔ یہی صورت حال جسمانی طور پر عالم آخرت میں ہمیں نظر آئیگی اور ہم آنکھوں سے دیکھیں گے کہ درحقیقت ایک پل صراط ہے، جو پل کی شکل میں دوزخ پر بچھایا گیا ہے، جس کے دائیں بائیں دوزخ ہے۔ تب ہمیں حکم ملے گا کہ اس پر چلیں۔ سو اگر ہم دنیا میں صراط مستقیم پر چلتے رہے ہیں اور دائیں بائیں نہیں چلے، تو ہم کو اس صراط سے کوئی خوف نہیں آئیگا۔ اور نہ جہنم کی بھاپ ہم تک پہنچے گی اور نہ کوئی فزع اور خوف ہمارے دل پر طاری ہوگا، بلکہ نور ایمان کی قوت سے چمکتی ہوئی برق کی طرح ہم اس پر سے گزر جائیں گے۔ کیونکہ ہم پہلے دنیا میں اس پر سے گزر چکے ہیں۔ اسی کی طرف اللہ جل شانہٗ اشارہ فرماتا ہے۔ **مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا وَ هُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ**۔ یعنی نیکی کرنے والوں کو قیامت کے دن اس نیکی سے زیادہ بدلہ ملے گا۔ اور وہ ہر ایک ڈر سے اس دن امن میں رہیں گے۔ ایسا ہی فرمایا ہے۔ **یا عباد لا خوف علیکم الیوم و لا انتم تحزنون**۔ یعنی اے میرے بندو، آج کے دن تم کو خوف نہیں اور نہ کوئی غم ہو سکتا ہے۔ لیکن جو شخص دنیا میں صراط مستقیم پر نہیں چلا، وہ اس وقت بھی نہ چل سکے گا اور دوزخ میں گرے گا اور جہنم کی آگ کا آندھن بن جائیگا۔ جیسا کہ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے۔ **و من جاء بالسیئۃ فکبت وجوھھم فی النار ھل تجزون الا ما کنتم تعملون**۔ یعنی بدی کرنیوالے اس دن جہنم میں گرائے جائیں گے اور کہا جائیگا کہ یہ جزا درحقیقت وہی تمہارے اعمال ہیں، جو تم دنیا میں کرتے تھے۔ یعنی خدا تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔ بلکہ نیکی کے اعمال جنت کی صورت میں اور بدی کے اعمال دوزخ کی صورت میں ظاہر ہو جائیں گے۔ نبی علیہ السلام فرماتے ہیں۔ **انما ھی اعمالکم ترد الیکم**۔ یعنی آخرت میں تمہارے اعمال کا ہی دوزخ اور

بہشت میں تمثل ہوگا اور وہ تمہاری طرف لوٹائے جائیں گے۔

دوزخ و جنت ہمیں اعمال تست　　　ہر چہ کاری بد روی اظلال تست

صراط اُخروی کی فلاسفی حضرت ابن عربیؒ کے الفاظ میں

قد اتی فی صفة الصراط انه ادق من الشعر واحد من السیف و کذا ھو علم الشریعة فی الدنیا لا یعلم وجه الحق فی المسلمة عند الله و لا من ھو المصیب من المجتھدین بعینهٖ فحکمھا بالشرع احد من السیف و ادق من الشعر فی الدنیا فی الشرع ھنا ھو الصراط المستقیم. ولا یزال فی کل رکعة من الصلوٰة یقول العبد اھدنا الصراط المستقیم فھو احد من السیف و ادق من الشعر فظھورہ فی الآخرة محسوس ابین و اوضح من ظھورہ فی الدنیا الا لمن دعا الی الله علی بصیرة کاالرسول و اتباعه فاطلقھم الله بدرجة الانبیاء فی الدعاء الی الله علی بصیرة ای علیعلم و کشف و قد ورد فی خبران الصراط یظھر یوم القیامة منته للابصار علی قدر نور المارین علیه فیکون دقیقا فی حق قوم و عریضا فی حق آخرین یصدق ھذا الخبر قوله تعالیٰ نورھم یسعٰی بین ایدیھم و بایمانھم و السعی مشی و ماثم طریق الا الصراط و انما قال بایمانھم لان المومن فی الآخرة لا شمال له کما ان اھل النار لا یمین لھم ھذا بعض احوال ما یکون علی الصرط و اما الکلالیب و الخطاطیف والحسک ھی من صور اعمال بنی آدم تمسکم علی الصراط فلا ینتھون الی الجنة و لا یقعون فی النار حتی تدرکھم الشفاعة و العنایة الالھیه فمن تجاوز ھنا تجاوز الله عللهہ ھناک و من انظر معسرا انظرہ الله و من عفا عفا الله عنه و من استقصی حقه ھنا من عبادہ استقصی الله حقه منه ھناک و من شدد علی ھذہ الامة شدد الله علیه و انما ھی اعمالکم ترد علیکم فاستزموا مکارم الاخلاق فان غدا یعاملکم بما عاملتم به عبادہ کان ما کان و کانوا ما کانوا ۔ترجمہ۔ پل صراط اُخروی کی صفت میں آیا ہے کہ وہ بال سے باریک تر اور تلوار سے تیز تر ہے۔ اور ایسا ہی دنیا میں علم شریعت کا حال ہے کہ مسائل میں راہ راست جو عنداللہ مقبول و پسندیدہ ہو معلوم نہیں ہوتا۔ پس دنیا میں مسائل کا حکم شرع میں تلوار سے تیز تر اور بال سے باریک تر ہے۔ شریعت میں یہاں صراط مستقیم ہے۔ اسی لئے بندہ نماز میں ہر رکعت میں کہتا ہے۔ **اھدنا الصراط المستقیم** ۔پس وہ تلوار سے تیز تر اور بال سے باریک تر ہے۔ اور آخرت میں دنیا

کی بہ نسبت اس کا ظاہر ہونا واضح تر ہوگا۔ مگر جنہوں نے علی وجہ البصیرت خدا تعالیٰ کی طرف دعوت کی مثل رسولوں اور ان کے اتباع کے، ان کو خدا تعالیٰ انبیاء کے درجہ کے ساتھ ملحق کر دیگا۔ اور احادیث میں آیا ہے کہ صراط قیامت میں گزرنے والوں کے نور کے موافق ظاہر ہوگی۔ پس وہ ایک گروہ کے حق میں باریک ظاہر ہوگی اور دوسرے گروہ کے حق میں کشادہ ہوگی۔ اور اس خبر کی تصدیق خدا تعالیٰ کے اس کلام سے ہوتی ہے کہ مومنوں کا نور ان کے آگے اور دائیں طرف دوڑتا ہوا نظر آئے گا۔ اور وہاں پر صراط کے بغیر کوئی راہ نہ ہوگی۔ اور خدا تعالیٰ کے کلام میں جو آیا ہے کہ ان کا نور دائیں طرف دوڑتا ہوگا۔ یہ اس لئے ہے کہ آخرت میں مومن کا کوئی بایاں نہ ہوگا، جیسا کہ دوزخیوں کے لئے دایاں نہ ہوگا۔ یہ تو صراط اخروی کے بعض احوال ہیں۔ مگر کتے اور جھپٹے مارنے والے اور نوچنے والے جانور اور کانٹے، یہ تو بنی آدم کے عملوں کی صورتیں ہوں گی، جو ان کو پل صرط پر چمٹیں گی۔ ابھی بہشت سے ورے ہی ہوں گے اور دوزخ میں نہ گرے ہوں گے کہ ان کو شفاعت اور عنایت الٰہی پہنچ جائے گی۔ پس جس نے یہاں پر درگزر کیا، خدا تعالیٰ اس سے درگزر کرے گا۔ اور جو کوئی تنگدست کو مہلت دے گا، خدا تعالیٰ اس کو مہلت دے گا۔ اور جو کوئی معاف کرے، خدا تعالیٰ اس کو معاف کرے گا۔ اور کوئی بندوں سے اپنا حق پورا لے، تو خدا تعالیٰ وہاں پر اس سے اپنا حق پورا لے گا۔ اور کوئی اس امت پر سختی کرے، تو خدا تعالیٰ اس پر سختی کرے گا۔ یہ تو تمہارے ہی اعمال ہیں، جو تم پر وارد ہوں گے۔ پس اچھے اخلاق کو لازم پکڑو، کیونکہ خدا تعالیٰ کل کو تم سے وہی معاملہ کرے گا، جو تم بندوں کے ساتھ کرو گے۔

پل صراط کے متعلق حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ کی کشفی شہادت

حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "لطائف المنن الکبریٰ" میں لکھتے ہیں۔

مما وقع لی فی حق نفسی اننی رایت القیامة قد قامت و نصب الصراط و امر الناس بالمشی علیه فم نجا من الوقوع الا القلیل فقیل لی اصعد فقلت لا اقدر فقال لی ملک لعله یکون معک شئی من الدنیا فقلت ما معی شئی فقال بل معک افتح کفک ففتحته فاخرج منه قشة صغیرة کالسفایة من بین اصبع یدی الیسریٰ الابها م و بین السبابة فرمیتها و استیقظت قبل ان اصعد ۔ترجمہ۔"جو بات مجھے میرے حق میں واقع ہوئی وہ یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ قیامت قائم ہوگئی ہے اور پل صراط کھڑی کی گئی ہے۔ اور لوگوں کو اس پر سے گزرنے کا حکم ہوا۔ پس مجھے کہا گیا کہ چڑھ۔ میں نے کہا۔ میں نہیں چڑھ سکتا۔ پس مجھے ایک فرشتہ نے کہا کہ شاید تیرے پاس دنیا کی کوئی چیز ہوگی۔ میں نے کہا نہیں۔ اس نے کہا۔ بلکہ تیرے پاس ہے،

اپنا ہاتھ کھول۔ میں نے ہاتھ کھولا، تو اس سے ایک چھوٹا ٹکڑا میرے بائیں ہاتھ کی بڑی انگلی اور سبابہ کے درمیان سے نکلا۔ پس میں نے اس کو پھینک دیا اور پل صرط پر چڑھنے سے پہلے جاگ پڑا''۔

حقیقت صراط مستقیم بموجب تحریر حضرت امام غزالیؒ

امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے فرشتوں کی مشابہت پیدا کرے، جن میں اوصاف متضادہ، جیسے انسان میں ہیں، نہیں ہیں۔ انسان ان اوصاف سے بکلیہ علیحدہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اس کو حکم ہوا ہے کہ ایسا طریقہ اختیار کرے، جو ان اوصاف سے علیحدہ ہو جانے کے مشابہ ہو، گو کہ حقیقت میں علیحدہ ہو جانا نہ ہو۔ اور وہ توسط ہے، جیسے کہ سموم ہوا پانی کہ نہ گرم ہے اور نہ سرد۔ اور عود کا رنگ کہ نہ سفید ہے اور نہ سیاہ۔ پس کنجوسی اور فضول خرچی انسان کی دو صفتیں ہیں۔ اور سخاوت ان میں توسط کا درجہ رکھتی ہے، جس میں نہ کنجوسی ہے اور نہ فضول خرچی۔ پس صراط مستقیم وہ توسط حقیقی ہے، جو بال سے بھی زیادہ باریک ہے۔ اور جو شخص کہ ان صفات متضادہ کے دونوں سروں سے نہایت درجہ دور ہونا چاہے، تو خواہ مخواہ ان دونوں سروں کے بیچوں بیچ ہوگا۔ مثلاً ایک لوہے کے حلقہ کو آگ میں لال کر کے رکھیں اور اس میں ایک چیونٹی کو ڈال دیں، تو وہ اسکی کی گرمی سے بھاگے گی اور جو جگہ سے سب دور ہوگی، وہاں ٹھہرے گی۔ پس بجز مرکز کے اس کو اور کوئی جگہ نہیں ملے گی اور وہی مرکز وسط حقیقی ہے۔ کیونکہ اس کو ہر طرف سے نہایت درجہ کا بُعد ہے۔ اور اس مرکز یا نقطہ کا مطلق عرض نہیں ہے۔ پس صراط مستقیم وہی وسط ہے، دونوں سروں سے اور اس وسط کا مطلق عرض نہیں ہے اور وہ بال سے بھی زیادہ باریک ہے۔ پھر جب خدا تعالیٰ قیامت میں اس صراط مستقیم کو متمثل کر دیگا، تو جو کوئی دنیا میں صراط مستقیم پر ہوگا، یعنی اس صفات متضادہ انسانی کے استعمال میں حتی المقدور توسط اختیار کیا ہوگا اور کسی جانب مائل نہ ہوا ہوگا وہ صراط آخرت پر بھی سیدھا چلا جائیگا۔ حضرت ملا جلال الدین دوانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اسلامی شریعت آخرت میں بشکل صراط مستقیم دوزخ پر متمثل ہو کر دکھائی دیگی۔ پس جو شخص جادۂ شریعت اسلام پر یہاں سیدھا چلا اور کجرو نہ ہوا، اس کو وہاں بھی اس پر چلنا آسان ہوگا۔ اور جو یہاں ہی ٹیڑھا رہا اور اس صراط مستقیم پر نہ چلا، اس کے لئے وہاں بھی چلنا دشوار ہوگا۔

عالم آخرت میں تخت عدالت الٰہی۔ صفت ملائکہ

میزان اعمال۔ ذبحِ موت ونعمائے جنت کی حقیقت

بسا اوقات انسان کے دل میں اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا عدالت کے دن تخت پر بیٹھنا

اور ملائک کا صف باندھے کھڑے ہونا اور ترازو میں عملوں کا تُلنا اور لوگوں کا پل صراط پر سے چلنا اور سزا و جزا کے بعد موت کو بکرے کی طرح ذبح کر دینا اور ایسا ہی اعمال کا خوش شکل یا بد شکل انسانوں کی طرح لوگوں پر ظاہر ہونا اور بہشت میں دودھ اور شہد کی نہریں چلنا وغیرہ وغیرہ یہ سب باتیں صداقت اور معقولیت سے دور معلوم ہوتی ہیں۔لیکن یہ تمام شکوک اس ایک ہی نکتہ کے حل ہونے سے رفع ہو جاتے ہیں کہ عالم آخرت ایک تمثیلی خلق کا عالم ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے کہ وہ بعض اشیاء کو تمثلی طور پر ایسا ہی پیدا کر دیتا ہے، جیسا کہ دوسرے طور پر ہوا کرتا ہے۔ جیسے تم دیکھتے ہو کہ آئینہ میں تمہاری ساری شکل منعکس ہو جاتی ہے۔اور تم خیال کرتے ہو کہ کس طرح عکسی طور پر تمہاری تصویر کھینچی جاتی ہے، کیسے تمہارے تمام خط و خال اس میں آ جاتے ہیں۔ پھر اگر خدا تعالیٰ روحانی امور کی سچ مچ تصویر کھینچ دے اور ان میں صداقت کی جان ڈال کر تمہاری آنکھوں کے سامنے دکھا دے، تو کیوں اس سے تعجب کیا جائے۔اللہ تعالیٰ ڈھونڈنے والوں پر اس دنیا میں یہ تمام صداقتیں ظاہر کر دیتا ہے۔اور آخرت میں کوئی بھی ایسا امر نہیں، جس کی کیفیت اس عالم میں کھل نہ سکے۔

قیامت میں میزان اعمال کی حقیقت

(۱) میزان درحقیقت اس چیز کا نام ہے، جس سے کسی شے کی کمی یا زیادتی معلوم ہو۔مثلاً دنیا میں ثقیل چیزوں کے تولنے کے لئے پلڑے در ترازو ہے۔آسمانوں کی حرکت اور وقت دریافت کرنے کی میزان یعنی ترازو اصطرلاب ہے، یعنی میزان الشمس۔اور سطروں کے اندازہ کی ترازو مسطر ہے۔اور حرفوں کی مقدار اور حرکات یعنی اشعار کی میزان یعنی ترازو علم عروض ہے۔اور آواز کی حرکات یعنی گانے کی ترازو علم موسیقی ہے۔ پس خدا کو اختیار ہے کہ اعمال کے اندازہ کے طریقہ کو متمثل کر دے، جس سے زیادتی و کمی اعمال کی معلوم ہو اور اس کی صورت محسوس موجود ہو یا صرف خیال میں تمثل ہو۔اور خدا کو معلوم ہے کہ وہ اس کیا ایسی صورت پیدا کریگا، جو محسوس ہو یا ایسی کریگا کہ تمثیل خیالی ہو (غزالی)

(۲) اس زمانہ کے بعض فلاسفہ الٰہین کہتے ہیں کہ قیامت میں خدا تعالیٰ اپنے علم ازلی وابدی سے اور عالم کلیات و جزئیات کے ہونے سے اپنی اُسی صفت عدل سے، جو اس میں ازلی وابدی ہے، ہر ایک کے اعمال نیک و بد کی مقدار ان پر ظاہر کرے گا۔ پس اسی صفت وعدل کو میزان و وزن اعمال سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے نہایت صاف طور پر سورہ انبیاء میں فرمایا ہے۔**و نضع الموازین القسط** ۔یعنی ہم عدل کا ترازو رکھیں گے۔قاموس میں لکھا ہے۔**المیزان معروف و العدل والمقدار و وازنہ' عادلہ'. الموازین هو العدل . المیزان هو العدل** ۔قرآن مجید میں

دوسری جگہوں پر بھی میزان کا لفظ آیا ہے اور اس سے مراد آلہ معروف نہیں ہے۔سورہ شعریٰ میں فرمایا ہے۔**الله الذی انزلا الکتاب بالحق و المیزان و ما یدریک لعل الساعة قریب** ۔اور سورہ حدید میں فرمایا ہے۔ **و لقد ارسلنا رسلنا بالبینات و انزلنا معهم الکتاب و المیزان لیقوم الناس بالقسط** ۔آیات مذکورہ بالا سے کوئی شخص یقین نہیں کرتا کہ سوائے کتاب اللہ کے کوئی ترازو یعنی آلہ معروف وزن کش بھی خدا کے ہاں سے اتری تھی۔

(۳) غزالی رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی لکھتے ہیں، کہ جبکہ یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ نفس انسانی جوہر ہے، جو خود بخود قائم ہے اور جسم کا محتاج نہیں ہے۔تو وہ خود اس بات کے لئے تیار ہے کہ حقائق امور اور جو تعلق اس کو جسد سے تھا، وہ اس پر منکشف ہو جائے۔اور جو کچھ اس پر منکشف ہوگا، اس کے اعمال کی تاثیر ہوگی۔ بلحاظ قرب و بُعد ذات باری تعالیٰ کے اور خدا کی قدرت میں ہے کہ کوئی ایسی راہ نکالے، جس سے ایک لحظہ میں تمام لوگ اپنے اعمال کی مقدار اور ان کی تاثیر معلوم کر لیں۔

(۴) ہر چیز کی کمی بیشی کو جاننے کے لئے ایک ترازو ہوتا ہے۔سیاہ وسفید، اچھی بُری شکل کے دریافت کرنے کے لئے آنکھ ترازو ہے۔اور اچھی بُری آواز کا میزان کان ہے۔اور خوشبو اور بدبو کے لئے ناک اور میٹھی کھٹی کے واسطے زبان اور گرمی و سردی کے لئے تمام بدن اور اسی طرح ہزاروں دوسرے ترازو ہیں۔اسی طرح بھلائی برائی کے معلوم کرنے کے لئے عقل میزان ہے۔لیکن یہ جتنی میزانیں ہیں، اس سب سے فقط ایک تخمین کمی و بیشی کی معلوم ہوتی ہے۔ ہر ایک کی مقدار اور نیز کمی و بیشی کی مقدار ان سے معلوم نہیں ہوتی۔اس سلسلے میں یہ سب ترازو ناقص ہیں۔ بلکہ ایسے ہیں، جیسے کوئی سیر بھر کے پتھر اور دوسیر کے پتھر کو ہاتھ میں لے کر یہ بتلا دے کہ ایک میں زیادہ اور دوسرے میں کم وزن ہے۔اس سے فقط کمی و بیشی معلوم ہوگی۔حقیقت الحال یعنی یہ کتنا ہے اور وہ کتنا ہے اور ان دونوں میں کیا فرق ہے، یہ بات ترازو کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتی۔اور جن چیزوں میں بہت تھوڑا فرق ہوتا ہے، ان کی کمی بیشی بھی ترازو کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتی، جیسے ایک سیر اور پیسا اوپر سیر بھر کی کمی بیشی ترازو کے بغیر معلوم نہیں ہوتی اور نہ ان کی مقدار معلوم ہوتی ہے۔سو ایسے ہی ہماری تمہاری عقل سے بھلائی اور برائی کی کم و بیشی وہیں معلوم ہوسکتی ہے، جہاں پر فرق بہت زیادہ ہو۔تھوڑے تھوڑے فرق اور ان کی صحیح مقدار اس سے ہرگز دریافت نہیں ہوسکتی۔ یہ بات بجز علم خداوندی کے کسی اور کی عقل کا کام نہیں ہے۔عقل بھی اس درگاہ کی دریوزہ گر ہے، چنانچہ غور و فکر کے بعد یہ بات انسان پر آشکار ہوتی ہے کہ یہ علم الٰہی کا ایک محافظ دفتر ہے۔

عالم آخرت پر ایمان لانا لازم ہونے کی وجہ

سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اس امر پر اعتقاد کرے کہ بجز اس بدنی زندگی کے اور کوئی زندگی نہیں ہے۔ اور بدن کے لئے اور کوئی کمال دوسرا نہیں ہے، جس کا طلب کرنا اس کے لئے ضروری ہو۔ جب نفس میں یہ خیال جم جاتا ہے، تو پھر اس کی نظر کبھی کمال کی طرف نہیں اٹھتی۔

ہر کہ آخر بیں بوداو مومن است　　　ہر کہ آخور بین بوداو بیدن است

علاوہ کمال بدن کے دوسرے کمال کا ثبوت عام لوگوں کے لئے جب ہی ممکن ہے کہ موجودہ حالت کی بہمہ وجوہ مخالف حالت کا وہ تصور کر سکیں۔ اور یہ دونوں کمالات جدا جدا ان کے خیال میں نہ آئیں، تو کمال عقلی اور کمال حسی دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہوں اور وہ شخص کمال عقلی کو چھوڑ کر کمال حسی کی طرف مائل ہو جائے، اس لئے لقاء الٰہی اور روز آخرت پر ایمان لانا اس کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُنْكِرَةٌ وَ هُمْ مُسْتَكْبِرُوْنَ۔ ترجمہ۔ یعنی جو لوگ آخرت کا یقین نہیں رکھتے، ان کے دل منکر ہیں اور وہ متکبر ہیں۔ جب آدمی اس درجہ کے گناہ میں رہ کر مر جاتا ہے اور اس کی قوت بہیمی مضمحل ہو جاتی ہے، تو نہایت درجہ کی نفرت و لعنت آسمانی جانب سے اس کو لپیٹی ہے اور وہ کبھی اپنے آپ کو اس سے چھوڑا نہیں سکتا۔

قیامت قائم ہونے کی گھڑی کا کسی کو علم نہ ہونے کی وجہ

بموجب حوالہ قرآن یہ جو کہا جاتا ہے کہ قیامت کی گھڑی معلوم نہیں۔ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ خدا تعالیٰ نے قیامت کے بارے میں انسان کو کوئی اجمالی علم بھی نہیں دیا۔ ورنہ قیامت کی علامات بھی بیان کرنا ایک لغو کام ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جس چیز کو خدا تعالیٰ اس طرح پر مخفی رکھنا چاہتا ہے، اس کی علامات بیان کرنے بھی کیا ضرورت ہے۔ بلکہ ایسی آیات سے مطلب یہ ہے کہ قیامت کی خاص گھڑی تو کسی کو معلوم نہیں، مگر خدا نے حمل کے دنوں کی طرح انسانوں کو اس قدر علم دے دیا ہے کہ ساتویں ہزار سال کے گزرنے تک اس زمین کے باشندوں پر قیامت آ جائے گی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ہر ایک انسان کا بچہ، جو پیٹ میں ہو، نو ماہ اور دس دن تک ضرور پیدا ہو جاتا ہے، تاہم اس کے پیدا ہونے کی خاص گھڑی معلوم نہیں۔ اسی طرح قیامت بھی سات ہزار برس تک آ جائے گی، مگر اس کے آنے کی گھڑی بالخصوص معلوم نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ سات ہزار سال پورے ہونے کے بعد دو تین صدیاں بطور کسور کے زیادہ ہو جائیں، جو شمار میں نہیں آ سکتیں۔ کیونکہ کسر شمار میں نہیں آتی، جیسا کہ حمل کے دن بعض اوقات

کچھ زیادہ ہو جاتے ہیں۔ دیکھو اکثر بچے، جو دنیا میں پیدا ہوتے ہیں، وہ اکثر و بیشتر نو مہینے اور دن دن کے اندر پیدا ہو جاتے ہیں۔لیکن پھر بھی کہا جاتا ہے کہ اس گھڑی کی کسی کو خبر نہیں کہ کب درد زہ شروع ہو گا۔اسی طرح دنیا کے خاتمہ پر اگر چہ ابھی ایک ہزار سال باقی ہیں،لیکن اس گھڑی کی خبر کسی کو نہیں کہ کب قیامت قائم ہوگی۔

وجہ تسمیّہ ءقیامت

قیامت کا لفظ قیام سے ہے، جسکے معنے اپنی وضع و ہیئت پر سیدھا کھڑا ہونے اور ٹھہرنے کے ہیں۔ جب دنیا کی ہر چیز کی تکمیل ہو چکے گی،تو گویا اس وقت ہر چیز کا اپنی وضع و ہیئت اصلی پر قیام وسکون ہو گا۔اور وہ ایک خاص تجلّی الہٰی کا وقت ہو گا۔لہٰذا اس حالت کا نام قیامت ٹھہرا۔تحقیقات جدیدہ سے آسمان کی گردش تو درکنار خود اسکا وجود ہی موہوم سمجھا گیا ہے۔اور سائنس والوں نے اب زمین کے متعلق بعد تجربات ومشاہدات کثیرہ یہ امر ظاہر کیا ہے کہ باعتبار سابق اب روز بروز زمین کی گردش میں فتور پیدا ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر سال کے بعد ۲۲ ثانیہ تک بالکل حرکت معطل ہو جاتی ہے۔ جب یہ حالت ہے،تو بالآخر ایک دن زمین کا ٹھہرنا بھی ماننا پڑا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بالآخر زمین آسمان کا ایک خشک ستارہ ہو جائیگی ۔ کیونکہ سمندوروں کا پانی اب خشک ہو چلا ہے اور بحری سنگریزوں اور اجسام تکون سے آٹھ سو قدم عمیق کی مقدار اب تک تمام سمندروں کا پانی خشک ہوا ہے۔سمندروں کا متوسط عمق ۱۶۰۰۰ قدم سے زیادہ نہیں۔ پس اس حساب سے جس طرح چاند بالکل خشک ہو کر رہ گیا ہے۔اسی طرح دوسوملین برس کے بعد زمین بھی بالکل خشک ہو جائیگی ۔اور سمندروں کا پانی نام کو بھی نہ رہے گا۔اور زمین آسمان کے بعض خشک ستاروں کے مشابہ ہو جائیگی ۔آفتاب سے نکلی اور اسی میں جا ملے گی۔ **کل شئی یرجع الی اصلہ**۔(ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے) اور بالآخر آفتاب بھی فنا ہو جائیگا۔

حقیقت قیامت

(یہ مضمون مولانا محمد قاسم نانوتوی سے ماخوذ ہے)

(۱) واضح ہو کہ جو اشیاء مختلف الاغراض چیزوں سے مرکب ہوا کرتی ہیں، جیسے کھیتی کہ اس میں غلہ آدمیوں کے لئے اور بھس گھانس جانوروں کے لئے ،ایسی چیزیں انجام کار توڑ پھوڑ کر جُدا جُدا کر کے اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیتے ہیں اور ان کے مناسب ان کو کام میں لاتے ہیں۔ مثلاً کھیتی کو ایک روز کاٹ چھانٹ توڑ پھوڑ بھس اور غلہ کو جدا جدا کر کے بھس کو کپوں میں اکٹھا کر دیتے ہیں اور غلہ

کوٹھیوں، کھاتیوں، برتنوں وغیرہ میں جمع کر لیتے ہیں۔ اور پھر اس کو وقتاً فوقتاً جانوروں کو کھلاتے رہتے ہیں۔ اور غلہ کو بقدر ضرورت آپ کھاتے رہتے ہیں۔ پھر اپنے کھانے میں بھی یہ تفریق ہے کہ چھان نچوڑ کرا چھے اچھے غلہ کو اپنے لئے رکھتے ہیں اور ناقص کو خدام اور شاگرد پیشوں اور جانوروں کو کھلاتے ہیں۔ مگر غور سے دیکھا تو اس عالم اجسام کو بھی مختلف الاغراض اجزا سے بنایا ہوا پایا۔ چنانچہ اس کے ہر ہر رکن اور ہر ہر طبقہ سے نمایاں ہے کہ یہ اور کام کا اور وہ اور کام کا۔ اس میں اور کچھ خاصیت ہے۔ اس میں اور کچھ خاصیت۔ زمین میں اور ہی خوبیاں ہیں اور پانی میں اور ہی کچھ فائدے ہیں۔ مومن اور کام کے اور کافر اور کام کے۔ علماء اور کام کے۔ فقراء اور کام کے۔ ذکی اور غبی میں فرق ہے۔ سخی اور بخیل میں تفاوت۔ مرد اور نامرد میں اختلاف۔ مرد و عورت میں افتراق۔ غرض جس چیز کو دیکھئے، اس کا رنگ و بو کچھ اور ہی ہے۔ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ اس میں بھی یہی ہونا چاہئے کہ ایک روز توڑ پھوڑ کر سب کو جدا جدا کر دیں۔ یہاں تک کہ نیکوں کو ان کے ٹھکانے میں اور بدوں کو ان کے جیل خانے میں پہنچا دیں۔ سو اس اپنے موقعہ میں پہنچ جانے کا نام جزا و سزا و یوم القیامت ہے۔

(۲) اور سنئے۔ مجموعہ عالم کو دیکھئے، تو ایسا ہے جیسے آدمی یا کسی جانور کا جسم جیسے چشم و گوش و دست و پا وغیرہ اعضاء جدا جدا کام کے ہیں۔ ایسے ہی اس مجموعہ عالم میں زمین و آسمان وغیرہ ارکان جدا جدا مصرف کے ہیں۔ جیسے اس جسم خاکی میں عناصر اربعہ کی جدا جدا خاصیت ہے۔ ایسے ہی اس عالم ناپائدار میں علویات اور سفلیات کے جدا جدا طبیعت اور خواہشات نفسانی کے جدا جدا تاثیر ہے۔ جسم خاکی میں اگر کسی خلط کے غلبہ کے باعث مزاج اصلی میں تغیر آ جاتا ہے، تو اس کا نام مرض ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے اگر روح کو مفارقت جسم سے کرنی پڑے، تو اس کا نام موت ہے۔

علامت قیامت کی فلاسفی۔ ایسے ہی اس عالم ناپائدار میں کسی رکن یا خواہش کے غلبہ کے باعث اگر ترکیب اصلی میں فرق آ جائے اور کوئی کیفیت تازہ ظہور میں آئے، تو اس کا نام علامت قیامت ہے۔ اور اس کی وجہ سے اس روح اعظم کو جو بمقابلہ روح انسانی اس مجموعہ کے لئے ہونی چاہئے، چنانچہ نظام عالم اور اس کے حُسنِ انتظام سے ظاہر ہے۔ اس مجموعہ سے اگر مفارقت کا اتفاق ہو جائے، تو اس کا نام قیامت ہے۔ مگر یہ ہے تو جیسے بعد مرگ تفرق اجزائے جسم انسانی و حیوانی ضرور ہے۔ یہاں بھی بعد مفارقت مذکورہ تفرق اجزائے عالم ضرور چاہئے۔ سو جیسے بعد تفرق اجزائے جسم انسانی ہر جزو کو اپنے اپنے کرہ کے ساتھ اتصال لازم ہے، ایسے ہیں بعد تفرق اجزائے عالم ہر جزو کو اپنے اپنے طبقہ میں جانا لازم ہے۔ سو نیکوں کا طبقہ جنت میں جانا اور بدوں کا طبقہ دوزخ میں جانا وہی جزا و سزا ہے۔

(۳) اور سنئے۔ باورچی سے کھانا پکواتے ہیں اور درزی سے کپڑا سلواتے ہیں۔ جب وہ ختم ہو جاتا ہے، تب کہیں اس کو اس کی مزدوری عنایت کرتے ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ مزدوری اس کام کے عوض دیتے ہیں۔ اگر وہ کام حسب دلخواہ دیکھا، تو اس کو اس کی اجرت حوالہ کی۔ ورنہ الٹا تاوان بربادی جامہ و جنس کا اس سے تقاضا کرتے ہیں۔ مگر چونکہ یہ بات بعد ہی میں بن پڑتی ہے۔ اس لئے مزدوری بھی بعد ہی میں ملتی ہے۔ اور اگر وہ کام ایسا ہو کہ ایک آدمی نہیں کرسکتا اور ایک دن میں نہیں ہو سکتا، تو بہت سے آدمی بہت سے دنوں میں اس کو پورا کرتے ہیں۔ تو مزدوری کے وصول میں اور بھی دیر لگتی ہے۔ بالخصوص جب کہ وہ کام ٹھکہ پر کرایا جاوے۔ یہ تو مزدوری کا حال تھا۔ اور اگر انعام و سزا کا قصہ ہو، تو پھر تاخیر میں کچھ حرج ہی نہیں، کیونکہ حق غیر کا نہ دینا ظلم ہے۔ اور حق غیر معاملات میں بیع اور اجارہ کی صورت میں اپنے ذمہ ثابت ہوتا ہے۔ انعام اور سزا میں اپنے ذمہ کوئی بات ثابت نہیں ہوتی، جو تاخیر میں ظلم کا احتمال ہو۔ باقی یہ بات تو خود عیاں ہے کہ جیسے ادائے حق غیر میں تاخیر بُری ہے، اپنے حق کے وصول میں تاخیر عمدہ ہے۔ اس لئے اپنے حقوق کی سزا میں تاخیر ہو ہی نہیں سکتی۔ رہا انعام وہ کوئی حق واجب نہیں ہوتا، جو اس کی تاخیر بُری ہو۔ ہاں حقوق العباد کے دلوانے میں شائد تاخیر بُری معلوم ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حکام دنیا کو جو کچھ خدا کی طرف سے عدل و انصاف کی تاکید ہے، اس پر سب اہل مذہب اور تمام اہل عقل شاہد ہیں۔ دنیا میں جو کچھ وصول ہو سکے، اس کے دلانے میں تو خدا کی طرف سے تعجیل ضروری ہو چکی۔ بااین ہمہ آخرت کا قصہ جدا رہا۔ مگر چونکہ خدا بندوں کے حق میں فقط حاکم ہی نہیں والدین سے زیادہ شفیق اور مہربان ہے۔ تو اگر ان کے وقت ضرورت کے لئے ان کے حقوق کو رہنے دے اور اس وقت لے کر ان کے حوالہ کر دے، تو اس سے بہتر ہے کہ قبل از وقت ضرورت اس کو کہہ بیٹھیں۔ سو وقت کمال کی ضرورت تو وہی وقت ہے، جب کہ عالم اسباب سراسر خراب اور برباد ہو جائے۔ اور کوئی حیلہ و وسیلہ اور سبب اور ذریعہ کمائی کا باقی نہ رہے۔ اس وقت کو ہم قیامت کہتے ہیں۔ اس وقت نہ کوئی حیلہ ہوگا نہ کوئی سامان۔ فقط خدا کی رحمت یا ظاہر میں اپنے حقوق ہوں گے۔

(۴) اور سنئے، نشو و نما اگر کار قوت نامیہ ہے، تو تصویر یعنی مناسب حال نامیات صورت و شکل کا بنا دینا قوت مصورہ کا کام ہے۔ مگر چونکہ غذا کا انجام ایک صورت ہوتی ہے، تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ قوت مصورہ منجملہ خدام قوت نامیہ ہے۔ جیسے حیوانات میں قوت نامیہ منجملہ خدام حیات ہے۔ ادھر عالم کو دیکھا، تو خالی صورت سے نہیں اور جس صورت کو دیکھا، وہ ایک وصف اور ایک معنے کو آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ہر وصف اور ہر معنے ایک صورت قابل ظہور عالم شہادت، جسے عالم

محسوسات کہئے، رکھتا ہے۔ چنانچہ خاک کو دیکھا، وہ حقیقت میں صورت پیوست ہے۔ اور پانی کو دیکھا، تو وہ صورت رطوبت ہے۔ اور آتش کو دیکھا، تو وہ صورت حرارت ہے............ آدمی کی شکل کو دیکھا، تو وہ صورت معانی مجتمعہ ہے۔ اس لئے اس میں بھی بہت سی صورتوں سے ترکیب ہے، یعنی روح انسانی مثلاً قوت باصرہ، قوت سامعہ وغیرہ قویٰ کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور یہ سب اوصاف اور معانی ہیں۔ ان کے مقابل میں جو شکل عطا ہوئی، تو بہت سے اعضائے مختلفہ کی ترکیب کے بعد پیدا ہوئی ہے، جس کا حاصل وہ صورت مرکبہ ہے۔ مگر پھر جو دیکھا، تو وہ معانی اور اوصاف جو معانی اور اوصاف متشکلہ کے بعد متحقق ہوتے ہیں، ہنوز مرتبہ ظہور تک نہیں پہنچے۔ اور خلعت صورت ہنوز ان کو عطا نہیں ہوئی۔ اس لئے بحکم قوت نامیہ عالم یہ ضرور ہے کہ جیسے کبوتر و مرغ وغیرہ طیور کی مجامعت اور شہوت سے، جو منجملہ معانی و اوصاف ہیں، بیضہ پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر اس بیضہ سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اور انجام کار کہاں سے کہاں تک نوبت پہنچتی ہے۔ اور یہ سب نشو و نما اور تصویر یعنے قوت نامیہ مصورہ کی کارپردازی ہوتی ہے۔ ایسے ہی وہ معانی غیر متشکلہ ظہور میں آئیں اور صورت دکھلائیں۔ کیونکہ یہ یقینی ہے کہ یہ عالم بالضرور اصل قوت نامیہ کی کارپردازی کا ظہور ہے، اس لئے کہ قوت مصورہ بالضرور منجملہ خدام قوت نامیہ ہے۔ سو حیوانات اور نباتات میں اگر کچھ قوت نامیہ کا ظہور ہے، تو وہ ایسا ہے جیسا نور آفتاب زمینوں اور ذروں اور روشندانوں میں ظہور کرتا ہے۔ غرض جیسے یہاں جو کچھ ہے، وہ اس اصل کا پرتو ہے، جس کو آفتاب کہئے۔ ایسے عالم میں جہاں کہیں قوت نامیہ ہے، وہ اس اصل کو ظہور ہے، جس کو قوت نامیہء عالم کہئے۔ مگر جب بعض معانی اور اوصاف کو دیکھا کہ ہنوز متشکل نہیں ہوئے۔ چنانچہ تمام افعال اختیاری اور ان کی بھلائی اور برائی وغیرہ کو ہنوز یہ خلعت عطا نہیں ہوئی۔ تو یوں معلوم ہوا کہ ہنوز یہ عالم مثل بیضہء کبوتر ہے۔ تفصیل اس کی یوں ہے کہ بیضہ اگرچہ خود شہوت طرفین اور مجامعت فریقین کی ایک صورت ہے اور وہ منجملہ معانی و اوصاف ہے۔ مگر اس کے اندر جو مکنونہ معانی ہیں، اس کو ہنوز صورت نہیں ملی۔ سو جب بیضہ بچہ بن گیا، تو یہ معلوم ہوا کہ اس میں کس قدر قوتیں مکنون تھیں، جن کا ظہور اب ہوا ہے۔ ورنہ پہلے سے اتنا تو جانتے تھے کہ یہ بیضہ دونوں نر و مادہ کی تمام قوتوں کا اجمال ہے۔ اس لئے وقت تفصیل یہ ضروری ہے کہ حاصل ترکیب وہ حاصل اجتماع جملہ قوائے طرفین کے موافق اس کو صورت عنایت ہو۔ مگر جو قصہ یہاں ہے، وہی قصہ بہ نسبت عالم اجسام نظر آتا ہے۔ یہ بھی قوت عملیہ عالم بالا کا اجمال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہنوز تمام معانی کو صورتیں نہیں ملیں۔ الحاصل علم خداوندی اور تمام سامان قدرت خداوندی کا اس عالم کو اجمال کہئے۔ اور کیونکر نہ کہئے۔ تفصیل ہوتی، تو تمام معانی متشکل ہوتے۔ یہ ضرور ہے کہ جیسے بزور قوت نامیہ و

قوت مصورہ مادہ بیضوی کی صورت منقلب ہوکر صورت بیضہ پاش پاش ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی بزور قوت نامیہ وقوت مصورہ یہ شکل عالم پاش پاش ہوکر مادہ عالم کواور شکل عطا ہو۔

(۵) اور سنیئے۔ حکام دنیا کا یہ دستور ہے کہ جس شہر یا قصبہ والے باغی ہو جاتے ہیں اور راہ پر نہیں آتے، تو ان کو سزائے سخت پہنچاتے ہیں۔ یعنی ان کو قتل کرتے ہیں یا دائم الحبس کرتے ہیں۔ اور اس شہر کو جلا پھونک کر خاک سیاہ کر دیتے ہیں۔ اور عمارات کو توڑ پھوڑ مسمار کر کے اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ جرم بغاوت سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں۔ اس کے مناسب یہی ہے کہ وہ سزا دی جائے، جس سے بڑھ کر کوئی سزا نہ ہو۔ مگر غور سے دیکھا تو بنی آدم رعیت خداوندی اور یہ زمین وآسمان ان کے رہنے کا مکان کیونکہ انہیں کے لئے بنایا گیا ہے، پھر ان کو یہ حال کہ بالاتفاق تمام عالم میں تمرد اور سرکشی روز افزوں ہے۔ اگر راہ مرچند روز کے لئے آ گئے، تو وہ ایسا ہے جیسا چراغ مردہ سنبھالا لے لیتا ہے۔ اس لئے یوں یقین ہے کہ ایک روز نہ ایک روز یہ بغاوت عالمگیر ہو جائے۔ اور کیوں نہ ہو بنائے بغاوت خواہش پر ہے اور وہ طبعی ہے اور بنائے اطاعت خواہش کی مخالفت پر ہے۔ اور وہ عارضی ہے۔ یہی وجہ ہوئی کہ ہمیشہ اطاعت کے لئے کتابیں اور پیغمبر بھیجے گئے۔ ثواب وعذاب کے وعدے کیئے گئے۔ تمرد اور سرکشی کے لئے ان میں سے کچھ نہیں ہوا۔ اس لئے یہ ضرور ہے کہ ایک روز کفر عالم میں چھا جائے اور تمام عالم باغی ہو جائے۔ اس وقت بمقتضائے قہاری خداوندی یہ ضرور ہے کہ اس عالم کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیں۔ اور تمام بنی آدم کو گرفتار کر کے انکو ان کی شان کے مناسب جزا وسزا دیں۔
(قاسم نانوتوی)

یوم الحساب۔ حشر۔ یوم الفصل کی وجہ تسمیہ

قیامت کو عربی زبان میں یوم الحساب اور حشر اور یوم الفصل کہتے ہیں۔ یوم الحساب کہنے کی وجہ تو خود ظاہر ہے۔ اور حشر کہنے کی یہ وجہ ہے کہ عربی میں حشر جمع کو کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس وقت کتنا مجمع ہوگا۔ اور یوم الفصل اس لئے کہتے ہیں کہ یہاں تو نیک و بد سب باہم مخلوط اور ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور اس روز سب کو جدا جدا کیا جائیگا، تا کہ ہر ایک کو اس کے مناسب مقام میں پہنچا ئیں۔

حقیقت قرنائے قیامت

قرآن مجید میں جس طرح تنزہ ذات باری تعالیٰ کا اور اس کے کاموں کا بیان ہے، وہ اس قسم کے خیالات کا بالکل مانع ہے کہ ظاہر طور پر قرنا لے کر کوئی فرشتہ پھونکے۔ نفخ صور یعنی قرنا پھونکنا صرف

استعارہ ہے۔ بعث وحشر اور تبدل حالت کا۔ جس طرح لشکر میں قرنا پھونکنے سے سب مجتمع ہوتے اور لڑنے کو کھڑے ہو جاتے ہیں اور گروہ در گروہ آ موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح بعث وحشر میں ارادۃ اللہ سے، جس طرح کہ اس نے اپنے قانون میں مقرر کیا ہے، ہوگا۔ وقت موجود میں سب لوگ اٹھیں گے اور جمع ہو جائیں گے۔ اس حالت کا نفخ صور سے استعارہ کیا گیا ہے۔ پس نفخ صور سے قرآن مجید میں کوئی صور بمعنے متعارف مراد نہیں ہیں۔ اور نہ یہ ہے کہ اس کو فرشتے لئے ہوں گے اور اس کو پھونکیں گے۔

وَ اللّٰہُ تَعَالیٰ یُعَرِّفُ النَّاسَ مِنْ اُمُوْرِ الْآخِرَۃِ بِاِمْثَالِ مَا شُوْھِدَ فِی الدُّنْیَا مِنْ عَادَۃِ النَّاسِ اَلنَّفِخُ فِی الْبُوْقِ عِنْدَ الْاَسْفَارِ فِی الْعَسَاکِرِ. اِنَّ النَّفْخَ فِی الصُّوْرِ اِسْتَعَارَۃِ وَ الْمُرَادُ مِنْهُ الْبَعْثُ وَا لْحَشَرُ یَجُوز اَنْ یَّکُوْنَ تَمْثِیْلاً لِدُعَاءِ الْمَوْتٰی . فَاِنْ خُرُوْجَھُمْ مِنْ قَبُوْرِھِمْ کَخَرُوْجَ الْجَیْشِ عِنْدَ سَمَاءِ صَوْتَ الْبُوْق ۔ ترجمہ۔ خدا تعالیٰ انسانوں کو امور آخرت دنیا میں عادی طور پر پائی جانے والی مثالوں سے متعارف کراتا ہے، جیسے فوجی لشکروں میں بگل کا بجایا جانا۔ جب کہ صور کا پھونکا جانا ایک استعارہ ہے، جس سے مراد حشر میں اٹھایا جانا ہے۔ اس کا استعمال تمثیلی طور پر مُردوں کے بلائے جانے کے لئے ہے۔ کیونکہ ان کا اپنی قبروں سے نکلنا صور کی آواز سننے پر ایک فوج کے کوچ کرنے کی طرح ہے۔

حقیقت مکافات اعمال

یعنی انسان کو نیکی پر اجر وثواب اور بدی کرنے پر عذاب ملنے کی وجہ

(۱) ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ ہر ایک انسان کے لئے دو جاذب موجود ہیں، یعنی کھینچنے والے۔ ایک جاذب خیر ہے، جو نیکی طرف اس کو کھینچتا ہے۔ دوسرا جاذب شرّ ہے، جو بدی کی طرف کھینچتا ہے، جیسا کہ یہ امر مشہود اور محسوس ہے کہ بسا اوقات انسان کے دل میں بدی کے خیالات پڑتے ہیں اور وہ اس وقت ایسا بدی کی طرف مائل ہوتا ہے کہ گویا کوئی اسکو کوئی بدی کی طرف کھینچ رہا ہے۔ اور پھر بعض اوقات نیکی کے خیالات اس کے دل میں پڑتے ہیں اور اس وقت وہ ایسا نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے کہ گویا نیکی کی طرف کوئی کھینچ رہا ہے۔ اور بسا اوقات ایک شخص بدی کر کے پھر نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے اور نہایت شرمندہ ہوتا ہے کہ میں نے برا کام کیوں کیا۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی کو گالیاں دیتا ہے اور مارتا ہے۔ اور پھر نادم ہوتا ہے اور دل میں کہتا ہے کہ یہ کام میں نے بہت بیجا کیا۔ اور اس سے کوئی نیک سلوک کرتا ہے یا معافی چاہتا ہے۔ یہ دونوں قسم کی قوتیں ہر ایک انسان میں پائی جاتی ہیں۔ اور شریعت اسلام نے نیکی کی قوت کا نام لمہ ملک اور بدی کی قوت کو لمہ شیطان سے موسوم کیا ہے۔ خدا تعالیٰ

جووراءالوراء اسرار ظاہر کرتا ہے اور عمیق اور پوشیدہ باتوں کی خبر دیتا ہے، اس نے ان دونوں قوتوں کو مخلوق قرار دیا ہے۔ جو نیکی کا القاء کرتا ہے، اس کا نام فرشتہ اور روح القدس رکھا ہے۔ اور جو بدی کا القاء کرتا ہے، اس کا نام شیطان اور ابلیس قرار دیا ہے۔

یہ دونوں قوتیں، جو ہر ایک انسان میں موجود ہیں، ان دونوں کی حالتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے۔ اور ان کے پیدا کرنے سے خدا تعالیٰ کی غرض یہ ہے کہ تا انسان اپنے نیک اعمال سے اجر پانے کا مستحق ٹھہر سکے۔ کیونکہ اگر انسان کی فطرت ایسی واقعہ ہوتی کہ وہ بہر حال نیک کام کرنے کیلئے مجبور ہوتا اور بد کام کرنے سے طبعاً متنفّر ہوتا، تو پھر اس حالت میں نیک کام کا ایک ذرہ بھی اسکو ثواب نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ اس کی فطرت کا خاصہ ہوتا۔ لیکن اس حالت میں کہ اسکی فطرت دو کششوں کے درمیان ہے اور وہ نیکی کی کشش کی اطاعت کرتا ہے، اس کو اس عمل کا ثواب مل جاتا ہے۔ اور یہی حال بدی کا بدلہ ملنے کا ہے یعنی جس قوت کا مطیع ہوتا ہے، اسی کے مطابق بدلہ پاتا ہے۔ **ان کان خیرا فجزاء ہ خیر و ان کان شر فجزاء ہ شرٌ** ۔ (اگر نیک تھا، تو اس کا بدلہ بھی نیک ہوگا اور اگر بد تھا تو اسکی جزا بد ہی ہوگی)

(۲) انسان کی عملی اور اعتقادی غلطیاں ہی دراصل عذاب کی جڑھ ہیں۔ اور وہی درحقیقت خدا تعالیٰ کے غضب سے آگ کی صورت پر متمثّل ہو جائیں گی۔ اور جس طرح پتھر پر سخت ضرب لگنے سے آگ نکلتی ہے، اس طرح غضب الٰہی کی ضرب انہیں بداعتقادیوں اور بدعملیوں سے آگ کے شعلے نکالے گی۔ اور وہی بداعتقادوں اور بدکاروں کو کھا جائیگی۔ جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ بجلی کی آگ کے ساتھ خود انسان کی اندرونی آگ شامل ہو جاتی ہے، تب دونوں مل کر اس کو بھسم کر دیتی ہیں۔ اسی طرح غضب الٰہی کی آگ بداعتقادی اور بدعملی کی آگ سے بھڑکتی ہے۔ سو جو لوگ ایسے طور کی زندگی بسر کرتے ہیں کہ نہ تو سچی خداشناسی کی وجہ سے ان کے اعتقاد درست ہیں، اور نہ وہ بداعمالیوں سے باز رہتے ہیں، بلکہ ایک جھوٹے کفارہ پر بھروسہ کر کے دلیری سے گناہ کرتے ہیں۔ ان کو علم ہی نہیں کہ دراصل انسان کے اندر دوزخ کا شعلہ اور اندر ہی نجات کا چشمہ ہے۔ دوزخ کا چشمہ فرو ہونے سے خود نجات کا چشمہ جوش مارتا ہے۔ لیکن یہ علوم حاصل نہیں ہو سکتے، جب تک انسان حقیقی طور پر اسلام میں داخل نہ ہو اور اس کے پاک علم سے فیض نہ اٹھائے، جو کہ آسمانی علوم کو لے کر آیا ہے۔

(۳) جزا و سزائے انسانی کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے کہ صورت نوعیہ کا اقتضاء ہے۔ جیسا کہ چارپائے جب گھاس چرتے ہیں اور درندے گوشت کھاتے ہیں، تو ان کا مزاج صحیح و سالم رہتا ہے۔ اور جب چارپائے گھاس کی بجائے گوشت کا استعمال کرتے ہیں اور درندے بجائے گوشت گھاس کھاتے

ہیں، تو ان کا صلی مزاج بگڑ جاتا ہے۔ یہی حال آدمی کا ہے۔ جب وہ ایسے اعمال کرتا ہے کہ جن کی روح میں بارگاہ حق تعالیٰ میں فروتنی اور نیازمندی کا اثر ہوتا ہے، تو اس انسان میں پاکیزگی اور فیاضی وعدالت کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس کا ملکی وروحانی مزاج درست رہتا ہے۔ اور جب ایسے کام کرتا ہے کہ جن کی روح ان امور کے برخلاف ہوتی ہے، تو اس کی ملکی حالت بگڑ جاتی ہے۔ اور جب وہ اس جہان سے انتقال کرتا ہے، تو اس وقت وہ نفرت وانس کا اثر اپنے اندر ایسا پاتا ہے، جیسا بہائم اور ہم جلنے میں تکلیف معلوم ومحسوس کرتے ہیں۔

حقیقت بہشت ودوزخ

اس میں کلام نہیں کہ ہر قسم کی چیزوں کا لذت دار ہوں یا بے لذت ہوں، لذت اور تکلیف دونوں ہی سے خمیر ہے۔ تو اس صورت میں ان کے اجزا کا شیرازہ بھی جدا جدا کر کے اپنی اپنی جگہ پہنچا ئیں گے۔ مگر یہ تقسیم رنج وراحت بھی اس تقسیم نیکی وبدی میں داخل ہے۔ کیونکہ لذت بھلائی کی اقسام میں سے ہے اور رنج برائی کی۔ تو ان کی اصل کے بھی دو مقام ہوں گے۔ جن کو بہشت دوزخ کہہ کے تعبیر کیا ہے۔ اس لئے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ دنیا کی ہر قسم کی لذتیں اگر چہ عورتوں سے صحبت کرنا ہی کیوں نہ ہو، بہشت میں پائی جائیں۔ ہاں زیادہ ہو، تو کچھ عجیب نہیں۔ اور علی ھذاالقیاس دوزخ میں دنیا کی ہر قسم کی تکلیفیں موجود ہوں، البتہ اگر ان سے زیادہ ہوں، تو کچھ دور نہیں۔ دوسرے وہاں کی لذتیں اور کلفتیں گو یہاں کی لذتوں اور کلفتوں کے ہمرنگ ہوں، پھر یہاں کی لذتوں اور کلفتوں کو وہاں کی لذتوں اور کلفتوں سے کچھ نسبت نہ ہو، کیونکہ نہ یہاں کی لذتیں خالص لذتیں ہیں اور نہ یہاں کی تکلیفیں خالص تکلیفیں ہیں۔ اس تقریر سے یوں ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کی لذتیں اور تکلیفیں خالص لذتیں اور خالص تکلیفیں ہوں گی۔ بہر حال بہشت ودوزخ جن جن مکانوں کو کہتے ہیں، ان کا ہونا بجا و درست ہے۔

عالم آخرت کے نظارے

جاننا چاہئے کہ عالم آخرت درحقیقت دنیوی عالم کا ایک عکس ہے۔ اور جو کچھ دنیا میں روحانی طور ایمان اور ایمان کے نتائج اور کفر اور کفر کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں، وہ عالم آخرت میں جسمانی طور پر ظاہر ہو جائیں گے۔ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے۔ **مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى**۔ یعنی جو اِس جہان میں اندھا ہے، وہ اُس جہان میں بھی اندھا ہوگا۔ ہمیں اس تمثیلی وجود سے کچھ تعجب نہیں کرنا چاہئے اور ذرا سوچنا چاہئے کہ کیونکر روحانی امور عالم رؤیا میں متمثل ہو کر نظر آ جاتے ہیں۔ اور

عالم کشف میں تو اس سے بھی عجیب تر ہے کہ باوجود عدم غیبت حِس اور بیداری کے روحانی امور طرح طرح کی جسمانی اشکال میں اپنی آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں، جیسا کہ بسا اوقات عین بیداری میں ان روحوں سے ملاقات ہوتی ہے، جو اس دنیا سے گذر چکے ہیں۔ اور وہ اسی دنیوی زندگی کے طور پر اپنے اصلی جسم میں اس دنیا کے کپڑوں میں سے ایک پوشاک پہنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور باتیں کرتے ہیں۔ اور بسا اوقات ان میں سے مقدس لوگ باذنہٖ تعالیٰ آئندہ کی خبریں دیتے ہیں۔ اور وہ خبریں مطابق واقعہ نکلتی ہیں۔ صاحب حال حضرت خاتم الاولیاء (ابن عربی) تحریر فرماتے ہیں کہ بسا اوقات عین بیداری میں ایک شربت یا کسی قسم کا میوہ عالم کشف میں ہاتھ میں آتا ہے اور وہ کھانے میں نہایت لذیذ ہوتا ہے۔ کشف کی اعلیٰ قسموں میں سے یہ ایک قسم ہے کہ بالکل بیداری میں واقع ہوتا ہے۔ اور یہانتک دیکھا گیا ہے کہ ایک شرین طعام یا کسی قسم کا میوہ یا شربت غیب سے نظر کے سامنے آگیا ہے اور وہ ایک غیبی ہاتھ سے منہ میں پڑتا جاتا ہے اور زبان کی قوت ذائقہ اس کے لذیذ طعم سے لذت اٹھاتی جاتی ہے۔ اور دوسرے لوگوں سے باتوں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اور حواس ظاہری بخوبی اپنا اپنا کام دے رہے ہیں۔ اور یہ شربت یا میوہ بھی کھایا جارہا ہے اور اسکی لذت اور حلاوت بھی ایسی ہی کھلی کھلی طور پر معلوم ہوتی ہے، بلکہ وہ لذت اس لذت سے نہایت الطف ہوتی ہے اور یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ وہم ہوتا ہے یا صرف بے بنیاد تخیلات ہوتے ہیں۔ بلکہ واقعی طور پر وہ خدا جسکی شان بالکل خلق علیم ہے، ایک قسم کا تماشا دکھا دیتا ہے۔ پس جبکہ اس قسم کے خلق اور پیدائش کا دنیا میں ہی نمونہ دکھائی دیتا ہے اور ہر ایک زمانہ کے عارف اسکے بارے میں گواہی دیتے چلے آتے ہیں، تو پھر وہ تمثیلی خلق اور پیدائش، جو آخرت میں ہوگی، اور میزان اعمال نظر آئیگی اور پل صراط نظر آئیگا۔ اور ایسا ہی بہت سے اور امور روحانی جسمانی

....

حاشیہ۔ سوال۔ اگر کہو کہ اعمال و افعال کا کس طرح وزن اور محاسبہ ہو سکے گا، کیونکہ وہ اجسام اور قائم بالذات نہیں ہیں؟ جواب۔ مقیاس الحرارت ایجاد فرنگ کو ملاحظہ کرو کہ کس طرح اس کے ساتھ گرمی و سردی کا اندازہ و وزن کر لیتے ہیں۔ حالانکہ گرمی و سردی اجسام و جواہر میں سے نہیں ہیں۔ بلکہ اعراض میں سے ہیں۔ پس قادر مطلق خالق الاعراض والجواہر پر دشوار نہیں ہے کہ وہ جس طرح چاہئے اعمال اافعال کا موزنہ کرسکتا ہے۔ مؤلف

....

تشکل کے ساتھ نظر آئیں گے۔ اس سے کیوں عقلمند تعجب کرے۔ کیا جس نے یہ سلسلہ تمثیلی خلق اور پیدائش کا دنیا میں ہی عارفوں کو دکھا دیا ہے، اس کی قدرت سے یہ بعید ہے کہ وہ آخرت میں بھی دکھا دے۔ بلکہ ان تمثیلات کو عالم آخرت سے نہایت مناسبت ہے۔ کیونکہ جس حالت میں اس عالم میں جو

کمال انقطاع کی تجلی گاہ نہیں ہے، یہ تمثیلی پیدائش تزکیہ یافتہ لوگوں پر ظاہر ہو جاتی ہے۔تو پھر عالم آخرت میں جو اکمل اور اتم انقطاع کا مقام ہے، کیوں نہ نظر آئے۔

یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہیئے کہ انسانِ عارف پر اس دنیا میں وہ تمام عجائبات کشفی رنگوں میں کھل جاتے ہیں کہ جو ایک محجوب آدمی قصہ کے طور پر قرآن کریم کی ان آیات میں پڑھتا ہے، جو معاد کے بارے میں خبر دیتی ہیں۔سو جسکی نظر حقیقت تک نہیں پہنچتی، وہ ان بیانات سے تعجب میں پڑ جاتا ہے۔

دوزخ کے سات اور بہشت کے آٹھ دروازے ہونے کا راز

سوال۔دوزخ کے سات دروازے ہیں اور بہشت کے آٹھ۔اس کا سرّ ہے؟

جواب۔اصل جرائم بھی سات ہی ہیں۔اور نیکیوں کے اصول بھی سات ہیں۔بہشت کا جو آٹھواں دروازہ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت کا دروازہ ہے۔دوزخ کے سات دروازوں کے جو اصول جرائم ہیں، ان میں سے ایک بدظنی ہے۔بدظنی کے ذریعہ بھی انسان ہلاک ہوتا ہے۔اور تمام باطل پرست بدظنی سے گمراہ ہوتے ہیں۔دوسرا اصول تکبر ہے۔تکبر کرنیوالا اہل حق سے الگ رہتا ہے اور اسے سعادتمندوں کی طرح اقرار کی توفیق نہیں ملتی۔تیسرا اصول جہالت ہے۔یہ بھی ہلاک کرتی ہے۔چوتھا اصول اتباع ہے اور پانچواں کورانہ تقلید ہے۔اور یہ سب کے سب قرآن شریف سے مستنبط ہیں۔

خدا تعالیٰ نے ان دروازوں کا علم مجھے دیا ہے۔انسان کے وہ اعضاء، جن سے نیکی یا بدی سرزد ہوتی ہے، وہ سات ہیں اور ان کو ذو وجہین پاؤ گے۔مثلاً کان۔دماغ۔آنکھ۔منہ۔ہاتھ۔پاؤں۔شرمگاہ۔جہاں تک شریعتیں دنیا میں پائی جاتی ہیں، یا جس قدر اخلاقی اصول ہیں، ان سب کا تعلق انہیں کے ساتھ ہے۔آنکھ میں یہ قوت بھی ہے کہ خدا کی قدرت کا مشاہدہ کرے اور یہ قدرت بھی کہ شہوت بھری نظر کسی عورت پر ڈالے۔کان میں یہ قوت بھی ہے کہ خدا کی حمد وستائش سنے اور یہ بھی کہ کسی کی چغلی یا دوسرے بری بری باتیں سنے۔زبان میں یہ قوت بھی ہے کہ خدا کی حمد وستائش ادا کرے اور یہ بھی کہ کسی کی بدی کرے یا کسی کو برا کہے اور برے خیالات کا اظہار کرے۔علیٰ ھذا القیاس۔ہاتھ پاؤں وغیرہ بھی دوہری قوتیں رکھتے ہیں۔غرض انسان کے ذو وجہین اعضاء میں دو متضاد قوتیں رکھی گئی ہیں۔انسان بدون کسی دقت کے ان سے کام لے سکتا ہے۔پس یہ اعضاء ہیں، جن کے ساتھ اخلاقی شریعت، بلکہ قوانین معاش و معاد کا تعلق ہمیں نظر آتا ہے۔

فالنار منک و بالاعمال توقدھا　　کما یعالجھا فی الحال مطفیھا

فانت بالطبع منھا ھاربٌ ابداً　　و انت فی کل حال منک تنشیھا

ترجمہ۔یعنی دوزخ کی آگ تجھ میں سے پیدا ہوتی ہے، جس کو تم اپنے اعمال بد سے بھڑکاتے ہو، جیسا کہ تم اس کو اپنے اعمال صالحہ سے بجھا سکتے ہو۔ بالطبع مدام تم اس سے بھاگتے ہو اور ہر حال میں تم آگ کو اپنے اعمال سے پیدا کرتے ہو۔

یہی ساتوں اعضاء ہیں، جو دوزخ و بہشت کے دروازے ہیں۔ان ساتوں اعضاء سے نیکی کی طرف رغبت ومیل کرنا گویا بہشت کے سات دروازوں میں داخل ہونا ہے۔ پس جو شخص ان اعضاء کو خدا تعالیٰ کی اطاعت میں لگا کر اپنے مالک حقیقی کو خوش کریگا، وہ اس کی محنت و اجر واجبی سے بڑھ کر ساتواں بہشت انعام و اکرام کے طور محض اپنی خوشنودی مزید میں عطا کریگا۔ چنانچہ یہی قاعدہ ہے کہ جو شخص اپنے مالک وآقا کو خوش کرتا ہے اور اس کی نافرمانی سے مجتنب رہتا ہے، تو وہ اس کو واجبی تنخواہ و اجرت سے بڑھ کر بھی کچھ انعام و اکرام ضرور دیا کرتا ہے۔ اور جو شخص ان ساتوں اعضاء سے اپنے پروردگار کا نافرمان رہیگا، اس کے لئے ساتوں دوزخ کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ یہی سات اعضاء ہیں، جن سے نفس امارہ کی خواہشات پوری ہوتی ہیں۔ اور ان کے ذریعہ انسان اپنے آپ کو جہنمی ٹھہراتا ہے۔ اور اسی طرف مولانا رومی اپنی کتاب مثنوی میں اشارہ فرماتے ہیں۔

قصہء نفس ار بپرسی اے پسر　　　قصہء دوزخ بخواں باہفت سر

یہی ساتوں اندام ہیں، جنکا دھونا ومسح کرنا انکی سرزدہ بدیوں کے اثر کو مٹانے وتوجہ کرنے کی غرض سے لازم ٹھہرایا گیا ہے۔

بہشتی نعمتوں، نہروں، درختوں اور حوروں کی حقیقت

دوزخ اور بہشت دونوں اصل میں انسان کی زندگی کے اظلال اور آثار ہیں۔ کوئی ایسی نئ جسمانی چیز نہیں ہیں کہ دوسری جگہ سے آئیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ دونوں جسمانی طور پر متمثل ہوں گے۔ مگر وہ اصل روحانی حالتوں کے اظلال وآثار ہوں گے۔ بہشت کے متعلق یہ خیال مت کرو کہ صرف جسمانی طور پر ایک زمین میں درخت لگائے گئے ہوں گے۔ اور نہ ایسی دوزخ کا گمان کرو کہ جس میں درحقیقت گندھک کے پتھر ہیں۔ بلکہ اسلامی عقیدہ کے موافق بہشت و دوزخ انہی اعمال کے انعکاسات ہیں، جو دنیا میں انسان کرتا ہے۔ عالم معاد میں وہ تمام امور، جو دنیا میں روحانی تھے، جسمانی طور پر متمثل ہوں گے۔ خواہ عالم معاد میں برزخ کا درجہ ہو یا عالم بعث کا درجہ۔ چنانچہ خدا تعالیٰ اس بارے میں فرماتا ہے۔ **یوم تری المؤمنین و المؤمنات یسعیٰ نورھم بین ایدیھم و بایمانھم** ۔ترجمہ۔یعنی اس روز تو دیکھے گا کہ مؤمنوں کا یہ نور، جو دنیا میں پوشیدہ طور پر ہے، ظاہر ظاہر ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف دوڑتا ہوگا۔ اور پھر ایک جگہ فرماتا ہے۔ **یوم تبیض وجوہٌ** ۔یعنی اس دن بعض منہ سفید اور نورانی

ہوں گے۔اوراہل دوزخ کے متعلق فرماتا ہے۔**و تسود وجوہٌ** ۔یعنی اس دن بعض منہ سیاہ ہو جائیں گے۔اور پھر ایک اور آیت میں فرماتا ہے۔ **مثل الجنة التی وعد المتقون فیها انهار من ماء غیر اسن و انهار من لبن لم یتغیر طعمه و انهار من خمر لذة للشاربین وا نهار من عسل مصفی**۔ یعنی وہ بہشت، جو پرہیزگاروں کو دی جائیگی، اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک باغ ہے۔اس میں اس پانی کی نہریں ہیں، جو کبھی متعفن نہیں ہوتا۔اور نیز اس میں دودھ کی نہریں ہیں، جس کا کبھی مزہ نہیں بدلتا۔اور نیز اس میں اس شراب کی نہریں ہیں، جو نہایت صاف ہیں، جس کے ساتھ کوئی کثافت نہیں۔اس جگہ صاف طور پر فرمایا کہ اس بہشت کو مثالی طور پر یوں سمجھ لو کہ ان تمام چیزوں کی ناپیدا کنار نہریں ہیں۔وہ زندگی کا پانی، جو عارف دنیا میں روحانی طور پر پیتا ہے، اس میں ظاہری طور پر موجود ہے۔اور وہ روحانی دودھ، جس سے وہ شیر خوار بچے کی طرح روحانی طور پر دنیا میں پرورش پاتا ہے، بہشت میں ظاہر ظاہر دکھائی دیگا۔اور وہ خدا کی محبت کی شراب، جو دنیا میں روحانی طور پر عارف کے منہ میں جاتی تھی، وہ بہشت میں محسوس اور نمایاں نہروں کی طرح دکھائی دے گی۔اور ہر ایک بہشتی اپنی نہروں اور اپنے باغوں کے ساتھ اپنی روحانی حالت کا اندازہ کھلا کھلا اور نمایاں دیکھے گا۔اور خدا بھی اس دن بہشتیوں کے لئے حجابوں سے باہر آ جائیگا۔غرض روحانی حالتیں مخفی نہیں رہیں گی، بلکہ جسمانی طور پر نظر آئیں گی۔حضرت مولانا روم اپنی کتاب مثنوی شریف میں نعمائے بہشت کی فلاسفی ذیل میں تحریر فرماتے ہیں۔

چوں سجودے با رکوع مرد کِشت — شد دراں عالم سجودے او بہشت
چوں بپرید از دہانت حمد حق — مرغ جنت ساختش رب الفلق
چون ز دستت رفت ایثار و زکات — کشت ایں است آن طرف نخل وزکات
آب صبرت آب جوئے خلد شد — جوئے شیر خلد مہر تست و ود
ذوق طاعت گشت جوئے انگبیں — مستی و شوق تو جوئے خمر بیں
آں صفت در امر تو بود ایں جہاں — ہم در امت تست آں جوہا رواں

ترجمہ۔یعنی جب کوئی شخص دنیا میں رکوع وسجود کی کھیتی بوتا ہے، یعنی نماز پڑھتا ہے، تو اس جہان میں اس کی نماز سے بہشتی محل ومکانات تیار ہو جاتے ہیں۔جب نمازی کے منہ سے خدا تعالیٰ کی صفت وثنا کا کلمہ نکلتا ہے، تو خدا تعالیٰ اس سے بہشت کے درختوں پر پرندہ بنا دیتا ہے۔جب تم اس جہان میں سخاوت کرو گے اور صدقہ دو گے، تو اس سے اُس جہان میں کھجور کے درخت اور سبزے بن جائیں گے۔تمہاری محبت الٰہی سے دودھ کی نہریں بن جائیں گی۔اور اطاعت الٰہی

میں تمہارے ذوق ولذت سے شہد کی نہریں تیار جو جائیں گی۔ مصائب وتکالیف میں تمہاری ثابت قدمی سے بہشت کی نہروں کا پانی ہو جائیگا۔ اور تمہاری محبت الہٰی کی مستی وشوق الہٰی سے بہشتی شراب بن جائیگی۔

عن ابن مسعود قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لقيت ابراهيم ليلة اسرى بى فقال يا محمد اقراء امتک منى . السلام و اخبرهم ان الجنة طيبة التربة عذبة الماء ا انها قيعان و ان غراسها سبحان الله والحمد لله و لا اله الاالله و الله اكبر.

ترجمہ۔ ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ معراج کی رات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے فرمایا کہ اے محمد اپنی امت کو میرا سلام کہواور ان کو خبر دو کہ بہشت کی مٹی پاک ہے اور اس کا پانی میٹھا ہے اور وہ صاف میدان ہے۔ یعنی اس میں کوئی درخت نہیں ہے۔ اس میدان میں درختوں کے لگانے کا ذریعہ خدا کی تسبیح وتحمید وتہلیل وتکبیر ہے۔

عن حكيم بن معاوية عن ابيه عن النبى صلى الله عليه وسلم قال ان فى الجنة بحر الماء و بحر العسل و بحر اللبن و بحر الخمر ثم تشقق الانهار بعد هذا .

ترجمہ۔ حکیم بن معاویہ نے اپنے باپ سے اور اس نے نبی علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ بہشت میں دریا ہے پانی کا، اور دریا ہے شہد کا، اور دریا ہے دودھ کا، اور دریا ہے شراب کا۔ پھر اس کے بعد نہریں نکلیں گی۔

عن ابن جابرؓ عن النبى صلى الله عليه وسلم قال من قال سبحان الله العظيم و بحمده غرست له' نخلة فى الجنة ۔ ترجمہ۔ جابر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ جو شخص **سبحان الله العظيم و بحمده** کہتا ہے، اس کیلئے بہشت میں درخت لگایا جاتا ہے۔ الغرض بہشتی نعمتیں انسان کے لئے اپنے ہی اعمال کے اظلال وآثار ہیں، جو قیامت میں مجسم ہو جائیں گے۔

دوزخ و جنت ہمیں اعمال تست　　　　ہر چہ کاری بدروی اظلال تست

مؤلف کے عندیہ میں صالحہ مردوں وعورتوں کے درمیان حسب مناسبت روح جنت میں نکاح ہوگا اور توالد وتناسل جاری رہے گا۔ لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہاں پر فرشتوں کی طرح زندگی ہوگی۔ مردوں وعورتوں کے دنیا والے جوڑ نہ ہوں گے۔ اور نہ دنیا والی عورتیں مردوں کے ماتحت ہوں گی۔ بلکہ جنتی مردوں اور عورتوں کے لئے ان کے اپنے اعمال صالحہ سے ان کے جنتی جوڑے تیار ہوں گے، جن کو حوریں کہتے ہیں۔ اور دوزخی مردوں وعورتوں کے لئے ان کے اپنے اعمال بد سے دوزخی جوڑے تیار ہوں گے، جو قرنائے سُو کے نام سے موسوم ہیں۔ ان جوڑوں سے جو آخرت میں توالد وتناسل ہوگا، وہ

اُخروی رنگ کا ہوگا۔(مؤلف)

الغرض بہشتی زندگی کی بنیاد اسی جہان سے پڑتی ہے۔ چنانچہ خداتعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَ عَمِلُو الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ۔یعنی خوشخبری سنا دوان لوگوں کو جوایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں کہ وہ ان باغوں کے وارث ہیں، جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔اس آیت میں خداتعالیٰ نے ایمان کو باغ کے ساتھ مشابہت دی ہے، جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔پس واضح رہے کہ اس جگہ ایک اعلیٰ درجہ کی فلاسفی کے رنگ میں بتلایا گیا ہے کہ جو رشتہ نہروں کا باغ کے ساتھ ہے، وہی رشتہ اعمال کا ایمان کے ساتھ ہے۔پس جیسا کوئی باغ بغیر پانی کے سر سبز نہیں ہوسکتا، ایسا ہی کوئی ایمان بغیر نیک کاموں کے زندہ ایمان نہیں کہلاسکتا۔اگر ایمان ہو اور اعمال نہ ہوں، تو وہ ایمان ہیچ ہے۔اور اگر اعمال ہوں اور ایمان نہ ہو، تو وہ اعمال ریاکاری ہیں۔اسلامی بہشت کی یہی حقیقت ہے کہ وہ اس دنیا کے ایمان اور عمل کا ایک ظل ہے۔وہ کوئی نئی چیز نہیں، جو باہر سے آ کر انسان کو ملے گی۔ بلکہ انسان کی بہشت انسان کے اندر ہی سے نکلتی ہے۔اور ہر ایک کی بہشت اس کا ایمان اور اس کے اعمال صالحہ ہیں، جن کی اسی دنیا میں لذت شروع ہو جاتی ہے۔اور پوشیدہ طور پر ایمان اور اعمال کے باغ نظر آتے ہیں۔اور نہریں بھی دکھائی دیتی ہیں۔لیکن عالم آخرت میں یہی باغ کھلے طور پر محسوس ہوں گے۔

حقیقت حور وغلمان وطعام اہل جنت

(مندرجہ ذیل مضمون مولوی غلام حسن صاحب رجسٹرار وآنریری مجسٹریٹ پشاور نے لکھ کر بھجوایا ہے، جو کہ اس مقام پر قابل اندراج ہے۔لیکن مؤلف کو ان کے اس مضمون میں پیش کردہ خیالات بابت انقطاع توالد سے اتفاق نہیں ہے)

دنیا کی لغات میں یہ گنجائش نہیں کہ وہ مابعد الموت کے حالات کو، جو حواس سے غائب ہیں، صحیح طور پر تعبیر کرسکیں۔اس واسطے الہامی کتابیں مادی دنیا میں رہنے والوں کے ذہن ان کی طرف منتقل کرنے کے لئے مثالیں دے کر بیان کرتی ہیں۔ پھر ہر ایک انسان اپنی فہم کی وسعت اور ان معلومات کے مطابق، جو اس کو اپنے محسوسات سے حاصل ہوتے ہیں، اشیائے مابعد الموت کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر لیتا ہے۔اور یہ نقشہ کبھی واقعہ کے مطابق نہیں ہوسکتا۔ لان فی الجنۃ ما لا عین رات و لا اذن سمعت و لا خطر علیٰ قلب بشر ۔(ترجمہ از مرتب۔کیونکہ جنت میں جو کچھ ہوگا، اس کو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور کسی کان نے نہیں سنا اور نہ قلب بشر پر وہ چیز کھلی ہے)اگرچہ انسان کا خاصہ ہے کہ غیر محسوس اشیاء کی کوئی تصویر اپنے ذہن میں قائم کر لیتا ہے۔تاہم اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اس

کی تشریح مسلّمات کے خلاف نہ ہو۔ جنت اوراہل جنت کے متعلق اہل اسلام کے مسلّمات حسب ذیل ہیں۔سب ایک سن کے ہوں گےاور خالد (یعنی ان میں کمی بیشی راہ نہ پائے گی) سب امارد کی شکل میں ہوں گے،جن پر بال نہ ہوں گے۔توالدوتناسل وہاں نہیں ہوگا۔پس جوقواء دنیا میں صرف توالدوتناسل کے لئے رکھے گئے ہیں،ان کا وجود ہی نہیں ہوگا۔جو کچھ اہل جنت کو ملے گا،ان کے اعمال کی جزاان کے اعمال کے موافق ہوگی (جزاءً وفاقاً)

ان کے طعام میں سوائے مادیت کے اورسب اشیاء ازقسم رنگ اور بُو اور ذائقہ اورلذت کے ہوں گے۔اوراس کا استعمال بدل ما یتحلل کے طور پرنہیں ہوگا، بلکہ تفکر وتلذذ کے طور پر ہوگا۔اور چونکہ اس میں مادیت نہیں ہوگی،اس واسطے میں نے یہاں بعض امور کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ ورنہ میری بحث کا موضوع صرف حوراورغلمان جنت ہیں،جن کے متعلق لوگوں میں بعض غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اوّل اس امر کو ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ قرآن کریم نے جنت کوایمان اوراعمال صالحہ کا ثمرہ قرار دیا ہے اوراس میں دنیا کے رجال اورنساء دونوں شامل ہیں۔جس سے بعدالموت دنیا کا وہ امتیاز، جوتوالد کے لئے ضروری ہے،سلب کرلیا جائیگا۔جونعمائے جنت رجال کودیئے جائیں گے،وہ یکساں طور پرنساء کوبھی عطا ہوں گی۔حوراورغلمان جواہل جنت کے لئے موعود ہیں،وہ نہ تو دنیا کی نساء ہیں اور نہ دنیا کے غلام۔ بلکہ وہ اہل جنت کے بعض اعمال ہیں،جوان صورتوں میں متمثّل ہوں گےاوراہل جنت کے لئے مثل اہل بیت اورخدام کے ہوں گے۔اوران کی خدمت اورمصاحبت سے اہل جنت کوجس قسم کا تلذذ حاصل ہو گا،اس کی حقیقت کا نشان اس دنیا میں تلاش کرنا محال ہے۔قرآن کریم کی آیات میں، جہاں حور وغلمان کا ذکر ہے، میں ان کو یہاں درج کرتا ہوں۔**اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مُقَامٍ اَمِيْنٍ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ يَلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَ اسْتَبْرَقٍ مُتَقَابِلِيْنَ كَذٰلِكَ وَ زَوَّجْنَاهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ يَّدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ آمِنِيْنَ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَةَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى وَ وَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ فَضْلاً مِنْ رَبِّكَ. ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ**۔ترجمہ۔تحقیق متقی لوگ امن کے مقام میں ہوں گے۔ باغوں اور چشموں میں۔ باریک اور گاڑھی ریشم کا لباس پہنیں گے۔ایک دوسرے کے آمنے سامنے اس طرح ہوگا کہ ہم ان کی تزویج گوری اورموٹی آنکھوں والیوں کے ساتھ کریں گے۔ یہاں متقین کے لئے جونعماء موعود ہیں،ان میں حورعین کی تزویج بھی شامل ہے۔اور یہ ظاہر ہے کہ یہ آیت صرف مردوں کے حق میں نازل نہیں ہوئی، بلکہ متقین میں رجال اورنساء دونوں شامل ہیں۔یہی الفاظ سورہ طور کے رکوع اول میں ہی پائے جاتے ہیں۔وہاں بھی آیت **اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ** سے شروع ہوتی ہے۔

اور موعودہ نعمائے جنت کے ضمن میں زَوَّجْنَاهُمْ بِحُوْرٍ عِين ۔اور يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ درج ہیں۔ یہاں بھی متقین میں رجال اور نساء دونوں شامل ہیں۔سورہ واقعہ کے رکوع اول میں ولدان اور حور دونوں کا ذکر ہے، جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔وَالسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ اُولٰئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْم. ثُلُّةٌ مِنَ الْاَوَّلِيْنَ وَ قَلِيْلٌ مِنَ الْاٰخِرِيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ مُّتَّكِئِيْنَ عَلَيْهَا مُتَقَابِلِيْنَ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُخَلَّدُوْنَ بِاَكْوَابٍ وَ اَبَارِيْقَ وَ كَاْسًا مِن معينٌ لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَ لَا يَنْزِفُوْنَ وَ فَاكِهَةٍ مِمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ وَ لَحْمِ طَيْرٍ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ وَ حُوْرٌ عِيْنٌ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنَ جَزَاءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْن.

ان آیات میں سابقون کے لئے ،جن میں دنیا کے رجال اور نساء دونوں داخل ہیں، جو نعماء الٰہی ذکر کئے گئے ہیں، ان میں ولدان خدمت کے لئے اور حور عین تزویج کے لئے نیز مذکور ہیں اور آخر میں ہے جَزَاءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْن ۔یعنی یہ سب نعماء، جو اوپر مذکور ہوئے ہیں، اہل جنت کے اعمال کی جزا ہے، یعنی ان کے اپنے اعمال ان نعماء کے صور میں متمثل ہوں گے۔سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْن. وَ سَلَامٌ عَلٰى الْمُرْسَلِيْنَ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۔

بنی آدم کی جنتی تزویج و نکاح و سلسلہ توالد و تناسل کی حقیقت

جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جنت میں تزویج و نکاح سے انسانی تقدس و نظافت میں نقص آتا ہے، وہ محض ناواقفی و سوء فہم و عدم تدبیر کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ دنیا میں لاکھوں انبیاء و اولیاء اور رشی گذرے ہیں، جو تعلق تزویج سے مبرا نہ تھے اور اس سے ان کی تقدس مآبی میں کوئی نقص لاحق نہ ہوا۔ تو یہ امر جنت میں بھی ہو، تو اس سے کوئی قباحت لازم نہیں آتی۔

دوسرا امر کہ آیا جنت میں نوع انسان کا سلسلہ توالد و تناسل جاری رہے گا یا منقطع ہو جائیگا۔اور دنیا والی عورتوں کے ساتھ جنت میں نکاح ہوگا یا نہیں۔سو اس بارے میں بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ یہ ہر دو سلسلے منقطع ہو جائیں گے۔مگر ہمیں بچند وجوہات ذیل لکھنا پڑتا ہے کہ یہ ہر دو سلسلے جاری رہیں گے۔

اول۔ یہ کہ قرآن کریم سے ثابت ہے کہ جنت میں بھی ترقیات کا سلسلہ مدام جاری رہے گا، خواہ جسمانی ہو یا روحانی۔

دوم۔ ہر تزویج میں سرور و حظ بھی مدنظر ہوتا ہے اور ہر سرور و حظ کی ایک غایت بھی ہوتی ہے۔

سوم۔قرآن کریم سے ثابت ہے کہ اہل جنت کے ہاں اولاد بھی ہوگی۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وِلْدَان مُخَلَّدُوْن ۔اور غِلْمَان لَهُمْ ۔بعض نے لکھا ہے کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

دنیاوی ازواج مطہرات تھیں، وہی آخرت میں آپ کی بیویاں ہوں گی۔اور یہ ایک نمونہ باقیوں کا موئد ہے۔گو بالعموم دنیاوی عورتوں کی تزویج ونکاح کا سلسلہ بوجہ موافقت روحانیت الٹ پلٹ ہوکر از سرنو وہاں تزویج ہوگی۔ چنانچہ آنحضرتؐ سے پوچھا گیا کہ جس عورت نے دنیا میں کئی شوہر کئے، وہ آخرت میں کس کے ساتھ ہوگی، تو فرمایا کہ وہ آخرت میں اس کی زوجہ ہوگی۔جس کے ساتھ اس کی روحانی موافقت ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ نوح ولوط علیہما السلام کی دنیاوالی خائنہ بیویاں جنت میں ان کے ساتھ نہ ہوں گی۔(اعلام الموقنین)۔

اس بارے میں حضرت محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "فتوحات مکیہ" میں لکھتے ہیں کہ آخرت میں توالد وتناسل دومختلف جنسوں، بنی آدم اور حوروں، کے درمیان بھی ہوگا، جن کو خداتعالیٰ بہشت میں انسان کی صورت پر پیدا کرے گا اور وہ آدمی نہیں ہوں گی۔گوبعض نے لکھا ہے کہ یہ سلسلہ منقطع ہوجائیگا۔مگران پراس امر کی حقیقت منکشف نہیں ہوئی کہ آدمیوں اورعورتوں کے درمیان بھی توالد ہوگا۔جب آدمی چاہے گا اپنی ساری جنتی عورتوں سے بغیر پس وپیش زمانہ کے مثل خوش ذائقہ میوہائے جنت کے مقاربت کرلیگا۔جب مرد حور یا عورت سے مقاربت کریگا، تو اس کو ہر بار اتنی لذت اور حلاوت حاصل ہوگی کہ جس کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا۔اگر وہ ایسی لذت دنیا میں پائے، تو شدت لذت وحلاوت کے بیہوش ہوجائے۔ جب مرد مقاربت کرے گا، تو ہر بار اس کے عضوتناسل سے جوش مارنے والی ہوا خارج ہوکرعورت کے رحم میں پڑے گی اور اسی وقت رحم میں بچہ تیار ہوجائیگا۔اوراس کی خلقت دوحرکات مباشرت کے درمیان کامل ہوجائیگی اور بچہ صحیح اندام وکامل الخلقت ہوکر جب عورت سانس لے گی، تو اس کے ساتھ طبیعی طور پر مجرد روحانی رنگ پر پیدا ہوجائیگا۔ یہ روحانی تناسل دومتماثل و مختلف جنسوں کے درمیان ابدالآباد جاری رہیگا۔اور جو بچے پیدا ہوں گے، والدین انکو برائے العین مشاہدہ کریں گے اور وہ فرشتوں کی طرح ہوں گے، جو بیت المعمور میں داخل ہوتے ہیں۔اور پھر دوبارہ اس کی طرف واپس نہیں آتے۔ یہ نوع انسان کے توالد وتناسل اُخروی کی صورت ہے۔ان بچوں کو جنت محسوس سے کوئی حصہ نہ ملے گا۔اور نہ وہ معنوی جنت کے مرتبہ کوپہنچ سکیں گے۔ان کی جنت برزخی ہو گی، جیسا کہ خواب والا حالت خواب میں دیکھتا ہے۔اور یہ امر ان کی طبیعی پیدائش کی وجہ سے ہے۔اور ارواح انسانی کا توالد وتناسل آخرت میں ایسا ہوگا، جیسا کہ دنیا میں ہوتا ہے۔ان کے لئے وہاں برزخی ملاپ اور ملاقاتیں ہوں گی۔مثلاً خواب والا دیکھتا ہے کہ وہ اپنی زوجہ سے مباشرت کرتا ہے، جس سے اس کو بچہ پیدا ہوا ہے۔پس جب بندہ ایسی حالت میں ہوتو برابر ہے کہ وہ دنیا میں ہو یا آخرت میں۔اور

مرد کی اخروی بیوی وہ ہوگی، جس کے ساتھ اس کی روحانی موافقت ہوگی۔ ان کی مقارنت سے روحانی اولاد پیدا ہوگی۔ ان کی پیدائش جسمانی وحسی اولاد کی طرح نہ ہوگی۔ بلکہ وہ بزرگ فرشتوں کی طرح پاکیزہ ارواح پیدا ہوں گے۔ (فتوحات مکیہ)

امور اخروی کے حقائق صرف یہی نہیں ہیں، جو کچھ ہم لکھ چکے ہیں، بلکہ **اُعِدَّتْ لِعِبَادِی الصَّالِحُوْنَ مَا لَا عَیْنٌ رَأت وَ لَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَ لَا خَطَر عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ. آمَنُتُ بِاللّٰهِ وَ مَلَائِکَتِهٖ وَ کُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْیَوْمِ الْآخِرِ وَ بِجَمِیْعِ اَقْسَامِ الْبَعْثِ وَ الْحَشْرِ وَ الْنَشَرِ** ۔ترجمہ از مرتب۔ میں نے صالح بندوں کے لئے ان چیزوں کو دُوہرا دیا ہے، جن کو کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال آیا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہوں اور ملائکہ پر اور اس کی کتابوں اور رسولوں پر اور یوم آخرت پر اور جملہ قسم کے اٹھائے جانے پر اور حشر اور نشر پر۔

دوزخ و بہشت کا مقام کہاں ہے؟

بہشت اور دوزخ کی جڑ اسی دنیا میں پڑتی ہے، جیسا کہ دوزخ کے باب میں ایک جگہ قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **نَار اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تُطْلِعُ عَلَی الْاَفئِدَةِ** ۔یعنی دوزخ وہ آگ ہے کہ خدا کا غضب اس کا منبع ہے اور گناہ سے بھڑکتی ہے اور پہلے دل پر غالب ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس آگ کی اصل جڑ وہ غم اور حسرتیں اور درد ہیں، جو دل کو پکڑتے ہیں، کیونکہ تمام روحانی عذاب پہلے دل سے ہی شروع ہوتے ہیں۔ اور پھر تمام بدن پر محیط ہو جاتے ہیں۔ اس بارے میں حضرت مولانا روم فرماتے ہیں۔

ظاہر است ایں دوزخ اما بر دلت ہست پوشیدہ یقین ز آب وگلت
ہر کجا خواہد خدا دوزخ کند روح را بر مرغ دام و فخ کند
ہم زدندانت بر آرد درد ہا تا بگوئی دوزخ است و اژدہا
یا کند آب دہانت را عمل تا بگوئی کہ بہشت است وحلل
ازبن دندان بر دیاند شکر تا بدانی قوت حکم قدر
پس بدنداں بیگناہاں را مگز فکر کن از ضربت ما محترز
نیل را بر قبطیاں حق خوں کند سبطیاں را از بلا مصئوں کند
آب برفرعون درد مے خون میشود بر کلیمے قند نا ممنون شود
تابدانی پیش حق تمیزہا است درمیاں ہوشیار و راہ مست
نیل تمیز از خدا آموختہ است کہ کشادہ آں رادیں راسخت بست
لطیف او عاقل کند مر پیل را قہر او ابلہ کند قابیل را
در جمادات از کرم عقل آفرید عقل از عاقل بہ قہر خود برید

اس سوال کا جواب کہ دوزخ و بہشت کہاں ہیں اور کدھر ہیں۔ یہ سوال از روئے عقل قابل استماع نہیں۔موجود ہونے کے لئے یہ لازم نہیں کہ ہمیں معلوم بھی ہو۔خود اس زمین میں ہزار ہا مقامات اور اشیاء ایسی ہیں، جن کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔اگر زمین وآسمان کے اندر ہو اور ہمیں معلوم نہ ہو، تو کیا یہ امر محال ہے۔اور زمین وآسمان سے باہر ہو، تو کیا یہ ممتنع ہے؟

کیا نعمائے جنت دنیاوی نعمتوں کی طرح ہوں گی؟

اس سوال کے جواب میں خدا تعالیٰ کا پاک کلام یوں وارد ہے **فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَا اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٌ** ۔ترجمہ۔یعنی کوئی نفس نیکی کرنے والا نہیں جانتا کہ وہ کیا کیا نعمتیں ہیں، جو اس کیلئے مخفی ہیں۔اور ان نعمتوں کے بارے میں حدیث نبوی میں یہ بھی لکھا ہے۔ **اعدت لعباد الصالحون ما لا عین رات و لا اذن سمعت و لا خطر علی قلب بشر** ۔یعنی نیک بندوں کیلئے وہ نعمتیں آخرت میں تیار ہیں، جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی دل پر ان کا خیال گزرا۔
یہ تو ظاہر ہے کہ دنیا کی نعمتیں ہم پر مخفی نہیں۔اور دودھ اور انار اور انگور وغیرہ کو ہم جانتے ہیں اور ہمیشہ یہ چیزیں کھاتے ہیں۔سو اس سے معلوم ہوا کہ وہ چیزیں اور ہیں اور ان کو ان چیزوں سے صرف نام

کا اشتراک ہے۔ پس جس نے بہشت کو دنیا کی چیزوں کا مجموعہ سمجھا، اس نے قرآن شریف کا ایک حرف بھی نہیں سمجھا۔ آیت اول الذکر کی شرح میں ہمارے سید و مولا نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بہشت اور اس کی نعمتیں وہ چیزیں ہیں، جو نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سنیں اور نہ دلوں میں گزریں۔ حالانکہ ہم دنیا کی نعمتوں کو آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں اور کانوں سے بھی سنتے ہیں اور دل میں بھی وہ نعمتیں گزرتی ہیں۔ پس جب خدا تعالیٰ اور اس کا رسول ان چیزوں کو نرالی چیزیں بتلاتا ہے، تو ہم قرآن سے دور جا پڑتے ہیں اگر یہ گمان کریں کہ بہشت میں بھی دنیا کا ہی دودھ ہوگا، جو گائیوں اور بھینسوں سے دوہا جاتا ہے۔ گویا دودھ دینے والے جانوروں کے وہاں ریوڑ کے ریوڑ موجود ہوں گے اور درختوں پر شہد کی مکھیوں نے بہت سے چھتے لگائے ہوں گے اور فرشتے تلاش کر کے وہ شہد نکالیں گے اور نہروں میں ڈالیں گے۔ کیا ایسے خیالات اس تعلیم سے کچھ مناسبت رکھتے ہیں، جس میں یہ آیتیں موجود ہیں کہ دنیا نے ان چیزوں کو کبھی نہیں دیکھا اور وہ چیزیں روح کو روشن کرتی ہیں اور خدا تعالیٰ کی معرفت بڑھاتی ہیں۔ اور روحانی غذائیں ہیں۔ گو ان غذاؤں کا تمام نقشہ جسمانی رنگ پر ظاہر کیا گیا ہے، مگر ساتھ ساتھ بتایا گیا ہے کہ ان کا سرچشمہ روح اور راستی ہے۔

نعمائے بہشت کے بیان میں ہم لکھ چکے ہیں کہ عالم معاد میں وہ تمام امور، جو دنیا میں روحانی تھے، جسمانی طور پر متمثل ہوں گے۔ خواہ عالم معاد میں برزخ کا درجہ ہو یا عالم بعثت کا درجہ۔ اس بارے میں یعنی جہنمی سزا و عذاب کے متعلق جو کچھ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اس میں سے ایک یہ آیت ہے۔ **مــــن کـان فی ھٰذہ اعمٰی فھو فی الآخرۃ اعمٰی و اضلّ سبیلاً** ۔ ترجمہ۔ یعنی جو شخص اس جہان میں اندھا ہوگا، وہ دوسرے جہان میں بھی اندھا ہوگا۔ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ اس جہان کی روحانی نابینائی اُس جہان میں جسمانی طور پر مشہود اور محسوس ہوگی۔ ایسا ہی دوسری آیت میں آیا ہے۔ **خُـذُوْہُ فَغُلُّوْہُ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْہُ فِی سِلْسِلَۃٍ ذَرْعُھَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعاً فَاسْلُکُوْہُ** ۔ یعنی اس جہنمی کو پکڑو۔ اس کی گردن میں طوق ڈالو۔ پھر دوزخ میں اس کو جلاؤ۔ پھر ایسی زنجیر میں، جو پیمائش میں ستر گز ہے، اس کو داخل کرو۔ جاننا چاہئے کہ ان آیات میں ظاہر فرمایا ہے کہ دنیا کا روحانی عذاب عالم معاد میں جسمانی طور پر نمودار ہوگا۔ چنانچہ طوق گردن دنیا کی خواہشوں کا، جس نے انسان کے سر کو زمین کی طرف جھکا رکھا تھا، وہ عالم ثانی میں ظاہری صورت پر نظر آ جائیگا۔ اور ایسا ہی دنیا کی گرفتاریوں کی زنجیر پیروں میں پڑی ہوئی دکھائی دیگی۔ اور دنیا کی خواہشوں کی سوزشِ آگ ظاہر ظاہر بھڑکتی ہوئی نظر آئیگی۔ فاسق انسان دنیا کی زندگی میں ہوا و ہوس کا ایک جہنم کی سوزشوں کا احساس کرتا ہے۔ پس جب کہ اپنی فانی شہوات سے

دور ڈالا جائیگا۔اور ہمیشہ کی ناامیدی ظاہری ہوگی۔تو خدا تعالیٰ ان حسرتوں کو جسمانی آگ کے طور پر اس پر ظاہر کریگا، جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔وحیل بینھم و بین ما یشتھون۔یعنی ان میں اور ان کی خواہشوں کی چیزوں میں جدائی ڈالی جائیگی۔اور یہی عذاب کی جڑھ ہوگی۔اور پھر جو فرمایا کہ ست گز کی زنجیر میں اس کو داخل کرو۔یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک فاسق انسان بسا اوقات ستر برس کی عمر پالیتا ہے۔بلکہ کئی دفعہ اس دنیا میں اس کو ستر برس بھی ملتے ہیں کہ خوردسالی کی عمر اور پھر فوت ہونے کی عمر الگ کر کے پھر اس قدر صاف اور خالص حصہ عمر کا اس کو ملتا ہے، جو عقلمندی اور محنت اور کام کے لائق ہوتا ہے۔لیکن وہ بدبخت اپنی عمدہ زندگی کے ستر برس دنیا کی گرفتاریوں میں گزارتا ہے اور اس زنجیر سے آزاد ہونا نہیں چاہتا۔سو خدا تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ وہی ستر برس، جو اس نے گرفتاری دنیا میں گزارے تھے، عالم معاد میں ایک زنجیر کی طرح متمثل ہو جائیں گے، جو ستر گز کی ہوگی۔ ہر ایک گز بجائے ایک سال کے ہے۔اس جگہ یاد رکھنا چاہئے کہ خدا تعالیٰ اپنی طرف سے بندہ پر کوئی مصیبت نہیں ڈالتا۔ بلکہ وہ انسان کے اپنے برے کام اس کے آگے رکھ دیتا ہے۔ پھر اس اپنی سنت کے اظہار میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔اِنْطَلِقُوْ اِلٰی ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰاثِ شُعَبٍ لَا ظَلِیْلٍ وَ لَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّھَبِ۔ترجمہ، یعنی اے بدکارو، گمراہو۔سہ گوشہ سایہ کی طرف چلو، جس کی تین شاخیں ہیں، جو سایہ کا کام نہیں دے سکتیں۔اور نہ گرمی سے بچاسکتی ہیں۔اس آیت میں تین شاخوں سے مراد قوت سبعی اور بہیمی اور وہمی ہے۔جو لوگ ان تینوں قوتوں کو اخلاقی رنگ میں نہیں لاتے اور ان کی تعدیل نہیں کرتے، ان کی یہ قوتیں قیامت میں اس طرح نمودار کی جائیں گی کہ گویا تین شاخیں بغیر پتوں کے کھڑی ہیں اور گرمی سے بچا نہیں سکتیں۔اور وہ گرمی سے جلیں گے۔

خدا تعالیٰ نے ایسا ہی بے ایمانی کے خبیث درخت کا نام عالم آخرت میں زقوم رکھا ہے۔چنانچہ وہ فرماتا ہے۔ اَذٰا لِکَ خَیْرٌ اَمْ شَجَرَۃَ الزَّقُوْمِ اِنَّا جَعَلْنَاھَا فِتْنَۃً لِلظَّالِمِیْنَ اَنَّھَا شَجَرَۃٌ تَخْرِجُ فِیْ اَصْلِ الْجَحِیْمِ طَلْعُھَا کَاَنَّہٗ رَؤُسُ الشَّیَاطِیْنِ اِنَّ سَخَّرَۃَ الزَّقُوْمُ طَعَامِ الْاَثِیْمِ کَالْمُھْلِ یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ کَغَلْیِ الْحَمِیْمِ ذُقْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْکَرِیْمِ. ترجمہ۔یعنے تم بتلاؤ کہ بہشت کے باغ اچھے ہیں یا زقوم کا درخت، جو ظالموں کے لئے ایک بلا ہے۔وہ ایک درخت ہے، جو جہنم کی جڑھ میں سے نکلتا ہے، یعنی تکبر اور خودبینی سے پیدا ہوتا ہے۔یہی دوزخ کی جڑھ ہے۔ اس کا شگوفہ ایسا ہے، جیسا کہ شیطان کا سر۔شیطان کے معنے ہیں ہلاک ہونے والا۔یہ لفظ شیط سے نکلا ہے۔پس حاصل کلام یہ ہے کہ اس کا کھانا ہلاک ہونا ہے۔اور پھر فرمایا کہ زقوم کا درخت دوزخیوں کا کھانا

ہے، جو عمداً گناہ اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ کھانا ایسا ہے جیسا کہ تانبا گلا ہوا کھولتے ہوئے پانی کی طرح پیٹ میں جوش مارنیوالا۔ پھر دوزخی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ اس درخت کو چکھ، تو عزت والا اور بزرگ ہے۔ یہ کلام نہایت غضب کا ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر تو تکبر نہ کرتا اور اپنی بزرگی اور عزت کا پاس کر کے حق سے منہ نہ پھیرتا، تو آج یہ تلخیاں تجھے نہ اٹھانی پڑتیں۔ پس اب خوب واضح ہو گیا ہے کہ بہشت اور دوزخ کی جڑھ اسی دنیا سے پڑ جاتی ہے۔ مولوی رومی صاحب فرماتے ہیں۔

چوں ز دستت زخم بر مظلوم رست　　آں درختے گشت ازاں زقوم رست
چوں زخشم آتش تو در دلہا زدی　　مایۂ نار جہنم آمدی
آتشت ایں جا چو آدم سوز بود　　آنچہ ازوے زاد نار افرور بود
آتش تو قصد مردم مے کند　　نار کزوے زاد بر مردم زند
آں سخنہائے چوں مارو کژدمت　　مارو کژدم گشت و می گیرد ومت
خشم تو تخم سعیر دوزخ است　　ہیں بکش ایں دوزخت را کایں فخ است

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لو ان قطرة من الزقوم قطرت فی دار الدنيا لا فسدت على اهلها معايشهم فكيف بمن يكون طعامه ۔ترجمہ۔ یعنی نبی علیہ السلام فرماتے ہیں۔ اگر بالفرض ایک قطرہ دوزخ کی تھوہر سے مقام دنیا میں گر پڑے، تو اہل دنیا کی معیشت کی چیزوں کو خراب کر دے۔ پس کیا حال ہوگا اس شخص کا، جس کا یہ کھانا ہوگا۔ دوزخ کا نمونہ اس دنیا میں جذام۔ گلٹ۔ کوڑھ۔ محرقہ تپ۔ طاعون۔ کالرہ۔ اور ہموم وغموم اور افکار مخلوق میں موجود ہیں۔ آتشک اس آتش کا یاد دہندہ اور سوزاک اس سوزش کا نمونہ ہیں۔ بدکاریوں کے بدنتائج دوزخ کے اگزبیشن و نظارے ہیں۔

قیامت میں لوگ قبروں سے یکدم اٹھیں گے یا بتدریج

یہی ثابت ہے کہ ایک دم اٹھیں گے، یہ ماننا پڑتا ہے۔ ہمارا خدا بڑا قادر خدا ہے۔ دیکھو نطفہ کیا چیز ہے، پھر اس سے کامل انسان بنا دیتا ہے۔ ہر شخص جو خدا کو مانتا ہے، اس کو یہ تسلیم کرنا پڑیگا۔ دیکھو آفتاب و ماہتاب، جو روشن اجسام ہیں، کیا انکو دیکھ کر وہ کہہ سکتا ہے کہ ان کے بنانے کا سامان کن چھکڑوں پر آیا تھا اور ان کا مصالحہ کہاں سے آیا تھا۔ یہی کہنا پڑیگا کہ **انما امره اذا اراده شيئاً ان يقول له كن فيكون** ۔ پس ہم کو ایسا ہی ماننا چاہئے کہ وہ قیامت کو یکدم سب کو اٹھا دیگا۔ اور جن حسرتوں سے مر گئے تھے کہ ہمارے مخالفوں کا کیا حال ہوا ہوگا، وہ اس وقت ان کو دکھایا جائیگا کہ دیکھ لو یہ

راستباز ہیں اور یہ منکروں کا حال ہے۔تب ہی تو راستبازوں کو لذت آئیگی۔ پس جب تک ہم خدا کو صاحب قدرت نہ مانیں، اسے مان ہی نہیں سکتے۔ پہلے کاموں کو دیکھوتو ہم کوتسلیم کرنا پڑتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک حصہ میں خدا کو مانیں اور دوسرے میں انکار کریں۔خدا کی صفات اور کام غیر محدود ہیں۔ کیا دنیا کی ہزار ہزار قدرتیں اس بات کی کافی دلیل نہیں ہیں کہ خدا بڑا قوی خدا ہے۔خدا کبھی معطل نہیں ہوگا۔ ہمیشہ خالق رازق رب رحیم رحمٰن ہے اور رہیگا۔میرے نزدیک ایسے عظیم الشان جبروت والے کی نسبت بحث کرنا گناہ میں داخل ہے۔اللہ تعالیٰ کوئی ایسی چیز منوانی نہیں چاہتا، جسکا نمونہ یہاں نہ دیا ہو۔

حشر میں جسم ہوگا یانہیں؟ اور اگر ہوگا، تو یہی یا کوئی اور

جسم تو ہوں گے، مگر یہ نہیں لکھا کہ یہی یا کوئی اور۔تین سال کے بعد پہلا جسم تو رہتا نہیں، اس کا قائم مقام نیا جسم آجاتا ہے۔پس ہمارا یہ ایمان ہے کہ ایک جسم دیا جائیگا، جیسا اس علیم کے علم میں ہے۔وہ قادر ہے کہ اس بدن سے بھی کچھ حصہ لے اور ضرور لے گا۔اور اس حصہ کو بھی جلالی رنگ میں غیر فانی کر دے گا۔سوائے ذات باری تعالیٰ کے کسی دوسرے کی یہ صفت نہیں کہ ابدالاباد تک رہے۔انسان کو غیر فانی جسم جو دیا جائیگا، وہ خدا کا عطیہ ہوگا۔

مرنے کے بعد روح کا تعلق قبر سے

مرنے کے بعد روح کا تعلق قبر سے رہتا ہے۔ایک تعلق مومن کا آسمان سے ہوتا ہے اور ایک تعلق قبر سے بھی رہتا ہے۔اصل حساب کتاب برزخ میں ہوگا۔اور مقابلہ (بمعنی آمنا سامنا) حشر میں ہوگا تا کہ انبیاء اور ان کے مخالفین کی حالت کا اظہار ہو کہ جن کو دنیا میں ذلیل سمجھا جاتا تھا، وہ عزت کی کرسی پر بٹھائے جاتے ہیں۔اور جن کو کاذب کہا جاتا تھا، وہی صادق ہیں۔

قیامت میں حیوانات کو کیوں انسانوں کی طرح اجسام نہ ملیں گے؟

چنداں ضروری نہیں کہ ہم اس پر بحث کریں۔ایک شخص سخاوت کرتا ہے اور ایک فقیر کو پیسہ دیتا ہے اور دوسرے کو روپیہ۔جس کو پیسہ دیا گیا ہے، اس کا حق نہیں ہے کہ جھگڑا کرے۔

ابدی راحت

سوال۔کیا ابدی راحت بھی عذاب نہیں ہو جاتی؟

جواب۔بہشت میں ہر روز تجدد ہوتا رہیگا۔اسی طرح دوزخیوں کی بابت لکھا ہے۔بَـدَّلْـنٰـهُـمْ

جُلُوْداً غَیْرَھَا لِیَذُوقُوا الْعَذَابَ (یعنی ہم ان کی جلدیں بدلتے رہیں گے، تا کہ وہ عذاب کو چکھیں) خدا کا تجدد محدود نہیں ہوسکتا۔ یہ بے پایاں ہے اور **لدینا مزید** کے موافق بڑھوتی ہوتی رہے گی۔

مغفرت الٰہی وحبط اعمال کا فلسفہ

سوال ۔اگر اعمال ہی اپنے اثر ظاہر کرنے سے انسان کے لئے سکھ ودکھ کا باعث ہو جاتے ہیں، تو قرآن کریم کی ان آیات بیّنات واحادیث نبویہ کا کیا مطلب ہے، جن میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ انسانوں کو ان کے اعمال کی جزاء وسزا دیتا ہے؟

جواب ۔ان آیات واحادیث سے یہ مراد ہے کہ خدا تعالیٰ اعمال کی تاثیرات مناسبہ کو انسانوں پر جزا وسزا دینے کیلئے ظاہر کرتا ہے، کیونکہ سب اشیاء واعراض وجواہر میں تاثیرات کا مودع ہونا خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ خدا تعالیٰ چاہے تو کسی چیز کا اثر اس میں قائم رکھ کر ظاہر کر دے۔ اور چاہے تو اس چیز میں سے اثر کو زائل کر دے اور اسکا اثر ظاہر نہ ہونے دے۔ چنانچہ بارہا تجربہ سے ظاہر ہو چکا ہے اور یہ بات سب کے نزدیک مسلم شدہ ہے کہ بعض اوقات بعض ادویہ کو استعمال کیا جاتا ہے، تو ان کے اثر ظاہر اور بعض وقت ظاہر نہیں ہوتے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انکے اثر کو زائل کر دیا ہے یا روک دیا ہے۔ ایسا ہی اعمال انسانی کا حال ہے۔ جب خدا تعالیٰ کسی بدعمل کے اثر ونتیجہ کو ظاہر ہونے سے روک دے، تو وہ ظاہر نہیں ہوتا۔ اور یہی معنے مغفرت الٰہی کے ہیں، کیونکہ مغفرت غفر سے نکلا ہے، جسکے معنے ڈھانپنے اور چھپانے کے ہیں۔ اسلئے گناہ کے اثر کو زائل کرنے کا نام مغفرت گناہ ہوا اور جب خدا تعالیٰ کسی نیک عمل کے نتیجہ واثر کو روک دے اور وہ ظاہر نہ ہو، تو اسکو حبطِ اعمال کہتے ہیں۔

عالم آخرت میں رات اہل دوزخ کے لئے اور دن اہل بہشت کیلئے مقرر ہونیکی حکمت

آخرت میں جہنم میں رات اور بہشت میں دن ہوگا، کیونکہ دوزخ کو ظلم اور ظلمت یعنی تاریکی اور اندھیرے یعنی رات سے مناسبت ہے۔ اور بہشت کو نور اور روشنی یعنی دن سے مناسبت ہے۔ اور یہ بات عین حکمت ومصلحت الٰہی کے موافق ہے۔

ناریاں مر ناریاں را طالب اند　　　نوریاں مر نوریاں را جالب اند

اس بارے میں حضرت محی الدین ابن عربی المعروف شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔ "کان

الـليل فى دار جهنم والنهار فى دار الجنة فلم يجتمعا مع الولادة التى توجد فى النهار و الـجـنـان مـن حـدوث التـكوين فيهما فذالک مثل حواء من آدم و مثل عيسىٰ من مـريـم فهٰـذه هـى ولادـة الآخـرة ضرب الله بعيسىٰ و مريم و حواء و آدم مثلاً لنا فما يتـكـون فى الآخرة فليس توليد الاكوان فى الآخرة عن نكاح الزمانى بايلاج ليل فى نهار و نهار فى ليل فانهما مثلان فى الزمان الذى هو اليوم لهما فقسمه الله فى الآخرة بيـن الجنة و النار فاعطى ظلمة الليل للنار و اعطىٰ نور النهار للجنة و من مجموعهما يكون اليوم و هو يوم الآخرة فانه جامع للدارين". (فتوحات مکیہ۔جلدسوم۔صفحہ۵۴۸)

حکمت درآفرین دوزخ درآں جہاں وزنداں دریں جہاں

بالئیمے چوں کنی قہر و جفا	بندۂ گردد ترا بس با وفا
کافراں کارند در نعمت جفا	باز در دوزخ وفا شاں ربّنا
کہ لیئماں در جفا صافی شوند	چوں وفا بینند خود جافی شوند
مسجد طاعات شاں خود دوزخ ست	پائے بند مرغ بیگانہ فخ است
ہست زنداں صومعہ دزد لئیم	کاندراں ذاکر شوند حق را مقیم
چوں عبادت بود مقصود از بشر	شد عبادتگاہ گردن کش سقر
آدمی را ہست در ہر کار دست	لیک از ومقصود ایں خدمت بدست
ماخلقت الجن والانس ایں بخواں	جز عبادت نیست مقصود از جہاں
مر لئیماں را بزن تا سر نہند	مر کریماں را بدہ تا بر دھند
لا جرم حق ہر دو مسجد آفرید	دوزخ آنہا را و ینہا را مزید

آریوں وعیسائیوں کےاس اعتراض کا جواب کہ بموجب حدیث نبوی خداتعالیٰ دوزخ میں اپنا قدم ڈال کراس کوسیر کردے گا؟

سوال ۔ ہمارے مخالفین کہتے ہیں کہ خدا دوزخ سے پوچھے گا کہ کیا تو اتنے آدمی اور پتھر کھا کر سیر ہوئی ہے کہ نہیں۔ پیٹو جہنم بولے گی۔ کیا کچھ اور بھی ہے، یعنی اگر کچھ اور بھی باقی ہے، تو دیجئے۔ مفسر کہتے ہیں۔ خدا اپنے دونوں پاؤں دوزخ میں ڈال دیگا اور جہنم کو سیر کریگا۔

جواب ۔ قرآن کریم میں تو اسی قدر ہے۔ یَوۡمَ نَقُوۡلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امۡتَلَاتِ وَ تَقُوۡلُ هَلۡ

مِنْ مَّزِيْد ۔یعنی قیامت کے دن ہم دوزخ کو کہیں گے کہ کیا تو سیر ہوگئی ہے. اور دوزخ کہے گی، کیا کچھ اور ہے تو لاؤ۔اور مفسرین کے اقوال، جو ہمارے مخالفین لاکر معترض ہوتے ہیں کہ جہنم **هل من مزيد** کہتی رہے گی، **حتی یضع رب العزة قدمه**۔اور کہیں ہے **یضع الجبار قدمه** اور کہیں ہے **حتی یضع الله رجله** ۔پس قبل اس کے کہ ہم مفصل جواب لکھیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ ذیل کے معنے لغت عرب سے لکھ دیں۔(۱) جہنم (۲) رب (۳) عزت (۴) قدم (۵) جبار(۶) رجل۔

(۱) جہنم۔دوزخ۔نرگ عذاب کی جگہ۔

(۲) رب کے معنے بڑا پالن ہار۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ پر بھی بولا جاتا ہے اور دنیا داروں، بڑے آدمیوں پر بھی۔فرعون نے کہا۔**انا ربکم الاعلیٰ** ۔یعنی میں تمہارا بڑا امر بی ہوں۔یوسف علیہ السلام نے ایک قیدی کو، جو رہا ہونے والا تھا، فرمایا **اذکرنی عند ربک** ۔یعنی اپنے مالک وامیر کے پاس میرا ذکر کرنا۔اور اسی رب کی جمع ہے ارباب، جس کے متعلق فرمایا ہے۔**ارباب متفرقون خیر ام الله الواحد القهار**۔

(۳) عزت کے معنے ہیں بڑائی، حمایت، جاہلوں کی ہٹ۔قرآن کریم میں شریروں کے متعلق فرمایا ہے۔**اخذ ته العزة بالاثم فحسبه جهنم** ۔اور فرمایا کہ جب شریر کو عذاب اور دکھ دیا جائیگا، تو کہا جائیگا۔**ذق انک انت العزیز الکریم** ۔یعنی چکھو اس کو، تم بہت عزت والے اور معزز ہو۔پس **رب العزت** کے یہ معنے بھی ہوئے۔متکبر۔ضدی اور ہٹ کرنیوالا۔

(۴) جبار کے معنے مصلح کے بھی ہیں اور ظالم کے بھی۔ مصلح کو تو عذاب ہو نہیں سکتا۔اور ظالم کے حق میں آیا ہے۔**خاب کل جبار عنید** ۔(مشکوٰۃ صفحہ ۴۹۶) ہب ہب دوزخ میں ایک وادی ہے، اس میں جبار لوگ داخل ہوں گے۔

(۵) قدم۔جس شخص کو کہیں بھیجا جائے، اسے قدم کہتے ہیں۔**قاموس اللغة** میں ہے۔**قدمه الذین قدمهم من الاشرار فهم قدم الله للنار کما ان الخیار قدم الله للجنة و وضع القدم مثل للردع و القمع** ۔احادیث میں ہے۔**و ماء الجاهلیة موضوعة تحت قدمی**۔ ترجمہ۔قدم کا معنی وہ بدلوگ ہیں، جن کو وہ ان کے اعمال کے مطابق آگ میں بھیجے گا۔جیسے کہ برگزیدہ لوگ بہشت کے لئے قدم اللہ ہیں، یعنی وہ، جنہیں اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کے مطابق بہشت میں بھیجے گا۔اور قدم رکھنے کے اصل معنے ہیں، روک دینا اور بیخ کنی کر دینا۔جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔جاہلیت کے خون میرے قدم کے نیچے رکھے گئے ہیں، یعنی ان کے انتقاموں سے قوم کو منع کرتا

ہوں اوران کو مسلتا ہوں۔

(۶) رجل کے معنے قدم اور جماعت عربی زبان میں آتے ہیں۔ **رجل من جراد** ۔یعنی ٹڈی دل کی جماعت۔ اب کس قدر صاف معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جہنم کو فرمائیگا کہ کیا تو بھر چکی ہے۔ تو وہ عرض کرے گی۔ کیا کچھ اور بھی ہے۔ تب اللہ تعالیٰ شریروں اور ظالموں کی جماعت کو، جو جہنم کے لائق ہیں، جہنم میں ڈال دے گا۔ خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ نرگی اور جہنمی نرگ میں داخل کئے جائیں گے۔ اور یہی انصاف وعدل ہے۔ اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔

کفار و فجار کے خلود جہنم کا راز

اس مسئلہ کی حقیقت یہ ہے کہ کفار و فجار ایک مدت دراز تک عذاب میں رہ کر آخر کار خدا تعالیٰ کے رحم سے حصہ پائیں گے، جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ **یاتی علی جھنم زمان لیس فیھا احد و نسیم الصبا تحرک ابوابھا** ۔ترجمہ۔ یعنی دوزخ پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اس میں کوئی بھی نہیں ہوگا اور نسم صبا اس کے کواڑوں کو ہلائے گی۔ اسی کے مطابق قرآن شریف میں یہ آیت آئی ہے۔ **الا ماشاء ربک فعال لما یرید** ۔یعنی دوزخی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، لیکن جب خدا چاہے گا، تو ان کو دوزخ سے مخلصی عطا کرے گا۔ کیونکہ تیرا رب جو چاہتا ہے کر سکتا ہے۔ یہ تعلیم خدا تعالیٰ کی صفات کاملہ کے مطابق ہے، کیونکہ اس کی صفات جلالی بھی ہیں اور جمالی بھی۔ وہی زخمی کرتا ہے اور وہی مرہم لگاتا ہے۔ اور یہ بات نہایت معقول اور خدائے عز وجل کی صفات کاملہ کے برخلاف ہے کہ دوزخ میں ڈالنے کے بعد ہمیشہ اس کی صفات قہر یہ ہی جلوہ گر ہوتی رہیں۔ اور کبھی صفت رحم وعفو جوش نہ مارے۔ اور صفات کرم اور رحم ہمیشہ کے لئے معطل رہیں۔ بلکہ جو کچھ خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدت دراز تک، جس کو انسانی کمزوری کے مناسب حال استعارہ کے رنگ میں ابد کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، دوزخی دوزخ میں رہیں گے۔ اور پھر صفت رحم اور کرم تجلی فرمائے گی۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب خدا کی صفت رحم کی تجلی کا وقت آئیگا، تو خدا تعالیٰ (تمثیلی رنگ میں) اپنا ہاتھ دوزخ میں ڈالے گا اور جس قدر خدا کی مٹھی میں آدمی آجائیں گے، وہ سب دوزخ سے نکالے جائیں گے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ خدا تعالیٰ کا بھی ہماری طرح کوئی ہاتھ ہے۔ بلکہ اس میں ایک خاص تجلی الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔ الغرض اس حدیث میں بھی آخر کار سب کی نجات کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ خدا کی مٹھی خدا کی طرح غیر محدود ہے، جس سے کوئی بھی باہر نہیں رہ سکتا۔ ہاں نجات سے یہ لازم نہیں آتا کہ سب لوگ ایک ہی مرتبہ پر ہوجائیں گے۔ بلکہ جن لوگوں نے دنیا میں خدا کو

اختیار کر لیا ور خدا کی محبت میں محو ہو گئے اور صرط مستقیم پر قائم ہو گئے، ان کے خاص مراتب ہیں۔ اور دوسرے لوگ اس مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

یہ بات فی نفسہٖ غیر معقول ہے کہ انسان کو ایسی ابدی سزا دی جائے کہ جیسا خدا ہمیشہ کے لئے ہے، ایسا ہی خدا کی ابدیت کے موافق ہمیشہ دوزخی دوزخ میں رہیں۔ آخران کے قصوروں میں خدا تعالیٰ کا بھی دخل ہے، کیونکہ اسی نے ایسی قوتیں پیدا کیں، جو کمزور تھیں۔ پس دوزخیوں کا حق ہے کہ اس کمزوری سے فائدہ اٹھائیں، جوان کی فطرت کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی ہے۔

یہ بات یادرکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح ستارے ہمیشہ نوبت بہ نوبت طلوع کرتے رہتے ہیں، اسی طرح خدا کی صفات بھی طلوع کرتی رہتی ہیں۔ کبھی انسان خدا کی صفات جلالیہ اور استغناء ذاتی کے پرتو کے نیچے ہوتا ہے اور کبھی صفات جمالیہ کا پرتو اس پر پڑتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے، جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ **كُلَّ يَوۡمَ هُوَ فِيۡ شَان** ۔ پس یہ سخت نادانی کا خیال ہے کہ ایسا گمان کیا جائے کہ بعد اس کے کہ مجرم لوگ دوزخ میں ڈالے جائیں گے، پھر صفات رحم اور کرم ہمیشہ کے لئے معطل ہو جائیں گی اور کبھی ان کی تجلی نہیں ہوگی۔ کیونکہ صفات الٰہیہ کا تعطل ممتنع ہے۔ بلکہ حقیقی صفت خدا تعالیٰ کی محبت اور رحم ہے اور وہی اُم الصفات ہے۔ اور وہی کبھی انسانی اصلاح کے لئے صفات جلالیہ اور غضبیہ کے رنگ میں جوش مارتی ہے۔ اور جب اصلاح ہو جاتی ہے، تو محبت اپنے رنگ میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور پھر بطور موہبت ہمیشہ کے لئے رہتی ہے۔ خدا ایک چڑچڑے انسان کی طرح نہیں ہے، جو خواہ نخواہ عذاب دینے کا شائق ہو۔ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا، بلکہ لوگ اپنے آپ پر آپ ظلم کرتے ہیں۔ اس کی محبت میں تمام نجات اور اس کو چھوڑنے میں تمام عذاب ہے۔

بہشت کے انعامات کے متعلق خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں **عطاء غیر مجذود** فرمایا ہے۔ یعنی بخشش بے انتہا۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہئے تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو امید نہ رہتی اور مایوسی پیدا ہوتی۔ بہشت کے دوامی انعاموں کو دیکھ کر مسرت بڑھتی ہے اور دوزخ کے ایک معین عرصہ تک ہونے سے امید پیدا ہوتی ہے۔ ایک بزرگ نے اس کو یوں بیان کیا ہے۔

گویند کہ بحشر خواہد بود   وآں یار عزیز تند خو خواہد بود

از خیر محض شر نے نیاید ہرگز   خوش باش کہ انجام خیر خواہد بود

الغرض دوزخ میں آدمی بحسب اپنی آلودگی کے ایک عرصہ تک رہیگا۔ پھر نکل آئیگا۔ گویا جن کی اصلاح اطاعت نبوت سے نہیں ہوئی، انکی اصلاح دوزخ کریگا۔ مذکورہ بالا حدیث اسی امر پر دال ہے۔

حضرت خاتم الاولیاء ابن عربی لکھتے ہیں۔

اِعْلَمُوا اَنَّ جھَنَّمُ مُکَمِّلَةٌ لِلنَّاقِصِیْنَ وَ مُنَبِّھَةٌ لِلْغَافِلِیْنَ وَ مَوْقِظَةٌ لِلنَّائِمِیْنَ وَ سَمّٰی ھَا اللهُ اُمُّ الدَّاخِلِیْنَ بِمَا تُرَبُّھُمْ کَالْاُمَّھَاتِ لِلْبَنِیْن. وَ اِنْ کُلُّ بَصَرٍ یَکُوْنُ یَوْمَئِذٍ حَدِیْداً بَعْدَ بُرْھَةٍ مِنَ الزَّمَانِ وَ یَکُوْنُ کُلُّ شَقِیٍّ سَعِیْدًا بَعْدَ حُقُبٍ مِنَ الدَّوْرَانِ وَ لا یَلْبِثُوْنَ اِلَّا اَحْقَاباً فِی النَّیْرَانِ اِلَّا مَاشَاءَ اللهُ مِنْ طُوْلِ الزَّمَانِ فَاِنَّا مَا اُعْطِیْنَا عِلْمَ تَجْدِیْدِہ بِتَصْرِیْحِ الْبَیَانِ فَھُوَ زَمَانٌ اَبْدِیٌّ نِسْبَةً اِلٰی ضِعْفَ الْاِنْسَانِ وَ مَحْدُوْدًا نَظَراً عَلٰی مُنُنِ الْمَنَانِ وَ لَا یُتْرَکُوْنَ کَالْاَعْمیٰ اِلٰی الْاَبَدِ عَلٰی وَجْہِ الْحَقِیْقَةِ وَ یَکُوْنُ مَال امرِھِمْ رَحْمُ اللهِ وَالرُّشْدُ وَ مَعْرُفَةُ الْحَضْرَةِ الْاَحدِیَّةِ بَعْدَ مَا کَانُوْا قَوْمًا عَمِیْنَ. وَ اِنَّ خُلُوْدَ الْعَذَابِ لَیْسَ کَخُلُوْدِ ذَاتِ اللهِ رَبِّ الْاَرْبَابِ بَلْ لِکُلِّ عَذَابِ اِنْتَھَاءٌ وَ بَعْدَ کُلِّ لَعْنٍ رَحْمٌ وَ اِیْوَاءٌ وَ اِنَّ اللهَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ وَ مَعَذَالِکَ یَسْنُوْا سَوَاءً فِیْ مَدَارِجِ النَّجَاةِ بَلِ اللهُ فَضَّلَ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الدَّرَجَاتِ وَ الْمَثُوْبَاتِ وَ مَا یَرِد عَلٰی فِعْلِہٖ شَیْءٌ مِنَ الْایرَادَاتِ اِنَّہ' مَالِکَ الْمُلْکِ فَاعْطٰی بَعْضَ عِبَادِہٖ اَعْلَی الْمَرَاتِبِ فِی الْکَمَالَاتِ وَ بَعْضُھُمْ دُوْنَ ذَالِکَ مِنَ التَّفَضَلَاتِ لِیَثْبِتَ اِنَّہ' ھُوَ الْمَالِکُ یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ لَیْسَ فِیْہِ اِئْتَلافُ حَقٍّ مِنْ حُقُوْقِ الْمَخْلُوْقِیْنَ وَ لَمَّا کَانَ وُجُوْدُ اللهِ تَعَالیٰ عِلَّةً لِکُلِّ عِلَّةٍ وَ مَبْدَاءً لِکُلِّ سُکُوْنٍ وَ حَرَکَةٍ وَ ھُوَ قَائِمٌ عَلٰی کُلِّ نَفْسٍ فَلَیْسَ مِنَ الصَّوَابِ اَنْ یُعْزی اِخْلادَ الْعَذَابِ اِلٰی ھٰذَا الْجَنَابِ وَ مَا کَانَ الْعَبْدُ مُخْتَارًا مِنْ جَمِیْعِ الْجِھَاتِ بَلْ کَانَ تَحتَ قَضَاء اللهِ خَالِقِ الْمَخْلُوْقَاتِ وَ کَانَ قَیُوْمُ الْکَائِنَاتِ وَ کَانَ کُلُّ قُوَّتِہٖ مَغْطُوْرَةٌ مِّنْ یَدِہٖ وَ مِنْ اِرَادَتِہٖ فَلَہ' دَخلٌ عَظِیْمٌ فِیْ شَقَاوَتِہٖ وَ سَعَادَتِہٖ فَکَیْفَ یَتْرُکَ عَبْداً ضَعِیْفًا فِیْ عَذَابِ الْخَلُوْدِ مَعَ اِنَّہ' تَعْلِیْمُ اِنَّہ' خَالِقُ الشَّقِیَّ وَ الْمَسْعُوْدَ وَ الْعَبْدُ یَفْعَلُ اَفْعَالًا وَ لَا کِنَّہ' اَوَّل الْفَاعِلِیْنَ وَ کُلُّ عَبْدٍ صَنْعُ یَدِہٖ وَ ھُوَ صَانِعُ الْعَالَمِیْنَ وَ اِنَّہ' رَحِیْمٌ وَ جَوَّادٌ وَ کَرِیْمٌ سَبَقَتْ رَحْمَتُہ' غَضَبَہ' وَ رِفْقَہ' شِصُبَہ' وَ لَا یَسَاوِیْہِ اَحَدٌ مِنَ الرَّاحِمِیْنَ فَلَا یَفْنِیْ کُلَّ الْاِفْنَاءَ وَ یَرْحَمُ فِیْ آخِرِ الْاَمْرِ وَ اِنْتِھَاءَ الْبَلَاءِ وَ لَا یَدُوْسُ کُلَّ الدُّوْسِ بِالْاِیْذَاء کَالْمُتَشَدِّدِیْنَ بَلْ یَبْسِطُ فِی آخِرِ الْاَیَّامِ یَدَہ' رَأفَةً وَ یَاخُذُ حُزْمَةٌ مِنَ النَّارِ بَیْنَ فَانْظُرْ اِلٰی یَدَ اللهِ وَ حُزْمَتِہٖ ھَلْ تَغَادِرُ اَحَدًا مِنَ الْمُعَذَّبِیْنَ وَ کَذَالِکَ اَشَارَ فِیْ اَھْلِ النَّارِ وَ قَالَ قَوْلًا کَرِیْمًا فِیْہِ اِطْمَاعٌ عَظِیْمٌ وَ نَسِیْمُ الْاَبْشَارِ فَقَالَ خٰلِدِیْنَ فَیْھَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْض اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّکَ .اِنَّ رَبُّکَ

فَعَّالٌ لِمَا يُرِيْدُ فَانْظُرْ اِلٰى اسْتِثْنَآءِ ہٖ بِبَصَرٍ حَدِيْدٍ وَ نَظَرٍ رَشِيْدٍ وَ لَا تَظُنَّ ظَنَّ السَّوْءِ كَالْيَائِسِيْنَ .

ترجمہ۔واضح ہو کہ دوزخ ناقصوں کو کامل کرنیوالا اور غافلوں کوخبردار کرنے والا اور سونے والوں کو جگانے والا ہے۔خدا نے دوزخ کا نام اس میں داخل ہونیوالوں کیلئے انکی ماں قرار دیا ہے۔ اسلئے وہ انکی پرورش اپنے بچوں کی طرح کرے گی۔اور کچھ زمانے کے بعد ہرایک آنکھ تیز بین ہوجائے گی اور ہرایک شقی کئی حقبے گزرجانے کے بعد سعید ہوجائے گا اور شقی لوگ دوزخ میں کئی حقبے رہیں گے۔ ہم کواس زمانہ کے انتہا کا علم بیان صریح میں عطا نہیں ہوا کہ اس کی درازی کتنی ہوگی۔پس وہ زمانہ بہ نسبت ضعف انسان کے ابدی ہے اور بنظر احسانات الٰہی محدود ہے۔اور بروجہ حقیقت دوزخیوں کو مدام اندھا نہیں چھوڑا جائیگا۔اور نابینائی کے بعد انکا انجام اعطائے رحم وہدایت ومعرفت الٰہی ہوگا۔اور عذاب کی ہمیشگی خداتعالیٰ کی ذات کی ہمیشگی کی طرح نہیں ہے۔ بلکہ ہرایک عذاب کی انتہا ہے اور ہرایک لعنت کے بعد رحمت اور پناہ ہے۔کیونکہ خداتعالیٰ ارحم الراحمین ہے۔اور سب لوگ مدارج نجات میں برابر نہیں ہوں گے۔ بلکہ خدا نے درجات اور مثوبات میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔اور خدا کے کسی فعل پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ مالک الملک ہے۔پس بعض بندوں کو کمالات کے بلند مرتبے عطا کئے اور بعض کو ادنیٰ تا کہ سب پر ظاہر ہوجائے کہ وہی مالک ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے۔وہ مخلوق میں سے کسی کے حقوق تلف نہیں کرتا۔چونکہ خداتعالیٰ کا وجود ہرعلت کی علت اور ہرایک سکون اور حرکت کا مبداء ہے اور وہ ہرایک جی پر قائم ہے۔پس یہ بات مناسب اور اچھی نہیں ہے کہ اس ذات عالی کی طرف بندوں کو ہمیشہ عذاب میں رکھنے کی نسبت کی جائے۔اور بندہ سب طرفوں سے مختار نہیں ہے۔ بلکہ مخلوقات خلق کے حکم کے نیچے ہے۔اور بندہ کی ہرایک قوت اسی کے دست قدرت وارادہ سے پیدا ہوتی ہے۔پس خدا کو بندہ کے شقی وسعید کرنے میں بڑا دخل ہے۔ پھر وہ کمزور بندہ کو ہمیشہ کے عذاب میں کس طرح چھوڑ دے گا۔حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ خود ہی شقی اور سعید کا پیدا کرنے والا ہے۔ بندہ بہت کچھ افعال کرتا ہے۔لیکن خدا سب سے اول فاعل ہے اور ہرایک بندہ اس کے دست قدرت کی کاریگری ہے۔اور خدا رحیم جواد وکریم ہے۔اس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت لے گئی ہے۔اور اس کو رفق اس کے غصہ پر غالب آ گیا ہے۔کوئی رحیم اس کے برابر نہیں ہے۔وہ بالکل فنا نہیں کرے گا۔ بالآخر وہ رحم کرے گا اور بلا کو ختم کردے گا۔اور غصہ آوروں کی طرح دکھ دینے سے بالکل پامال نہیں کرے گا۔ بلکہ بالآخر اپنی رحمت وراف کا ہاتھ پھیلائے گا اور دوزخ سے اہل دوزخ کو ایک مٹھی بھر کر نکال لے گا۔پس خدا کے

ہاتھ اور اس کی مٹھی کی عظمت پر غور کرو کہ کیا وہ کسی کو دوزخ میں باقی رہنے دے گی۔ اور ایسا ہی خدا نے اہل نار کے حق میں اشارہ کیا اور مہربانی کا کلمہ فرمایا ہے۔ جس میں بڑی امید اور خوشخبری ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ اہل دوزخ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، جب تک آسمان وزمین قائم ہیں۔ مگر اس زمانہ تک جب تک خدا چاہے گا، کیونکہ پروردگار جو چاہے کرتا ہے۔ پس اس آیت کریمہ میں تیز نظر سے خدا تعالیٰ کے استثناء پر غور کرو۔ اور ناامیدوں کی طرح بدظنی نہ کرو۔

درحقیقت انسان کے اندر اخلاق مذمومہ، جو اس سے سرزد ہوتے ہیں، اسی دوزخ کے شعبے اور شاخیں ہیں، جو قیامت میں بشکل آگ متمثل ہوکر دکھائی دیں گے۔

چونکہ جزو دوزخ ست ایں نفس ما	طبع کل دارد ہمیشہ جزو ہا
دوزخ ست ایں نفس دوزخ اژدہاست	کو بدریا ہا نگردد کم و کاست
ہفت دریا را در آشامد ہنوز	کم نگردد سوزش آں خلق سوز
سنگہا و کافراں و سنگ دل	اندر آئند اندر و زار و خجل
ہم نگردد ساکن از چندیں غذا	تا ز حق آید مراد را ایں ندا
سیر گشتی سیر گوئد نے ہنوز	اینست آتش اینست تابش انیست سوز
عالمے را لقمہ کردد در کشید	معدہ اش نعرہ زناں ھل من مزید
حق قدم بردے نہد از لامکاں	آنگہ او ساکن شود از کن فکاں

انسان پر قیامت میں اس کے اعضاء کی گواہی دینے کی حقیقت

شہادت تحریری بھی ہوتی ہے اور تقریری بھی۔ اور تقریر زبان سے اور ایما و کنایہ سے بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح یاد رکھو کہ کلام بھی دو قسم کا ہوتا ہے، ایسا ہی نطق بھی۔

ایک آتشک زدہ آدمی طبیب حاذق کے سامنے آتا ہے، تو اس کے ہاتھ اور پاؤں کے نقش و نگار، جو آتشک سے پیدا ہوتے ہیں، اور اس کے آنکھ و کان کی حالت صاف صاف گوائی دیتی ہے کہ یہ آتشک کا مارا ہوا اور اس میں مبتلا ہے۔ ایک شخص مجلوق اور جریان کا مبتلا طبیب کے سامنے آتا ہے، تو وہ اس کی آنکھ سے پتہ لگا لیتا ہے۔ اور اس طرح ہزاروں بیماروں میں یہ امر مشہود ہے۔ پھر علیم وخبیر ذات پاک کے سامنے سمع و بصر وغیرہ کیونکہ گوائی نہ دیں سکیں گے۔

باش تا اعضائے تو چوں بیضہا | مرغہا زائند اندر انتہا
بیضۂ ما را چہ ماند در شبہ | بیضہ کنجشک را دور ست رہ
کے نکو کردی و کے کردی تو شر | کہ ندیدی لائقیش در پے اثر
کے فرستادی دمے بر آسماں | نیکئے کز پے نیامد مثل آں
گر مراقب باش و بیدار تو | ہر دمے بینی جزائے کار تو
چوں مراقب باشی و گیری رسن | حاجتت نہ آید قیامت آمدن
آنکہ رمزے رابدا نداد صحیح | حاجتش نہ آید کہ او گوید صریح
ایں بلا از کودنے آمد ترا | کہ نہ کردی فہم نکتہ و رمزہا
از بدی چوں دل سیاہ و تیرہ شد | فہم کن اینجا نشائد خیرہ شد
ورنہ خود تیرے شود آں تیرگی | در رسد در تو جزائے خیرگی
در نیائد تیرت از بخشایش است | نے پئے نادیدن آلائش است
ہیں مراقب باش گر دل بائدت | کز پئے ہر فعل چیزے زائدت

وہ دلائل عقلیہ جو خداوند کریم نے قرآن مجید میں عالم معاد کے اثبات میں بیان فرمائے ہیں

(۱) **اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سَدًیٌ اَلَمۡ یَکُ نُطۡفَةً مِنۡ مَنِیٍّ تُمۡنٰی ثُمَّ کَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰیٰ فَجَعَلَ مِنۡهُ الزَّوۡجَیۡنِ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰی اَلَیۡسَ ذَالِکَ بِقَادِرٍ عَلٰی اَنۡ یَحۡیِ الۡمَوۡتٰی** ۔ترجمہ۔ آیا انسان گمان کرتا ہے کہ اس کو بے قید چھوڑا جائیگا۔ کیا وہ ایک منی کا نطفہ نہ تھا۔ پھر خون کا لوتھڑا تھا۔ پھر خدا نے اس کو بنا کر درست کیا اور اس میں سے نر و مادہ کو بنایا۔ کیا وہی خدا قادر نہیں ہے اس بات پر کہ وہ مردوں کو زندہ کردے۔

(۲) **هُوَ الَّذِیۡ یُرۡسِلُ الرِّیَاحَ بشرًا بَیۡنَ یَدَیۡ رَحۡمَتِهٖ حَتّٰی اِذَا اَقَلَّتۡ سَحَابًا سَقۡنَاهُ لِبَلَدٍ مَیِّتٍ فَاَنۡزَلۡنَا بِهِ الۡمَآءَ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ مِنۡ کُلِّ الثَّمَرَاتِ کَذَالِکَ نَخۡرِجُ الۡمَوۡتٰی لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ** ۔ترجمہ۔ خدا وہ ذات قادر قدرت ہے، جو بارش سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے۔ جب ہوائیں ایک ابر کو کھڑا کرتی ہیں، تو ہم اس کو یعنی ابر کو خشک شہروں کی طرف چلاتے ہیں۔ پس ہم اس سے پانی اتارتے ہیں اور پانی سے سب میوے پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم مردے زندہ کرلیں گے۔

(۳) یَـاَیُّھَـا الـنَّـاسُ اِنْ کُـنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنَاکُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُـطْـفَةٍ ثّـمَّ مِـنْ عَـلَـقَةٍ ثُـمَّ مِـنْ مُّضْغَةٍ مخلقةً وَ غَیْر مخلقةٍ لِنُبَیِّنَ لَکُمْ وَ نُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَـانَشَـاءُ اِلٰی اَجَلٍ مُسَمّٰی ثُمَّ نُخْرِجُکُمْ طِفْلاً لِتَبْلُغُوْا اشَدَّکُمْ وَ مِنْکُمْ مَنْ یَتَوَفّٰی وَّ مِنْکُمْ مَن یّرَدُّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لکَیْلاَ یَعْلَمُ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْئًاء ۔ترجمہ۔اے لوگو اگر تم دوبارہ اٹھائے جانے کے بارے میں شک میں ہو، (توجان لو کہ) ہم نے تم کو مٹی سے پھر نطفہ سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر ایک بوٹی باترتیب و بے ترتیب سے پیدا کیا۔ ہم تمہارے لئے بیان کرتے ہیں اور رحموں میں ہم قرار دیتے ہیں جس کو چاہیں ایک معین وقت تک۔ پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں تا کہ تم جوانی کو پہنچ جاؤ اور بعض تم میں سے مرجاتے ہیں اور تم میں سے بعض کو ارذل عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔اور وہ علم کے بعد بے علم ہوجاتا ہے۔

(۴) اَفَـرَءَ یْتُـمْ مَـا تُـمْـنُـوْنَ اَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَه' اَمْ نَحْنُ الْخَالِقُوْنَ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَیْنَکُمُ الْـمَوْتَ وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ عَلٰی اَنْ نُبَدِّل اَمْثَالَکُمْ وَ نُنْشِئَکُمْ فِیْمَا لَا تَعْلَمُوْنَ. وَ لَقَدْ عَـلِـمْتُـمُ النَّشَاۃَ الْاُوْلٰی فَلَوْ لَا تَذَکَّرُوْن ۔ترجمہ۔دیکھوتو سہی منی جو تم رحموں میں ڈالتے ہو، کیا تم اس کو پیدا کرتے ہو یا ہم اس کے خالق ہیں۔ ہم نے تمہارے درمیان موت کو مقدر کیا اور ہم اس بات سے پیچھے نہیں رہنے والے کہ تمہارے امثال کو بدل دیں اور تم کو ایسی پیدائش میں کھڑا کریں، جس کو تم نہیں جانتے۔تم پہلی پیدائش کو جان چکے ہو، تو پھر کیوں عبرت نہیں پکڑتے ہو کہ خدا تم کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔

(۵)ضَرَبَ لَنَا مَثَلاً وَ نَسِیَ خَلَقَه' قَالَ مَنْ یُحْیِی الْعِظَامَ وَ ھِیَ رَمِیْمٌ. قُلْ یُحْیِھَا الَّـذِیْ اَنْشَاھَا اَوَّ لَ مَرَّۃٍ وَ ھُوَ بِکُلَّ خَلقٍ عَلِیْمٌ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَـاِذَا اَنْتُـمْ مِـنْـہُ تُـوْقِـدُوْن اَوْ لَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بِقَادِرٍ عَلٰی اَنْ یُخْلُقَ مِثْلَھُـمْ بَـلٰـی وَ ھُـوَ الْـخَلَّاقُ الْعَلِیْمٌ. اِنَما اَمْرُہ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلُ لَه' کُنْ فَیَکُوْنَ . فَسُبْـحَانَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلَّ شَئیٍ وَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ ۔ترجمہ۔ہمارے لئے مثال بیان کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول گیا ہے جو کہتا ہے کہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا، جب کہ وہ خاک خوردہ ہو جائیں گی۔ کہو کہ ان ہڈیوں کو وہ زندہ کریگا، جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔اور وہ ہر پیدائش کا علم رکھتا ہے۔وہ وہی خالق ہے، جس نے تمہارے لئے سبز درخت سے آگ کو پیدا کیا۔ پھر تم اس کو جلاتے ہو۔ کیا وہ خالق، جس نے آسمان اور زمین پیدا کیا، قادر نہیں ہے کہ ان کی طرح پیدا کر سکے۔ ہاں وہ پیدا

کرنے والا بڑا عالم ہے۔ اس کا حکم ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو کہتا کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔ پاک ہے وہ ذات، جسکے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور جسکی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

(٦) وَمِنْ آيَاتِهٖ اَنَّکَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَا اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ ۔ترجمہ۔اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بات ہے کہ تم زمین خشک دیکھتے ہو۔ پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں، تو وہ تازہ ہوتی اور پھیلتی پھولتی اور بڑھتی ہے۔ وہ ذات جس نے ان کو پیدا کیا ہے وہی مردے زندہ کرنے والا ہے۔ وہ ہر بات پر قادر ہے۔

(٧) يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يخْرِجَ مِنَ الْحَيِّ و يُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۔ترجمہ۔خدا تعالیٰ زندے کو مردے سے اور مردے کو زندے سے پیدا کرتا ہے اور زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے، یعنی خشک ہونے کے بعد بارش سے تازہ کرتا ہے۔ اسی طرح تم زندہ کئے جاؤ گے۔

(٨) وَ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ اِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا اَوَ لَا يُذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ يَكُ شَيْئًا ۔ترجمہ۔انسان کہتا ہے کہ آیا جب میں مر جاؤں، تو پھر زندہ کیا جاوں گا۔ کیا انسان یاد نہیں رکھتا کہ ہم نے اس کو اس سے پہلے پیدا کیا اور وہ کچھ چیز نہ تھا۔

(٩)وَ قَالُوا آ اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَ رُفَاتاً اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا. قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْداً اَوْ خَلْقًا مِمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُعِيْدُ نَا قُلُ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۔ترجمہ۔منکران حشر ونشر کہتے ہیں کہ آیا جب ہم مر کر فنا ہو جائیں گے اور ہماری ہڈیاں بھی بوسیدہ و خاک خوردہ ہو جائیں گی، تو کیا ہم از سر نو اٹھائے جائیں گے۔ انکو کہو کہ اگر تم پتھر یا لوہا یا کوئی ایسی سخت مخلوق چیز مر کر بن جاؤ جو تمہارے دلوں میں بہت بڑی ہے۔ تو بھی زندہ کئے جاؤ گے۔ کہیں گے کہ کون ہم کو دوبارہ زندہ کریگا۔ انکو کہو جسنے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا، وہی دوبارہ زندہ کریگا۔

(١٠)وَ الْاَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْبَتْنَهَا فِيْهَا مِنْ كل زَوْجٍ بَهِيْجٍ تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى بِكُلِّ عَبْدٍ مُنِيْبٍ ۔ترجمہ۔ہم نے زمین کو فرش بنایا اور اس میں پہاڑ رکھ دیئے اور اس میں ہر ایک قسم کی تازہ بتازہ نباتات اگاتے ہیں، جو کہ ایک خدا کی طرف رجوع کرنیوالے کے لئے بصیرت و عبرت کا نشان ہے۔

(١١) فَلْيَنْظُرِ الاِ نْسَانُ مِمَّا خُلِقَ خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ يُخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَ

التَّرَائِبِ اِنَّه' عَلٰی رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ. فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانَ اِلٰی طَعَامِهٖ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَ عِنَبًا وَ قَضْبًا وَ زَيْتُوْنًا وَ نَخْلاً وَ حَدَائِقَ غُلْبًا وَ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا. وَ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُبَارَكاً فَاَنْبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَ حُبَّ الْحَصْدِ وَ النَّخْلِ بَاسِقَاتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَضْد' رِزْقًا لِلْعِبَادِ وَ اَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۔ترجمہ۔انسان کو چاہئے کہ غور کرے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔وہ ایک ٹپکنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے، جو پشت اور سینے کے بیچ سے ہو کر گزرتا ہے۔وہ انسان کو دوبارہ بنانے پر قادر ہے۔انسان اپنے کھانے پر غور کرے کہ ہم نے پانی ٹپکایا۔پھر زمین کو پھاڑا، پھر ہم نے زمین میں دانے اور انگور اور سبزی اور زیتون اور کھجوریں اور باغات گھنے اور میوے اور گھاس پیدا کئے۔ہم آسمان سے بابرکت پانی نازل کرتے اور اسکے ساتھ باغات اور کٹتے کھیت اور کجھوریں لمبی پیدا کرتے ہیں، جن کا گابھا ہے تہ بہ تہ، جو بندوں کے لئے رزق ہوتا ہے۔اور پانی سے ہم مردہ شہر کو زندہ کرتے ہیں۔اسی طرح دوبارہ مردے زندہ ہونگے۔

علاوہ از پیدائش عالم نباتات کے ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ جب مئی و جون میں سخت کڑاکے کی دھوپ پڑتی ہے، تو زمین میں پیدائش حیوانات کے لئے ایک ایسی قسم کا مادہ وجوہر تیار ہو جاتا ہے کہ جب ایام برسات میں بارش پڑتی ہے، تو صدہا انواع واقسام کے کیڑے مکوڑے سبز وسرخ نیلے پیلے سیاہ وسفید تھوڑے ایام کے اندر اس کثرت سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ زمین پر جہاں قدم رکھو، ان ہی پر پاؤں پڑتا ہے۔سو اسی مشاہدہ عینی کی طرف اثبات قیامت کے لئے خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی جگہ توجہ دلائی ہے کہ اسی طرح لوگ زمین سے پیدا ہو جائیں گے۔

حقیقت عالم معاد بزبان حضرت ابن عربیؒ

ان السماء تمطر مطراً شبه المنی تمخض به الارض فتنشاء منه النشاة الآخره. و اما قوله تعالیٰ عندنا کما بداکم تعودون . هو قوله و لقد علمتم النشاة الاولیٰ فلو لا تذکرون و قوله کما بدات اول خلق نعیده وعداً علینا و قد علمنا ان النشاة الاولیٰ اوجدها لله تعالیٰ علی غیر مثال سبق. فهاکذا لنشاة الآخرة یوجدها الله تعالیٰ علیٰ غیر مثال سبق. مع کونها محسوسة بلا شک و قد ذکر رسول الله صلی الله علیه وسلم من صفة نشاة اهل الجنة و النار ما یخالف ما هی علیه هٰذه النشاة الدنیا ان فعلمنا ان ذالک راجع الیٰ عدم مثال سابق ینشها علیه و هو اعظم فی القدرة. ینشئی الله النشاة الآخرة علی عجب الذنب الذی یبقی من هٰذه النشاة الدنیا

و هـو اصـلها فعليه تركب النشاة الآخرة. والذى وقع لى به الكشف الذى لا اشک فيـه ان الـمـراد بـعـجب الذنب هو ما تقوم عليه النشاة و هو لا يبلى اى لا يقبل البلىٰ فـاذا انشـاء الله النشاة الآخرة و سواها و عدلها و ان كانت هى الجواهر باعيانها فان الـذوات الـخـارجة الـى الـوجـود و لا تنعدم اعيانها بع وجودها و لا كن تختلف فيها الـصـور بالامتزاجات و لا متزاجات التى يعطى هٰذا الصور اعراض تعرض لها بتقدير الـعـزيـز العليم . فاذا تهيات هٰذه الصور كانت كالحشيش المحرق و هو الاستعداد بـقبـول الارواح كـا لاستـعـداد الـحشيش بالنارية التى فيه بقبول الاشتعال و الصور البـرزخيـه كـالسـرج مشتـعـلة بالارواح التى فيها فينفخ اسرافيل نفخة واحدة فتمر تـلک الـنـفـخة عـلـىٰ تلک الصور البرزخية فتطفيها و تمر النفخة التى تليها و هى الاخـرىٰ الـى الـصـورـة المستعدة للاشتعال و هى النشاة الآخرىٰ فتشتعل بارواحها فـاذا هـم قيـام ينظرون ....فتقوم تلک الصور احياء ناطقة بما ينطقها الله به فمن نـاطـق بـالـحـمد لله و من ناطق يقول من بعثنا من مرقدنا و من ناطق يقول سبحان من احيـانـا بـد مـا امـاتـنا و اليه النشور. و كل ناطق ينطق بحسب علمه و ما كان عليه و نسى حاله فى البرزخ و يتخيل ان ذالک الذى كان فيه منام كما يتخيله المستيقظ و قـد كـان حيـن مـات و انتـقل الى البرزخ كان كالمستقيظ هناک و ان الحياة الدنيا كـانـت لـه كـالـمـنام . و فى آخرة يعتقد فى امر الدنيا و البرزخ انه منام فى منام و ان اليـقـظة الـصـحيحه هى التى هو عليها فى الدار الآخرة قا ل رسول الله صلى الله عليه وسلم فى ذالک الناس نيام فاذا ماتو انتبهوا.

ترجمہ۔ آسمان سے منی کی طرح بارش برسے گی اور زمین اس کے ساتھ حاملہ ہوگی۔ پس اس سے اخروی پیدائش پیدا ہوگی۔ اور یہ جو فرمان خداوندی ہے کہ جیسا کہ تم کو پہلے پیدا کیا، اسی طرح تم کو دوبارہ پیدا کریں گے، اسی کے مطابق یہ فرمان الٰہی ہے کہ تحقیق تم اپنی پہلی پیدائش کو جان چکے ہو۔ پس کیوں عبرت نہیں پکڑتے ہو۔ اور اسی کے مطابق یہ کلام الٰہی ہے کہ جس طرح میں نے مخلوق کو پہلے پیدا کیا، اسی طرح ان کو دوبارہ بنادوں گا۔ یہ ہم پر وعدہ ہے اور ہم جان چکے ہیں کہ پہلی پیدائش کی ایجاد ایسی ہے، جو پہلے تھی۔ پس پیدائش اخروی ایسی ہوگی۔ جس کی مثال پہلے نہ تھی۔ باوجودیکہ وہ بلا شبہ محسوس ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل جنت واہل دوزخ کے پیدائش کا جو ذکر فرمایا ہے، وہ اس دنیاوی

پیدائش کے برخلاف ہے۔ پس ہم جانتے ہیں کہ اس بات کا انجام یہ ہے کہ اس کی مثال پہلے نہ تھی اور خداتعالیٰ بڑا قادر قدرت ہے۔ خداتعالیٰ پیدائش اخروی ریڑھ کی ہڈی سے شروع کریگا، جوکہ اس دنیا کی پیدائش سے باقی رہتی ہے۔ اور وہی پیدائش کی اصل ہے۔ اور اسی پر پیدائش اخروی ہوگی۔ اور جو کچھ کشف میں مجھے معلوم ہوا، جس میں مجھے کچھ شک نہیں، وہ یہ ہے کہ ریڑھ کی ہڈی سے مراد وہ حصہ بدن کا ہے کہ جس پر پیدائش اخروی قائم ہوگی اور وہ بوسیدہ نہیں ہوگی۔ پس جب خداتعالیٰ اخروی پیدائش شروع کرے گا اور اس کوٹھیک اور درست کریگا اور اگرچہ وہ اپنی اصلیت میں جواہر ہیں، کیونکہ جو اشیاء پیدا ہو چکی ہیں، وہ معدوم نہیں ہوتی ہیں۔ بلکہ دوسری اشیاء کے ملنے سے صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ اور وہ اشیاء جن کے ملنے سے ان صورتوں کو یہ اعراض پیش آتے ہیں، یہ خدائے غالب علیم کا اندازہ ہے۔ پس جب یہ صورتیں تیار ہو جائیں گی، تو وہ جلنے والی گھاس کی طرح ہوں گی۔ اور یہ استعداد قبول ارواح کے لئے ایسی ہوگی، جیسا کہ گھاس آگ کے ساتھ مشتعل ہونے کی استعداد رکھتی ہے۔ اور برزخی صورتیں چراغوں کی طرح ارواح کے ساتھ مشتعل ہو جائیں گی۔ پس اسرافیل قرنا پھونکے گا۔ پس وہ پھونک ان برزخی صورتوں پر گزرے گی اور ان کو بجھا دے گی۔ اور دوسری بار قرنا پھونکی جائیگی اور یہ آخری قرنا اشتعال کی استعداد پیدا کرے گی۔ اور یہی آخری پیدائش ہے۔ پس صورتیں اپنے ارواح کے ساتھ مشتعل ہو جائیں گی .... پس سب لوگ کھڑے ہو جائیں گے اور وہ سب صورتیں زندہ اور خدا کے بلانے پر بولیں گی۔ بعض تعریف الٰہی کرتے ہوں گے اور بعض کہیں گے کہ ہم کو قبروں سے کس نے اٹھایا ہے۔ اور بعض کہیں گے، پاک ہے وہ ذات جس نے ہم کو مرنے کے بعد زندہ کیا اور اسی کی طرف نشر ہو گا۔ اور ہر ایک بات کرنیوالا اپنے علم پر بات کریگا۔ اور جس حال پر تھا اور اپنی برزخی حالت کو بھول جائیگا اور اس کو خیال ہوگا کہ یہ ایک حالت خواب تھی، جس میں وہ تھا۔ جیسا کہ جاگنے والا خیال کرتا ہے۔ اور جب مرا اور عالم برزخ کو منتقل ہوا تھا، تو بیداری کی طرح تھا اور دنیا کی زندگی اس کو خواب کی طرح معلوم ہو گی۔ اور آخرت میں دنیا اور برزخ کے بارے میں انسان کو یقین ہوگا کہ وہ خواب در خواب تھی اور صحیح بیداری وہ ہے، جو آخرت میں ہے۔ اسی بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اہل دنیا سوئے ہوئے ہیں، مریں گے تو جاگیں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے الفاظ میں فنائے دنیا و عالم معاد کی حقیقت

تعود تلک الوقائع الی الانوار المحیط فیقع ظلها فیستعد العالم لواقعة عظیمة من وقائع الجو فتهلک البشر و الموالید و یعود کل عضر لمحله ۔ترجمہ۔یعنی

واقعات قبل قیامت مثل عالم میں فسادات ہونے اور دجال کے آنے اور حضرت عیسیٰؑ کے تشریف لانے کے بعد انوار محیط الٰہیہ واقعہ عظیمہ کے ہونے پر متوجہ ہوں گے۔ اور واقعات جو آسمان وزمین کے بیچ واقع ہوتے ہیں، واقع ہوں گے۔ بشر و موالید سب مر جائیں گے۔ اور ہر ایک عنصر اپنی جگہ پر چلا جائیگا۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ یہ نظام الٹ پلٹ ہو جائیگا۔

جسموں کا اٹھنا اور روحوں کا ان میں لوٹ آنا یہ کوئی نئی زندگی نہیں ہے۔ بلکہ اسی پہلی زندگی کا تتمہ ہے۔ جس طرح زیادہ کھانے سے بدہضمی ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو، تو لازم آئے گا کہ یہ کوئی دوسری خلقت ہو۔ اور ان لوگوں کے لئے کئے کا (یعنی جو دنیا میں ہو چکا) کچھ بدلا ہی نہ ہو۔

جو مر گئے ہیں ان کے نفوس کھڑے ہو جائیں گے اور ان کا تعلق جسم سے قوی تر ہوگا۔ اور ریڑھ کی ہڈی باقی رہ جائے گی، یعنی ایک ایسا نشان، جس سے پہچانا جا سکے کہ یہ فلاں شخص کا بدن ہے۔ پھر وہ بدن سے مل جائیگی۔ ایک اور قسم کی روحیں آئیں گی، جو حیران ہوں گی کہ ان کی ریڑھ کی ہڈی کا نشان باقی نہ رہا ہوگا، تو وہ ایک ایسی زمین میں پھونکی جائیں گی، جس سے ان کو کچھ مناسبت ہوگی۔ ایک اور قسم کی روحیں آئیں گی، جن کو روحوں کے برانگیختہ ہونے اور صور کے پھونکنے کے وقت ایک مثالی جسم اختیار کرنا ہوگا، فرشتوں اور شیاطین کے جسم مثالی کے مانند۔ تو یہ زندگی کوئی ابتدائی زندگی نہ ہوگی، بلکہ اس کی تکمیل کے لئے ہوگی، جو ان میں بطور بدلا دینے کے ہوگی۔ پھر یہ جسم ایک ہیئت نسمیہ میں اوپر چڑھیں گے اور حشر کے واقعات میں داخل ہوں گے۔

عالم معاد و بعث کی فلاسفی مولانا روم کے الفاظ میں

مولانائے روم رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی تفصیل سے اس مسئلہ کو بیان کیا ہے کہ ترقی کے عجیب و غریب مدارج کے لئے فنا اور نیستی ضرور ہے۔ پہلے اس کو نہایت عام فہم مثالوں میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں۔

تو ازاں روزے کہ در ہست آمدی — آتشی یا خاک یا بادی بدی
گر بداں حالت ترا بودے بقا — کے رسیدے مر ترا ایں ارتقا

از مبدل ہستیء اول نہ ماند — ہستی دیگر بجائے او نشاند
ہمچنیں تا صد ہزاراں ہستا — بعد یکدیگر دوم بہ ز ابتدا
ایں بقاہا از فنا ہا یافتی — از فنا پس روچرا بر تافتی
زاں فنا ہاچہ زیاں بودت کہ تا — بر بقا بہ چسپیدہء اے بے نوا
چون دوم از اولیت بہتر است — پس فنا جوئے دمبدل را پرست
صد ہزاروں حشر دیدی ای عنود — تاکنوں ہر لحظہ از بدو وجود
از جمادی بے خبر سوئے نما — داز نما سوئے حیات و ابتلا
باز سوئے عقل و تمیزات خوش — باز سوئے خارج ایں پنج و شش
در فناہا ایں بقاہا دیدہء — ہر بقائے جسم چوں چسفیدہء
تازہ مے گیرو کہن را مے سپار — کہ ہرامسالت فزوں است ازسہ پار

ترجمہ۔(۱) تم جس دن سے کہ وجود میں آئے ہو تو پہلے خاک تھے یا ہوا (۲) اگر تمہاری وہی حالت قائم رہتی، تو یہ ترقی کیونکر نصیب ہوتی (۳) بدلنے والے نے پہلی ہستی بدل دی اور اس کی جگہ دوسری ہستی قائم کردی (۴) اسی طرح ہزاروں ہستیاں بدلتی چلی جائیں گی یکے بعد دیگرے اور پچھلی پہلی سے بہتر ہوگی (۵) یہ بقا تم نے فنا کے بعد حاصل کی ہے۔ پھر فنا سے کیوں جی چراتے ہو (۶) ان فناؤں سے تم کو کیا نقصان پہنچا، جواب بقا سے چمٹے جاتے ہو (۷) جب دوسری ہستی پہلی ہستی سے بہتر ہے، تو فنا کو ڈھونڈو اور انقلاب کنندہ کو پوجو (۸) تم سینکڑوں قسم کے حشر دیکھ چکے ہو۔ ابتدائے وجود سے اس وقت تک (۹) پہلے تم جمادی تھے، پھر تم میں قوت نمو پیدا ہوئی۔ پھر تم میں جان آئی (۱۰) پھر عقل و تمیز۔ پھر حواس خمسہ کے علاوہ اور حواس حاصل ہوئے (۱۱) جب فناؤں میں تم نے یہ بقائیں دیکھی ہیں، تو جسم کی بقا پر کیوں جان دیتے ہو (۱۲) نیا لو اور پرانا چھوڑ دو۔ کیونکہ تمہارا ہر سال پارسال سے اچھا ہے۔

مولوی صاحب کا یہ استدلال جدید سائنس کے مطابق ہے کہ ہر چیز محض عدم سے پیدا ہوتی ہے اور پیدا ہونے کے بعد کوئی چیز فنا نہیں ہوتی، بلکہ کوئی دوسری صورت بدل لیتی ہے۔ انسان دو چیزوں کا نام ہے، جسم اور روح۔ روح کو سائنس والے ہماری اصطلاح میں تسلیم نہیں کرتے، لیکن کم از کم ان کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ ایک قوت ہے۔ سائنس والوں کے نزدیک دنیا میں دو چیزیں پائی جاتی ہیں۔ مادہ، مثلاً خاک، پانی وغیرہ اور قوت حرارت اور حرکت۔ انسان انہی دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ جسم مادہ ہے اور روح قوت ہے۔ اور چونکہ سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ مادہ اور قوت کبھی فنا نہیں ہوسکتی۔ اس لئے ضروری

ہے کہ انسان جب فنا ہو، تو اس کا مادہ اور قوت کوئی دوسری صورت اختیار کرے۔ اسی کو انسان کی دوسری زندگی یا معاد یا قیامت کہتے ہیں۔ اس لئے ملحد بھی مطلق معاد کے وجود سے انکار نہیں کرسکتا۔

عمر خیام نے ایک رباعی میں لطیفہ کے طور معاد سے انکار کیا اور کہا تھا کہ انسان کوئی گھانس نہیں ہے کہ ایک دفعہ کاٹ لی جائے، تو پھر اُگ آئے۔ مولانا روم نے اسی انداز میں اسکا جواب دیا ہے۔

کدام دانہ فرو رفت درزمیں کہ نہ رست　　چرا بہ دانہء انسانت ایں گماں باشد

یہ استدلال اگر چہ بظاہر ایک لطیفہ ہے، لیکن دراصل علمی استدلال ہے۔ چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے۔ مونا روم نے معاد کے استبعاد کو اس طریقہ سے رفع کیا کہ انسان پہلے جماد تھا۔ جماد سے نبات ہوا۔ نبات سے حیوان ہوا۔ حیوان سے انسان ہوا۔ اس بات میں بھی کچھ شک نہیں کہ مادہ اور روح کو ابتدا میں خدا نے محض عدم سے پیدا کیا ہے۔ اور پھر انسانی روح کو فنا نہ کرنا یہ خدا کی عطا ہے۔

آمدہ اول بہ اقلیم جماد　　از جمادی در نباتی افتاد
وز نباتی چوں بہ میداں افتاد　　نامدش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلے کہ دارد سوئے آں　　خاصہ در وقت بہار و ضمیراں
ہمچنیں اقلیم تا قلیم رفت　　تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت
عقلہائے اولینش یاد نیست　　ہم ازیں عقلش تحول کردنی است
تا رہد زیں عقل پر حرص و طلب　　صد ہزاراں عقل بیند بوالعجب
گر چہ خفتہ گشت و ناسی شد ز پیش　　کے گذارندش دراں نسیاں خویش
باز آز اں خوابش بہ بیداری کشند　　کہ کند بر حالت خود ریشخند

ترجمہ۔(۱) انسان پہلے عالم جماد میں تھا۔ اور جماد سے عالم نباتات میں آیا (۲) جب عالم نباتات سے عالم حیوانات میں انسان کا گذر ہوتا ہے، تو اس کو عالم نباتات کی حالت بھول جاتی ہے (۳) سوائے اس میل ورغبت کے جو اس کو موسم بہار میں پیدا ہوتی ہے (۴) انسان اس طرح ایک عالم سے دوسرے عالم میں آیا اور اب عاقل و دانا بنا (۵) پہلی عقل اس کو یاد نہیں رہی اور اس عقل سے بھی اس کو روگردانی کرنی پڑے گی (۶) تا کہ اس پر حرص عقل سے نجات پائے اور لاکھوں عجیب در عجیب عقلوں کو دیکھے (۷) اگر چہ سو جائے اور یہاں اہل دنیا کے ہاں بھول جائے (۸) مگر اس کو میدان حشر میں کہاں بھولا رہنے دیں گے۔ پھر اس نیند سے اس کو بیدار کریں گے تا کہ اپنی حالت پر ہنسے۔

انسان کی خلقت کے یہ انقلابات مذہباً اور حکمۃً دونوں طرح سے ثابت ہیں۔ قرآن مجید میں

ہے۔ **و لقد خلقنا الانسان من سلالة من طين ثم جعلناه نطفة فی قرار مکین ثم خلقنا النطفة علقة فخلقنا العلقة مضغة فخلقنا المضغة عظاماً فکسونا العظام لحماً ثم انشاناه خلقا آخر فتبارک الله احسن الخالقین. ثم انکم بعد ذالک لمیتون ثم انکم یوم القیامة تبعثون** ۔ترجمہ۔ بیشک ہم نے انسان کوخلاصہ خاک سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اس کوایک معین مقام میں نطفہ بنایا۔ پھر ہم نے نطفہ کوخون کی پھٹکی بنایا۔ پھراس کوگوشت کا لوتھڑا بنایا۔ پھر ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم نے اس کوایک دوسری مخلوق بنایا یعنی حیوان سے بالاتر انسان۔پس بڑی بابرکت ہے وہ ذات جواحسن الخالقین ہے۔ پھراس کے بعدتم مرجاؤ گے۔ پھر قیامت کے دن تم اٹھائے جاؤ گے۔

بہرحال جب یہ ثابت ہوا کہ انسان پہلے جماد تھا۔ جمادیت کے فنا ہونے کے بعد نبات ہو۔ نباتیت کے فنا ہونے کے بعد حیوان ہوا،تو اس میں کوئی استبعاد نہیں معلوم ہوتا کہ یہ حالت بھی فنا ہوکر کوئی اورعمدہ حالت پیدا ہواوراس کا نام دوسری زندگی یا معاد یا قیامت ہے۔

کسی چیز کے فنا ہونے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ سرے سے معدوم ہو جائے۔ بلکہ ایک ادنی حالت سے اعلیٰ کی طرف ترقی کرنے کے لئے ضروری ہے کہ موجودہ صورت فنا ہو جائے۔ انہیں تغیر حالات انسانی کے متعلق حضرت مولانا روم نے ایک جگہ لکھا ہے۔

ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام

یعنی میں سات سوستر قالب میں اترا ہوں۔نباتات کی طرح کئی بارفنا ہوکر پھرا گا ہوں۔سات سوستر سے مراد کثرت تغیر حالت ہے، نہ خاص عدد۔

عالم معاد بعث حشر نشر کی فلاسفی حضرت امام محمد غزالیؒ کے الفاظ میں

الباعث هو الذی یحیی الخلق یوم النشور و یبعث من فی القبور و یحصل ما فی الصدور فی النشاة الاخریٰ و معرفته هٰذا الانشاء موقوف علیٰ معرفة حقیقة البعث و ذالک من اغمض المعارف و اکثر الخلق منه علیٰ توهمات مجملة و تخیلات. و غایتهم فیه تخلیهم ان الموت عدم و البعث ایجاد. مبتذ بعد عدم مثل الایجاد الاول فظنهم ان الموت عدم غلطٌ. وظنهم ان الایجاد الثانی مثل الایجاد الاول ایضاً غلطٌ. فاما ظنّهم ان الموت عدم فهو باطل بل القبر حفرة النیران او روضة من ریاض الجنة المیت اما سعید و اما شقی ما سعداؤهم فاولٰئک لیسوا

امواتاً بل احياء عند ربهم يرزقون فرحين بما اتاهم الله من فضله و الا اشقياء هم ایضاً احیاء و لذالک نادا هم رسول الله صلی الله علیه وسلم فی وقعة البدر و قال انی وجدت ما وعدنی ربی حقاً فهل وجدتم ما وعدکم ربکم حقاً ثم لما قیل له انهم لا یسمعون. قال ما انتم لما اقول باسمع منهم لا کنهم لا یقدرون علی الجواب......والمشاهدة الباطنیة دلت لارباب البصائر ان الانسان للابد و انه لا سبیل علیه للعدم. نعم مات و یقطع تصرفه من الجسد فیقال مات و تارة یعاد الیه تصرفه فیقال احی جسده و کشف ذالک بلاحقیقة و اما ظنهم ان البعث لیس الا ایجاد ثانیاً و هو المثل الاول غیر صحیح. بل البعث انشاء الاخر لا یناسبه الانشاء الاول اصلاً و للانسان نشاة کثیرة و لیست هی نشاتان فقط و لذالک قال الله تعالیٰ و ننشئکم فیما لا تعلمون و لذالک قال بعد خلق النطفة و المضغة و غیر ذالک ثم النشاة خلقاً آخر بل النطفة نشأت من التراب و العلقة نشأت من النطفة و المضغة نشأت من العلقة وا لروح نشأت من النطفة و شرف الروح و جلالته کونه امراً ربانیا . قال عند ذالک ثم انشاناه خلقاً آخر فتبارک الله احسن الخالقین . وقال الله تعالیٰ و یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی. ثم الادراکات الحسیة بعد خلق اصل الروح نشأة اخریٰ ثم خلق التمیز الذی یظهر بعد سبع سنین نشاة اخریٰ ثم خلق العقل بعد خمس عشر سنة و ما یقاربه نشأة اخریٰ و کل نشاة طور و قال الله تعالیٰ و قد خلقکم اطواراً. ثم طور خاصیة الولایته. من یرزق تلک الخاصیة نشأة اخریٰ و هو نوع من البعث و الله تعالیٰ باعث الرسل کما انه باعث یوم النشورو کما انه یعسر علی ابن المهد فهم حقیقة التمیز و یعسر علی الممیز فهم حقیقة العقل ما ینکشف فی طرزه من العجائب قبل حصول العقل . فکذالک یعسر فهم طور الولایة و النبوة فی طور العقل فان الولایة طور کمال وراء نشأة العقل کما ان العقل طور کمال وراء نشأة التمیز و التمیز طور وراء نشأة الحواس و کما ان من طبائع اکثر الناس انکار ما لم یبلغوه و لم ینالوا حتی ان کل واحد ینکر ما لم یشاهده و لم یحصل له و لا یومن بما غاب عنه فمن طبا یعهم انکار الولایته و عجائبها والنبوة و غرائبها باب من طبایعهم انکارا نشأة الثانیة و الحیاة الاخریٰ لانهم لم یبلغوها بعد و

لو عرض طور العقل و غايته و ما يظهر فيه من العجائب على المميز لانكره و حجده و احال وجوده فمن آمن بشيئٍ مما لم يبلغه فقد آمن بالغيب و ذالک هو مفتاح السعادات. و كما ان طور العقل ادراكات و نشأته بعيد المناسبة من الادراكات التى قبله فكذالک النشأة الاخرىٰ بل ابعد و لا ينبغى ان يقاس النشأة الاخرىٰ باولىٰ و هذا النشأة هى اطوار ذات واحدة و رقاتها التى يصعد منها الى درجات الكمال حتىٰ يقرب من الحضرة التى هى منتهىٰ كل كمال فيكون و عند ذالک من رد وقبول و حجاب و وصول فان قبل رقى الى اعلىٰ عليين و الا رد الىٰ اسفل السافلين و المقصود ان المناسبة بين النشاتين ليست الا من حيث الاسم و منها من لا يعرف معنىٰ الباعث ينكرو شرح ذالک يطول.

حقيقت البعث يرجع الىٰ احياء الموتىٰ بانشائهم نشاة اخرىٰ و الجهل هو الموت الاكبر وا لعلم هو الحياة الاشرف قد ذكر الله تعالىٰ العلم و الجهل فى كتابه و سماه حياة و موتاً و من خرج من الجهل الى المعرفت فقد انشاه نشاة الاخرىٰ و احياه حياة طيبة فان كان للعبد مدخل فى افادة الخلق العلم و دعاهم الى الله تعالىٰ ذالک نوع من الاحياء و هو رتبة الانبياء صلوات الله تعالىٰ عليهم اجمعين و من يرثهم من العلماء.

ترجمہ۔خدا تعالیٰ کے اسمائے حسنہ میں سے ایک اسم باعث بھی ہے،جس کے معنے وصفت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ ایک حالت سے اٹھا کر دوسری حالت پر لیجانے والا ہے۔ہم دیکھ رہے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی یہ صفت ہروقت ہر چیز پر یہ کام کر رہی ہے۔اس کے اسم باعث کا ہی یہ مقتضی ہے کہ نشر کے دن لوگوں کو زندہ کریگا اور قبروں سے ان کو اٹھائیگا۔اور دوسری پیدائش میں سینہ کی باتوں کو ظاہر کر دیگا۔اور اس پیدائش کی معرفت حقیقت بعث کی شناخت پر موقوف ہے۔یہ امر باریک ترین معارف میں سے ہے۔ اور اکثر لوگ اس سے توہمات مجملہ اور خیالات مبہمہ میں پڑے ہوئے ہیں۔اور ان کا انتہائی خیال یہ ہے کہ موت سے مراد نابود ہونا اور بعث سے مراد پہلی ایجاد کو نابود کر کے پھر مثل اول ازسرنو ایجاد کرنا ہے۔سو ان کا یہ گمان کہ موت سے مراد نابود ہونا ہے،غلط ہے۔اور یہ گمان کہ ایجاد ثانی پہلی ایجاد کی طرح ہے،یہ بھی غلط ہے۔اور ان کا یہ گمان کہ موت سے مراد محض عدم ہے،یہ بات باطل ہے۔ بلکہ قبر دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا اور بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔مردہ یا سعید ہوتا ہے یا شقی۔

سعید تو مردہ نہیں ہوتے، بلکہ ان کو اپنے پروردگار کے پاس سے رزق ملتا ہے۔ اور فضل خداداد کے ساتھ خوش رہتے ہیں۔ اور شقی بھی زندہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر میں ان کو پکارا اور کہا کہ میں نے پالیا، جو کچھ پروردگار نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ کیا تم نے بھی پالیا، جو خدا نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ وہ تو نہیں سن سکتے۔ جواب میں فرمایا، جو کچھ میں کہتا ہوں تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو۔ لیکن وہ جواب نہیں دے سکتے۔ اور صاحبان کشف کا باطنی مشاہدہ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انسان ابد کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اور بالکل نابود نہیں ہو جاتا۔ ہاں مر کر جسم سے اس کا تصرف قطع ہو جاتا ہے۔ پس کہا جاتا ہے کہ مر گیا۔ اور کبھی اس کو قوت تصرف عطا کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کا جسم زندہ ہو گیا۔ اور یہ جو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بعث صرف ایجاد ثانی کا نام ہے، یہ بات بھی مثل اول درست نہیں۔ بلکہ بعث ایک اور پیدائش ہے، جس کو پیدائش اول سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ انسان کے لئے بہت سی پیدائشیں ہیں۔ صرف دو ہی پیدائشیں نہیں ہیں۔ اسی لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ **وَ نُنۡشِئَکُمۡ فِیۡمَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ** ۔ یعنی ہم تم کو اس پیدائش میں کھڑا کریں گے، جس کو تم نہیں جانتے۔ اور ایسا ہی پیدائش نطفہ و مضغہ وغیرہ کے بعد فرمایا۔ **ثم انشاناہ خلقا آخر** ۔ یعنی ہم انسان کو اور پیدائش میں کھڑا کرتے ہیں۔

نطفہ مٹی سے پیدا ہوتا ہے اور علقہ نطفہ سے اور مضغہ علقہ سے اور روح نطفہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور روح کی شرافت و جلالت ربانی امر سے ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے **ثم انشاناہ خلقاً آخر فتبارک اللہ احسن الخالقین** ۔ یعنی پھر ہم نے اس کو ایک اور پیدائش میں کھڑا کیا۔ پس بابرکت ہے وہ ذات، جو احسن الخالقین ہے۔ اور فرمایا **و یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی** ۔ ترجمہ۔ یعنی تجھ سے روح کی حقیقت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ تو کہہ دے کہ روح خدا تعالیٰ کے امر سے ہے۔ پھر اصل روح کی پیدائش کے بعد ادراکات حسیہ کا پیدا ہونا ایک اور پیدائش ہے۔ پھر تمیز کی پیدائش، جو سات سال کے بعد ظاہر ہوتی ہے، ایک اور ہی پیدائش ہے۔ پھر پندرہ سال کے بعد یا اس زمانہ کے قریب، جو عقل کی پیدائش آتی ہے، وہ اور ہی پیدائش ہے۔

دراصل ہر ایک پیدائش ایک مرتبہ ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے **و قد خلقکم اطوارا** ۔ یعنی خدا نے تم کو ترتیب وار اور کئی مرتبوں میں پیدا کیا۔ پھر خاصیت ولایت کا مرتبہ ہے، جس کو یہ خاصیت عطا ہو، اس کے لئے بھی ایک قسم کی پیدائش ہے۔ اور یہ بھی ایک قسم کا بعث ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ باعث الرسل اور باعث یوم نشر ہے۔ اور جیسا کہ شیر خوار اور پنگھوڑے میں کھیلنے والے بچے کو حصول تمیز

سے پہلے حقیقت تمیز کا سمجھنا مشکل ہے۔ اور تمیز دار پر حصول عقل سے پہلے حقیقت اور اس کے عجائب طرزوں کا سمجھنا مشکل ہے۔ ایسا ہی مرتبہ ولایت اور مرتبہ نبوت کا سمجھنا مرتبہ عقل میں مشکل ہے۔ کیونکہ ولایت ایک کمال مرتبہ ہے، جو پیدائش عقل سے پرے ہے۔ اور مرتبہ تمیز ایک اور مرتبہ ہے، جو اس سے پرے ہے۔ اکثر لوگوں کی طبیعتوں کا خاصہ ہے کہ وہ جس بات کو نہ سمجھتے اور نہ پہنچتے ہیں، اس کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔ حتیٰ کہ جس بات کو نہ دیکھ سکتے اور نہ حاصل کرتے ہیں، اس سے منکر ہو جاتے ہیں۔ اور جو ان سے غائب ہو، اس پر ایمان نہیں لاتے۔ پس ولایت اور اس کے عجائبات اور نبوت اور اس کے غرائب کا انکار کرنا پیدائش ثانی اور زندگی اخروی کے انکار میں سے ایک دروازہ ہے، کیونکہ وہ بھی اس تک نہیں پہنچتے۔ اور اگر مرتبہ عقل اور اس کی غایت اور اس کے عجائبات محض تمیز دار بچے کے آگے پیش کیے جائیں، تو وہ ان سب کا انکار کرتا اور ان باتوں کو محال جانتا ہے۔ پس جو شخص اس چیز کو مان لے، جس تک وہ ابھی نہیں پہنچا، وہ غیب پر ایمان لایا۔ اور یہی سب سعادتوں کی کنجی ہے۔ اور جیسا کہ مرتبہ عقل اور اس کے ادراکات اور اس کی پیدائش اپنے ماقبل کے ادراکات سے بعید المناسبت ہے، ایسا ہی پیدائش اخروی کا حال ہے، بلکہ وہ بہت دور ہے۔ اور نہ یہ لازم ہے کہ اخروی پیدائش کو پہلی پیدائش پر خیال کیا جائے۔ پیدائش اخروی کے بہت مراتب اور زینے ہیں، جن سے انسان درجات کمال کو عروج کرتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس مرتبہ و بارگاہ کے نزدیک ہو جاتا ہے، جو سب کمالات کا منتہیٰ اور غایت ہے۔ اس وقت میں مراتب قبول اور حجاب اور وصول کے پیش آتے ہیں۔ پس اگر قبولیت حاصل ہوگئی، تو اعلیٰ مراتب کمال کی طرف چڑھتا ہے۔ ورنہ سب سے نچلے مرتبہ کی طرف اس کو لوٹایا جاتا ہے۔ اور مقصود اس ساری تقریر کا یہ ہے کہ پہلی اور اخروی پیدائش میں جو مناسبت ہے، وہ صرف برائے نام ہے۔ جو شخص اسم باعث کے معنے و مطلب نہیں جانتا، وہ ان حقیقتوں سے انکار کرتا ہے اور اس کی شرح دراز ہے۔

حقیقت بعث مُردوں کو دوسری پیدائش میں زندہ کر کے لانے کی طرف راجع ہے۔ جہل موت اکبر اور علم زندگی اشرف ہے۔ خدا تعالیٰ نے علم اور جہل کا قرآن مجید میں ذکر کیا ہے۔ علم کو زندگی اور جہل کو موت فرمایا ہے۔ جو کوئی جہل سے نکل کر معرفت کو حاصل کرتا ہے، وہ دوسری پیدائش اور پاکیزہ زندگی سے زندہ ہو جاتا ہے۔ بندہ کو بھی خلق علم کے افادہ میں دخل ہوتا ہے۔ اور وہ خدا کی طرف دعوت کرتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی زندگی ہے۔ اور یہ انبیاء علیہم الصلوٰت والسلام اور ان کے وارثوں علمائے ربانی کا مرتبہ ہے۔

کئی ایام سے میں اس مضمون بعث اخروی کو مرتب کر رہا ہوں۔ پرسوں دوپہر کے وقت لکھتے

ہوئے مجھ پر نیند غالب آ گئی۔اور بین النوم والیقظہ مجھ پر ایک حالت طاری ہوئی،جس کو میری روح اور جسم دونوں نے یکساں محسوس کیا۔اور مجھے معلوم ہوا کہ حشر اجسام ضرور ہوگا۔اور قبر وحشر میں عذاب و ثواب روح وجسم دونوں پر وارد ہوگا۔اور وہاں سکھ ودکھ کا احساس روح وجسم کو دنیا کی بہ نسبت زیادہ تر ہو گا۔لیکن اس اجمال کی تفصیل منکشف نہیں ہوئی۔حوالہ بخدا۔

آمنت باللہ و ملائکتہ و کتبہ و رسلہ والیوم الاخر والبعث بعد الموت۔

راقم۔خاکسار **محمد فضل خان**

۱۳۔ذیقعد ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء